﴿جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ﴾

طبع دوم

سنہ ۱۴۴۸ھ - سنہ ۲۰۲۶ء

نام کتاب	:	خطباتِ جمعہ
صفحات	:	۴۶۴
تعداد اشاعت	:	۱۱۰۰
قیمت	:	۴۰۰؍روپئے

﴿ملنے کے پتے﴾

☆ مکتبہ ندویہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ　☆ مکتبہ الشباب ندوہ روڈ، لکھنؤ

☆ مکتبہ احسان مکارم نگر، لکھنؤ　☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

فہرست کتاب

۱	عرض ناشر	نجیب الحسن صدیقی ندوی	۹
۲	مقدمہ	سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۰
۳	تقریظ کتاب	پروفیسر مسعود الحسن عثمانی	۱۱
۴	تعارف کتاب	جناب مولانا محمد علاء الدین ندوی	۱۳
۵	پیش لفظ	محمد فرمان ندوی	۱۸

جمعہ: خصوصیات اور پیغام

۱ اخلاص نیت اور اس کے اثرات ۲۲
۲ اخلاص اور ریاکاری ۲۶
۳ جمعہ ایک عظیم الشان دن ۳۰
۴ سورۂ جمعہ: خصوصیات اور پیغام ۳۴
۵ نماز ایک جامع عبادت ۳۸
۶ نماز میں خشوع وخضوع ۴۲
۷ مساجد ایمانی زندگی کے مراکز ہیں ۴۵

ایمان وعمل صالح

۸ ایمان بالآخرۃ ۵۰
۹ فرشتے اور ان کا فرضِ منصبی ۵۲
۱۰ صراطِ مستقیم اور اس کے بنیادی اصول ۵۶
۱۱ امت محمدیہ کی خصوصیات ۵۹
۱۲ تقرب الٰہی کیسے حاصل ہو؟ ۶۲

۱۳ شریعت کی بالادستی ۶۵
۱۴ حصول جنت کے طریقے ۶۸
۱۵ انسانی کردار کے اعلیٰ نمونے ۷۲
۱۶ انبیاء کرام کی دعائیں اور دعا کے آداب ۷۵
۱۷ دعا انسانی ضرورت ہی نہیں، بلکہ عبادت بھی ہے ۷۹
۱۸ اعمال صالحہ پر تین بشارتیں ۸۲
۱۹ رزق کے دروازے ۸۵

سال نو اور احتساب نفس

۲۰ محرم الحرام اور ہجری کلینڈر ۹۲
۲۱ محرم الحرام اور اس کی خصوصیات ۹۶
۲۲ عاشوراء کی فضیلت اور شہادت کی تاریخ ۱۰۰
۲۳ وقت کی اہمیت اور اس کے تقاضے ۱۰۴

سیرت رسول ﷺ اور پیغام عمل

۲۴ عصر حاضر میں سیرت طیبہ کی معنویت ۱۱۰
۲۵ فضائل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۱۱۳
۲۶ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی ۱۱۹
۲۷ خیر البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲۶
۲۸ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلم وداعی ۱۳۱
۲۹ اسوۂ حسنہ اور پیغام عمل (مکی دور) ۱۳۴
۳۰ اسوۂ حسنہ اور پیغام عمل (مدنی دور) ۱۳۹
۳۱ سیرت نبوی میں قول وعمل کی یکسانیت ۱۴۴

۳۲ اسوۂ نبوی عام انسانی برادری اور خواتین کے سلسلہ میں ۱۵۱
۳۳ سیرت کے بعض واقعات اوران کا پیغام ۱۵۵
۳۴ رسول اللہ ﷺ کے جامع کلمات ۱۵۹
۳۵ درود وسلام کی کثرت مسائل کے حل کرنے کا نسخۂ کیمیا ۱۶۳
۳۶ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اوران کی عظمت شان ۱۶۷
۳۷ شہادت ہے مطلوب ومقصودِ مومن ۱۷۰
۳۸ شہدائے اسلام اوران کی راہِ عزیمت ۱۷۳

معراج، شعبان ورمضان

۳۹ واقعۂ معراج اوراس کے نتائج ۱۸۰
۴۰ شب برأت: فضائل اور آداب ۱۸۴
۴۱ مبارک رات اور مبارک دن ۱۸۷
۴۲ شعبان اوراس کی عبادتیں ۱۹۰
۴۳ رمضان المبارک کا استقبال ۱۹۳
۴۴ رمضان کی آمد آمد ہے ۱۹۷
۴۵ روزہ کی فرضیت اوراس کے تقاضے ۲۰۰
۴۶ رمضان کی خصوصیات ۲۰۶
۴۷ رمضان اور قرآن ۲۱۰
۴۸ عشرۂ مغفرت ۲۱۴
۴۹ احتساب کا مہینہ ۲۱۷
۵۰ جمعۃ الوداع کا پیغام ۲۲۲
۵۱ جمعۃ الوداع: یوم شکر واحتساب ۲۲۷

۵۲ جمعۃ الوداع اوراس کے تقاضے ۲۳۱
۵۳ انفاق فی سبیل اللہ اوراس کی صورتیں ۲۳۶
۵۴ زکاۃ اور رمضان ۲۴۰

عیدین، حج، قربانی

۵۵ عیدالفطر زندگی میں انقلاب کا دن ۲۴۵
۵۶ عیدالفطر کا پیغام ۲۵۲
۵۷ رمضان کے بعد کیا کریں؟ ۲۶۲
۵۸ حج بیت اللہ ۲۶۶
۵۹ دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ۲۷۰
۶۰ مسجدِ اقصیٰ کی پکار ۲۷۴
۶۱ عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت ۲۷۷
۶۲ عشرۂ ذی الحجہ اوراس کے تقاضے ۲۷۹
۶۳ قربانی اوراس کی قسمیں ۲۸۳
۶۴ عیدالأضحیٰ: تاریخ، پیغام ۲۸۶

قرآن کریم: ایک ہدایت نامہ

۶۵ تلاوتِ قرآن اوراس کی فضیلت ۲۹۸
۶۶ قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں ۳۰۳
۶۷ قرآن ساری انسانیت کے لئے ہدایت نامہ ہے ۳۰۶

تعلیم وتربیت

۶۸ علماء روشنی کا مینار ہیں ۳۱۲

۶۹	علم دین کا حاصل کرنا ہر ایک کے لئے ضروری	۳۱۶
۷۰	علم کا مقصد خشیت الٰہی ہے	۳۱۸
۷۱	تربیت اولاد میں عملی نمونہ پیش کرنے کی ضرورت	۳۲۱
۷۲	اولاد کی تربیت: چند تدبیریں	۳۲۴
۷۳	دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے	۳۲۷
۷۴	نیک لوگوں کی صحبت نیک بناتی ہے	۳۳۰
۷۵	لقمان علیہ السلام کی نصیحتیں اور ان کا تربیتی پہلو	۳۳۳

اصلاح معاشرہ

۷۶	اسلامی آداب: کتاب وسنت کی روشنی میں	۳۳۸
۷۷	حقوق العباد: معنویت اور پیغام	۳۴۲
۷۸	اصلاحِ معاشرہ	۳۴۵
۷۹	لایعنی باتوں سے کیسے بچیں	۳۴۹
۸۰	اسلام کا خاندانی نظام	۳۵۳
۸۱	اسلامی طرز معاشرت	۳۵۸
۸۲	حیا ایمان کا ایک حصہ ہے	۳۶۱
۸۳	سلام اور اس کے شرعی طریقے	۳۶۴
۸۴	کامیابی کا راز	۳۶۷
۸۵	عدل وانصاف: معاشرہ کی اہم ترین ضرورت	۳۷۴
۸۶	دنیا کی حقیقت: قرآن کی نظر میں	۳۷۸
۸۷	غیروں کی نقالی ایک شیطانی عمل	۳۸۱
۸۸	اسراف زندگی کا بدنما داغ	۳۸۴
۸۹	تکبر اور اس کی تباہ کاریاں	۳۸۷

۹۰	حسد ایک مہلک بیماری	۳۹۱
۹۱	زبان رحمت ہے نہ کہ زحمت	۳۹۴
۹۲	دل کی عبادتیں اور بیماریاں	۳۹۷
۹۳	گناہوں کی سنگینی اور ان کے اثرات	۴۰۱
۹۴	اسلامی معاشرہ اور ہمارا مزاج	۴۰۵
۹۵	لقمان علیہ السلام کی نصیحتیں اور ان کا تربیتی پہلو	۴۰۹
۹۶	نکاح انسانی ضرورت اور دائمی عبادت	۴۱۳

حالاتِ حاضرہ اور مسلمان

۹۷	حالات کے مقابلہ کی کلید	۴۱۸
۹۸	مسلمان کوئی عام قوم نہیں، بلکہ اللہ کے کائناتی نظام کا حصہ ہیں	۴۲۴
۹۹	ظلم تباہی کا پیش خیمہ ہے	۴۲۸
۱۰۰	مواقع سے فائدہ اٹھانا زندہ ضمیر لوگوں کا کام ہوتا ہے	۴۳۲
۱۰۱	مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات	۴۳۶
۱۰۲	فتنے اور ان کا مقابلہ	۴۴۰
۱۰۳	موجودہ حالات میں ابتلاءات وآزمائش	۴۴۴
۱۰۴	مدارس کا مقصد قیام اور ہماری ذمہ داریاں	۴۴۹
۱۰۵	اوقاف کی حفاظت وقت کی اہم ضرورت	۴۵۳
۱۰۶	ماحولیات اور اسلام	۴۵۷
۱۰۷	عربی واردو مراجع ومصادر	۴۶۱
۱۰۸	صاحب خطبات کی علمی کاوشیں	۴۶۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد لله ، والصلاة والسلام على رسول الله ، وعلى آله وصحبه ومن والاه ، أما بعد :

زبان وقلم قدرت کا شاہکار ہیں، دونوں اظہار خیال کے معتبر ذرائع ہیں، ابتدائے آفرینش ہی سے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے ان کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی ہے، خاص طور سے زبان کا جادو تو ہر زمانہ میں سحر انگیز رہا ہے، انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی دعوت کے لئے زبان ہی کو استعمال کیا ، کیونکہ تحریر وکتابت کے اسباب ان کے زمانہ میں تقریبا مفقود تھے، حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی زبان دانی کی بنا پر خطیب الأنبیاء کا خطاب ملا، نبی امی ﷺ کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ آپ نے کسی درس گاہ اور تربیت گاہ میں ایک حرف نہیں سیکھا، لیکن وہ افصح العرب والعجم قرار پائے، آپ ﷺ کے ارشادہ فرمودہ کلمات وہ سنہرے ٹکڑے ہیں، جن سے امت تا قیامت رہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔

پیش نظر مجموعہ دار العلوم کے استاذ مولانا ڈاکٹر محمد فرمان ندوی کے دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں جمعہ کی نماز سے پہلے دیئے گئے خطبات پر مشتمل ہے ، اس میں ایک مثالی زندگی گذارنے کے اصول ذکر کئے گئے ہیں، مولانا محمد فرمان ندوی نوجوان فضلاء میں سرگرم عمل ہیں، درس وتدریس ، تصنیف وتالیف ، اور دعوت واصلاح کے مشن سے وابستہ ہیں، عربی اور اردو میں ان کی تحریریں ملک اور بیرون ملک کے رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں ، اور منبر ومحراب سے بھی صدائے حق بلند کرنے کی توفیق منجانب اللہ عطا ہوئی ہے، پیش نظر مجموعہ اس کا ایک ادنی مظہر ہے، دعا ہے کہ اللہ کرے زورِ بیان اور زیادہ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو ائمہ مساجد، طلبائے مدارس اور عوام کے لئے سنگ میل بنائیں، تا کہ وہ اس کی روشنی میں دوسروں تک پیغام حق ہونچا سکیں۔

دعا گو

نجیب الحسن ندوی

مکتبہ ندویہ، لکھنؤ

۲۸/۱۱/ ۱۴۴۱ھ

۲۰/۶/ ۲۰۲۰ء

مقدمہ

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مہتمم دار العلوم ندوۃ لعلماء، لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وامام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد :

پیش نظر مجموعہ مسجد ندوۃ العلماء میں نماز جمعہ سے پہلے کی گئی تقریروں پر مشتمل ہے ، برصغیر ہندوپاک میں یہ معمول ہے کہ عربی خطبۂ جمعہ سے پہلے اردو زبان میں عام فہم انداز میں دینی ، دعوتی ، اور اصلاحی مضامین پر مشتمل تقریریں ہوتی ہیں، جن سے عوام وخواص کو فائدہ پہنچتا ہے، اور ان کو ہفتہ واری درس بھی ملتا رہتا ہے۔

عزیز مکرم مولانا ڈاکٹر محمد فرمان ندوی نے میرے ایماء پر خطبہ جمعہ سے پہلے یہ تقریریں کی ، اور بحمد اللہ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے، اب وہ ماشاء اللہ کہنہ مشق مقرر ہو گئے ہیں ، اور پوری برجستگی کے ساتھ عوام وخواص کو خطاب کرتے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالی عزیز موصوف کو مزید توفیق سے نوازے۔

عزیز مکرم نے یہ تقریریں سال کے مختلف جمعوں میں کی ہیں ، ان کو عیدین میں بھی خطاب کرنے کا موقع ملا ہے ، اس طرح سے انہوں نے ان تقریروں کو متعدد عناوین : جمعہ: خصوصیات اور پیغام ، ایمان وعمل ، سال نو اور اس کا پیغام ، سیرت النبی ﷺ ، معراج ، شعبان اور رمضان ، عیدین ، قرآن کریم ، تعلیم وتربیت ، اصلاح معاشرہ اور حالات حاضرہ جیسے جلی موضوعات میں تقسیم کیا ہے ، یہ کتاب ائمہ مساجد، طلبائے مدارس اور اصلاح معاشرہ میں کام کرنے والے حضرات کے لئے ایک دلیل راہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی عزیز موصوف کو مزید توفیقات سے نوازے اور قوم وملت کا زیادہ سے زیادہ کام لے۔

۱۲/ ذی الحجہ ۱۴۴۷ھ

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تقریظ کتاب

پروفیسر مسعود الحسن عثمانی

جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اترپردیش

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دینی، دعوتی اور علمی خدمات اور سرگرمیوں کی ایک روشن تاریخ ہے، جس کے ہر باب اور ہر باب کی ایک ایک سطر میں جہانِ معنی پوشیدہ ہے، اس میں ماضی کی خوبصورت تجلیاں بھی ہیں، اور مستقبل کی بشارتیں بھی ہیں، اور دونوں کے درمیان حال کی قابل غور بصیرتیں بھی نمایاں ہیں۔ انہیں بصیرتوں میں علم ودانش کی جاذب نظر تصویریں چمک کر ندوۃ العلماء کے چہرہ روشن کو مزید تابناک ومنور کرتی رہتی ہیں۔

مولانا محمد فرمان ندوی صاحب کا یہ مجموعہ خطبات (خطبات جمعہ) اس کی بہترین مثال ہے، ندوۃ العلماء کے نوجوان اساتذۂ کرام میں ان کی شخصیت میرے نزدیک بہت قابل احترام ہے، ان کا علم اور ان کا مطالعہ، ان کی دینی فکر اور ملت اسلامیہ کے لئے ان کا احساس واضطراب بہت معتبر اور قابل قدر رہے، مجھے ہمیشہ انہوں نے متأثر کیا ہے، زبان و بیان کی بے پناہ صلاحیتیں، جذبہ صادق کی کیفیتیں اور خطابت کی سچی لطافتیں، قدرت کی طرف سے بہ طور خاص انہیں عطا فرمائی گئی ہیں، ان تمام قدرتی تحائف کو وہ ایک امانت سمجھ کر ان کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اس فریضہ کی انجام دہی ان کے خطبات میں صاف جھلکتی ہے، ان کے زور بیان، ان کے انداز خطاب اور ان کے مطالعہ ومشاہدہ کا سیل رواں سننے والوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے، مجھے بارہا یہ سعادت حاصل ہوئی ہے، خدا کرے کہ ندوۃ العلماء کا دامن ایسے گوہر آبدار سے ہمیشہ بھرا رہے، اور اس کا علمی

کارواں اسی طرح سرگرم سفر رہے۔

مولانا محمد فرمان ندوی صاحب کا یہ مجموعہ خطبات قابل مطالعہ بھی ہے، قابل فکر د غور بھی ہے، دعوت عمل بھی ہے، اس میں بلندیٔ افکار بھی ہے، سلیقہ اظہار بھی ہے، خوبیٔ گفتار بھی ہے، زندگی کی کشتی ثابت کو سیار بنانے کا ہنر بھی ہے، پڑھئے اور صراط مستقیم کی روشن لکیروں پر چلتے رہنے کا قصد کیجئے، دنیا وآخرت میں سرخروئی کے لئے یہی شاہ کلید ہے۔

ندوۃ العلماء میں جمعہ اور عیدین کے خطبات اور خطابات مشہور زمانہ رہے ہیں، ان کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اور ان شاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا، ایسے مواقع پر شہر کے اہل علم کا سنجیدہ ترین طبقہ شریک ہوتا ہے، اور ندوہ کے علمائے کرام اس کی نظر رکھتے ہیں کہ ان تمام حضرات کے سامنے دینی دعوت و پیغام کو مؤثر انداز میں پیش کیا جائے، جوان کے قلب ونظر کو سیراب کر سکے، یہ ندوہ کا امتیاز رہا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس کا یہ امتیاز واعزاز اور وقار وافتخار اب تک قائم ہے، زیر نظر مجموعہ اس کا ثبوت ہے، اور مولانا محمد فرمان ندوی اس کے لئے بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مسعود الحسن عثمانی

دینی تعلیمی کونسل اترپردیش

۲/جولائی ۲۰۲۰ء

تعارف کتاب

جناب مولانا محمد علاء الدین ندوی

(عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد لله الذي نعما يعظنا به، والصلاة والسلام على رسوله الذي تركنا على المحجة البيضاء، وعلى آله و صحبه أجمعين ـ أما بعد :

برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کے یہاں جمعہ کے خطبہ سے پہلے دینی بیانات اور اصلاحی تقریروں کا معمول صدیوں سے چلا آرہا ہے، یہ دینی بیانات اپنی ماہیت اور روح ومزاج کے لحاظ سے تقریبا دینی مواعظ ہیں، مساجد کے علاوہ بھی خطبات ومواعظ کا سلسلہ ہماری اسلامی تاریخ سے ہمیشہ جڑا رہا ہے، قرآن کریم بذریعہ وحی حضور اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر ۲۳؍سال تک نازل ہوتا رہا، اس کا جتنا حصہ نازل ہوتا اسے آپ ﷺ ایک خطبہ کی شکل میں صحابہؓ تک پہنچا دیتے۔

انسان کو سرے سے بدل کر انسانیت کے قالب میں ڈھال دینے والی یہ حیات بخش کتاب مختلف ناموں سے جانی جاتی ہے: کتاب ہدایت، کتاب رحمت، کتاب فرقان، کتاب ذکر، کتاب نور، کتاب شفا وغیرہ، اسی طرح اُسے کتاب موعظت بھی کہا گیا ہے۔

تمام انبیاء اور حضور خاتم الأنبیاء ﷺ نے دین کی دعوت وتبلیغ میں ہمیشہ خطبوں، مواعظ اور بیانات کا سہارا لیا۔ یہ ہر زمانے میں کسی بھی دعوت وتحریک کی تبلیغ واشاعت کے لئے ایک وسیع، کارگر اور فطری طریقۂ کار رہے ہیں۔ تبلیغ اسلام کے لئے صرف خطبوں اور مواعظ ہی کے ان دو اسالیب کو پیش نظر میں رکھ کر اگر اِس مسموع ادبی صنف کو شروع سے ضبط تحریر میں لانے کا التزام کیا گیا ہوتا تو کسی بھی اسلامی کتب خانے کے ذخیرۂ کتب میں یہ صنف

ادب سب سے بڑا ذخیرہ ہوتا، اگرچہ آج بھی مواعظ، ملفوظات اور تقاریر وخطب کا ذخیرہ کسی طرح کم نہیں ہے، کمی ہے تو ان یارانِ تیز گام اور ان غیرت مند جوانانِ اسلام کی ہے جن کی متاع دین ودانش کہیں کسی نے چھین لی ہے، اب ان کی بڑی تعداد اپنے موروثی علم وحکمت سے بھی بیگانہ ہو چلی ہے!!!

ادھر چند دہائیوں سے جب سے پریس اور پرنٹنگ نے ترقی کی دنیا میں اُڑان بھری ہے، خطبات اور مواعظ (جو اصلاً سننے کی چیز ہیں، نہ کہ پڑھنے کی) کو بھی کتابی شکل میں محفوظ کر دینا آسان ہو گیا ہے، چنانچہ بطور مثال صرف دیوبندی مکتبۂ فکر کے اکابر علماء وواعظین کے خطبات ومواعظ پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جائے تو آدمی حیرت میں ڈوب جائے گا، ان پر اصاغر علماء وواعظین کے مجموعے مستزاد، ذرا ملاحظہ ہو:

۱۔ خطبات حکیم الأمت: ۳۲؍جلدیں ۲۔ خطبات حکیم الاسلام: ۱۲؍جلدیں ۳۔ اصلاحی خطبات: ۲۳؍جلدیں ۴۔ اصلاحی بیانات: ۱۰؍جلدیں ۵۔ اصلاحی تقریریں: ۹؍جلدیں ۶۔ خطبات احتشام: ۷؍جلدیں ۷۔ خطبات رحیمی: ۱۰؍جلدیں ۸۔ خطبات فقیر: ۴۳؍جلدیں ۹۔ خطبات محمود (حسن گنگوہی): ۳؍جلدیں ۱۰۔ خطبات اسلم ۱۰ جلدیں ۱۱۔ ندائے منبر ومحراب: ۸؍جلدیں ۱۲۔ خطبات علی میاں: ۸ جلدیں ۱۳۔ اصلاحی مواعظ: ۸؍جلدیں ۱۴۔ طالبات تقریر کیسے کریں؟: ۱۵؍جلدیں ۱۵۔ خطبات عثمانی ۷؍جلدیں۔ وھلم جرا

بعض اہل دانش جن کے مزاج میں دانشوری، علمیت اور موضوعیت حاوی ہوتی ہے، وہ رقیق ولطیف اور کسی قدر جذباتی واعظانہ بیان کی ہمت شکنی کرتے نظر آتے ہیں اور اسے ”عوامی سطح کی چیز“ قرار دیتے ہوئے لوگوں کو عمیق فکر اور موضوعیت پر مبنی حقائق کو علمی خطاب کے قالب میں پیش کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہمیں نہ تو موثر، رقت انگیز اور سرد جذبات کو گرم کرنے والے جذباتی وعظ واسلوب کی ضرورت کا انکار ہے، نہ ہی مبنی بر حقیقت علمی خطاب سے کسی قسم کا بیر ہے، دونوں کے اسالیب میں واضح امتیازی خطوط کے پائے جانے

کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کی ضرورت بھی اور دونوں میں اس کی چاہت بھی ہے ، خاص طور سے خطابت اور موعظت میں جب تک علمی حقائق اور فنی جمالیات کا حسین امتزاج نہ ہوگا، کہاں دل ونگاہ میں اتر پائے گی۔راقم سمجھتا ہے کہ سرورِ عشق اور علم ویقین کے نور کے بغیر بات بن ہی نہیں سکتی۔جگر مرادآبادی نے کیا خوب کہا: ؎

واعظ کا ہر ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقین کا نور نہیں

ہمیں دونوں ہی طرح کے اسلوب کے شاہکار نمونے کے طور پر قرآن جیسی کتاب پر سب سے پہلے نظر جاتی ہے:

’’اللہ نے بہترین کلام (أحسن الحدیث) اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں (الزمر:۲۳)۔

دنیا میں صرف وہی لوگ زندہ ہیں ، جن کا دل زندہ ہے اور جن کا دل زندہ نہیں ہے وہ مردہ ہیں۔قرآن زندہ اور باشعور انسانوں کو خطرات سے آگاہ کرتا ہے اور مردہ دلوں کو وحی الٰہی کے آب حیات سے زندگی عطا کرتا ہے: اعلموا أن اللہ یحیی الأرض بعد موتھا۔اس تناظر میں پورا قرآن وعظ ونصیحت قرار پاتا ہے۔اللہ کا فرمان ہے: یأیھا النا س قد جاء تکم مو عظة من ربکم و شفاء لما فی الصدور و ھدی و رحمة للمؤمنین (یونس:۵۸) (لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے، یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے، اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لئے رہنمائی اور رحمت ہے)۔

یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات والا کمالات کو بہترین واعظ کہتا ہے: ان اللہ نعما یعظکم به (اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے (النساء:۵۸)

رسولِ رحمت اور پیغمبرِ ہدایت ﷺ امام الواعظین ہیں ۔ایک صحابی حضرت عرباض بن ساریہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں نہایت بلیغ وعظ فرمایا، جس سے آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اور دل لرز اٹھے (وعظنا رسول اللہ ﷺ موعظة بلیغة ذرفت منھا العیون، ووجلت منھا القلوب)

غزوۂ حنین کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں چند انصاری نوجوانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اور جذبات کی رَو نطقِ زبان تک آگئی تو آپ ﷺ نے انہیں مطمئن کرنے اور ان کے جذبات کو سکینت کے آب زُلال سے سرشار کردینے کے لئے جس بلیغ انداز میں انہیں خطاب فرمایا وہ عربی وعظ وخطاب کا شاہکار نمونہ ہے۔

وعظ وخطاب وہ پبلک ڈائس ہے، جہاں سے کسی بھی اٹھائے ہوئے مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے، دلوں کی گرہیں کھلتی ہیں، مردہ دل میں زندگی عود کرآتی ہے، نفس کی سرکشی پر لگام لگتا ہے، غفلت کی چادریں چاک ہوتی ہیں، اگر وعظ ونصیحت کا دل پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ انسان کا دل بے جان پتھر بن گیا ہے، یا اس شور زمین کی طرح ہوگیا ہے، جو حیات بخش پانی سے بھی ہری بھری نہیں ہوتی۔

مولانا محمد فرمان ندوی کے مواعظ وخطابات کا زیرنظر مجموعہ (خطبات جمعہ) اپنے موضوع وہیئت اور اپنی روح وقالب کے لحاظ سے مواعظ ہی کی قبیل کی چیز ہے، ہم نے ابتدا میں جن مجموعۂ مواعظ کا تذکرہ کیا ہے، یہ مجموعہ بھی اسی سلسلة الذھب کی ایک کڑی ہے۔

’’خطبات جمعہ‘‘ متعدد جلی عناوین مثلاً: جمعہ خصوصیات اور پیغام۔ ایمان وعمل۔ سال نو اور احتساب نفس۔ سیرت رسول ﷺ اور پیغام عمل۔ معراج، شعبان ورمضان عیدین۔ حج ،قربانی۔ قرآن کریم ایک ہدایت نامہ۔ تعلیم وتربیت۔ اصلاح معاشرہ۔ حالات حاضرہ اور مسلمان پر مشتمل ہے۔ پھر ان عناوین کے ماتحت پچاسوں موضوعات پر قیمتی معلومات کو مختصر وقت میں سمیٹنے کی کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔مولانا محمد فرمان ندوی کے یہاں کہیں ٹھہراؤ

نظر نہیں آتا، وہ ہمہ وقت سعی وعمل میں مصروف اور بہتر سے بہترین کی طرف بڑھنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان وقلم، ذہن ودماغ اور قلب ونظر میں زرخیزی اور بالیدگی بڑھتی جارہی ہے: اللہ اس زور قلم اور طاقت گویائی میں اور ترقی دے۔

خاص بات یہ ہے کہ یہ خطبات دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں جمعہ کے خطبے سے قبل دیئے گئے ہیں، ان خطبات وبیانات کی ضرورت صرف عوام ہی کو نہیں، بلکہ خواص کو بھی ہے، اگر ان سے عوام کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کی دینی ضروریات میں انہیں مدد ملتی ہے، تو علماء، مفکرین اور طالبان علوم نبوت کو بھی تزکیہ قلب وتہذیب نفس کے نقطہ نظر سے ان کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں تو ان خطبات کا فائدہ سہ گونہ ہے، خود واعظ و خطیب (مصنف) اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے، سامعین میں سے کتنے ہوں گے جن کو ان خطبات سے راہ راست کا پتا اور منزل مقصود کا سراغ ملا ہوگا اور اب کتابی شکل میں منظر عام پر آجانے کے بعد پڑھنے والے اس سے مستفید ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ کوشش بار آور ہو اور مساجد میں وعظ کہنے والے اور جلسوں میں دینی تقریریں کرنے والے اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

خاکسار

محمد علاء الدین ندوی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

٧/رمضان المبارک، ١٤٤١ھ بروز جمعہ

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين أما بعد :

جمعہ کا دن ہفتہ کی عید ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے نماز جمعہ رکھا ہے، اس میں معاشرۂ انسانی کے چھوٹے بڑے افراد جمع ہوتے ہیں، نماز سے پہلے ایک خطبہ دیا جاتا ہے، جس میں تقویٰ وطہارت کی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، اور دوسری انمول نصیحتیں کی جاتی ہیں، خطبہ چونکہ عربی میں ہوتا ہے، اور سارے حاضرین عربی نہیں سمجھتے، اس لئے برصغیر میں خطبہ سے پہلے اردو میں تقریروں اور بیانات کا ایک مبارک سلسلہ قائم ہے، ماشاء اللہ یہ سلسلہ بڑا مفید اور ایمان وعمل کے جذبہ کو مہمیز کرنے والا ہے، خاص طور سے دینی ماحول سے دور رہنے والے حضرات تو اس کو بڑی قیمتی سوغات تصور کرتے ہیں، اور ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں عوام وخواص کا ایک بڑا مجمع ہوتا ہے، ان کے سامنے خطبہ سے دس منٹ پہلے مختصر تقریر وبیان کا سلسلہ ہے، اس میں دار العلوم کے اساتذہ میں کسی استاذ کا خطاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق اور استاذ گرامی قدر جناب مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) کی توجہ خاص سے مجھے بھی اس موقع پر کچھ عرض کرنے کا موقع ملا، بحمد اللہ اس کا ایک مجموعہ تیار ہوگیا، جو خطبات جمعہ کے نام سے پیش کیا جارہا ہے۔

اس مجموعہ اور دوسرے مجموعہ خطبات میں فرق یہ ہے کہ اس میں صرف جمعہ اور عیدین کی تقریریں ہیں، اور مختصر ہیں، جب کہ دوسرے مجموعوں میں دیگر مواقع کی تقریریں

اور لمبی اور طویل وعریض، جن سے اس تیز رفتار اور مشینی دور میں استفادہ کے لئے خاصا وقت درکار مطلوب ہے، ان خطبات کو نو آموز ائمہ وحفاظ یاد کر کے جمعہ کے دن حاضرین کو خطاب کر سکتے ہیں۔

جمعہ میں تقریر کے لئے چونکہ وقت محدود ہوتا ہے، اس لئے متعلقہ موضوع پر پہلے سے مواد اکٹھا کرنے اور کسی حد تک مرتب کر کے پیش کرنے کا معمول رہا، تاکہ موضوع پر کم وقت میں روشنی پڑ جائے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہے، مزید یہ کہ سامنے اہل علم کا مجمع تھا، اس لئے کوشش کی گئی کہ ہر بات حوالہ اور دلیل کے ساتھ پیش کی جائے، مزید جن حوالہ جات کی کمی رہ گئی تھی اس کی تلافی ترتیب کے وقت کر دی گئی ہے، اور کتاب کے اخیر میں مراجع و مصادر کے نام سے ایک فہرست دے دی گئی ہے، تاکہ جن کتابوں سے تقریروں کی تیار میں مدد لی گئی ہے، ان کا ذکر آ جائے، اور ان کے مصنفین کا شکریہ بھی ادا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے استاذ گرامی قدر جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) کو کہ انہوں نے ایک دو موقعوں پر تقریر سن کر فرمایا کہ آپ کم وقت میں زیادہ مواد دے دیتے ہیں، ایک موقع پر راقم نے جب عربی خطبات جمعہ کا مجموعہ پیش کیا تو مزید فرمایا کہ آپ کے اردو بیانات کا بھی مجموعہ آنا چاہئے، مزید دوسرے اساتذہ اور احباب کا بھی تقاضا رہا، اس لئے لاک ڈاون (مارچ، اپریل، مئی، جون ۲۰۲۰ء) میں ان خطبات کے مرتب کرنے کا خیال ہوا، اور بحمد اللہ مکمل ہوا۔

راقم شکر گذار ہے عزیز مکرم مولوی سہیل ندوی لکھنوی اور قاضی انس ندوی کا کہ انہوں نے بروقت ان تقاریر کو یوٹیوب پر بھی اپ لوڈ بھی کر دیا، جن سے استفادہ جاری ہے۔ کتاب پر مقدمہ کے لئے حضرت الأستاذ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کی شخصیت سے بہتر کوئی ذات نہیں ہوسکتی، انہیں کی ایماء پر ان تقریروں کا سلسلہ کا رہا، اور بحمد اللہ آج تک جاری ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کو بہترین بدلہ عطا

فرمائے اور ان کے سایہ کو صحت وعافیت کے ساتھ ہمارے اوپر دراز فرمائے۔ موضوع کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کے لئے میں نے استاذ محترم جناب مولانا محمد علاء الدین ندوی سے درخواست کی، انھوں نے میری معمولی درخواست پر ماشاء اللہ ایک قیمتی تعارف تحریر کر دیا، جو کتاب کی زینت ہے۔

راقم سراپا شکر گذار ہے مخدوم گرامی جناب ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی (جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل، اترپردیش) کا، جو جمعہ اور عیدین کی نمازیں دار العلوم کی مسجد ہی میں اہتمام سے ادا کرتے ہیں، انہوں نے راقم کی فرمائش پر خطبات اور صاحب خطبات سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کئے، جو اس کے لئے ہمت افزا ہیں۔ مکتبہ ندویہ کے ڈائریکٹر مولانا نجیب الحسن ندوی راقم کے بے پناہ شکریہ کے مستحق ہیں، جو اس کی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اسی کے ساتھ تمام معاونین اور محسنین کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر سے نوازے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کو نافع بنائیں اور قبول فرمائیں: ربنا تقبل منا، انك أنت السميع العليم ۔ وتب علينا، انك أنت التواب الرحيم

طالب دعا
محمد فرمان ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۵ر شعبان ۱۴۴۱ھ
۲۰ر اپریل ۲۰۲۰ء

جمعہ: خصوصیات اور پیغام

اخلاص نیت اور اس کے اثرات

الحمد للّٰہ رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد : فقد قال اللّٰه تعالى: أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم:

"وَقُلِ اعْمَلُوْا، فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ، وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ." (التوبة : ١٠٥)

(آپ کہہ دیجئے کہ عمل کرتے جاؤ، اللہ، اللہ کے رسول اور اہل ایمان عنقریب تمہارے عمل کو دیکھ لیں گے، اور تم جلد ہی اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ہر کھلی اور چھپی ہوئی بات سے واقف ہے، اور وہ تمہارے عمل تم کو بتادے گا)

حضرات ! دل کی عبادتوں میں ایک اہم عبادت اخلاص ہے، اخلاص کے معنی چھانٹنا اور ملاوٹ سے پاک کرنا ہے، دوسرے الفاظ میں انسان اپنی عبادت کے ذریعہ صرف اور صرف اللہ تعالی کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی نیت کرے اور اس میں کسی اور دنیاوی مقصد کی ملاوٹ نہ کرے تو یہ اخلاص ہے۔

اخلاص کی اہمیت وضرورت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی عبادت کو قبول کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ شرط لگائی ہے کہ عمل کرنے والا موحد ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا ہو، دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنے کا جذبہ رکھتا ہو، تیسرے یہ کہ جو عمل کر رہا ہو وہ شریعت وسنت کے مطابق ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدۃ:٢٧) (اللہ تقوی والوں کے عمل کو قبول کرتا ہے)۔

حضرات! ہر عبادت کی ایک روح ہوتی ہے، اور عبادت میں اس کی حیثیت وہی

ہوتی ہے جیسے جسم میں روح کی ہوتی ہے، جس طرح جسم بغیر روح کے مردہ ہوتا ہے، اسی طرح عبادت بھی بغیر اخلاص کے مردہ اور بے جان ہوتی ہے، اخلاص دل کا عمل ہے جو دل کو جلا بخشتا ہے، اور جس دل میں اخلاص نہیں ہوتا وہ تاریک ہوجاتا اور اس پر اندھیرا چھا جاتا ہے، اخلاص چونکہ دل کا عمل ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی نظر اسی پر ہوتی ہے، صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا گیا ہے، حضرت ابوھریرۃؓ راوی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کا دیکھتا ہے (صحیح مسلم بروایت ابوھریرۃ) اور اخلاص کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں آیا ہے: "وَمَا أُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ." (البينة: ٥) (حالانکہ انہیں بس یہی حکم ملا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں کہ دین کو اسی کے لئے خالص کرکے یکسو ہوکر) اور ترغیب وترہیب میں رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا گیا ہے: الدُنيا مَلعُونَةٌ ، ومَلعُونٌ مَا فِيهَا الا ما ابتُغِيَ بِهِ وَجهُ اللهِ (دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے، سوائے اس کے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کو طلب کیا گیا ہو) (طبرانی)

حضرات! اخلاص اور عام نیتوں میں کیا فرق ہے، اس کے سمجھنے کے لئے صحیح بخاری میں ایک قصہ مذکور ہے:

معن بن یزیدؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد یزید نے چند دینار صدقہ کرنے کے لئے نکالے، اور مسجد میں ایک آدمی کے پاس رکھ دئے، میں مسجد میں گیا تو میں نے وہ دینار اٹھالئے، اور انہیں گھر لے آیا، میرے والد نے کہا: وَاللهِ مَا اِيَّاكَ أَرَدْتُ (خدا کی قسم! میں نے تمہیں دینے کا ارادہ نہیں کیا تھا)، چنانچہ باپ اور بیٹے رسول اکرم ﷺ کے پاس آئے تاکہ آپ ﷺ ہمارے جھگڑوں میں فیصلہ کردیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے یزید! تمہارے لئے وہ ہے جس کی تم نے نیت کی، اور اے معن! تمہارے لئے وہ ہے، جو تم نے لے لیا، یعنی یزید نے صدقہ کرنے کی نیت کی تھی، اس لئے ان کی نیت کے مطابق

وہ صدقہ ہوگیا، اور معن نے صدقہ کے دیناروں کو لے لیا تو رسول اکرم ﷺ نے انہیں اس کا مستحق قرار دیا، اس سے ثابت ہوا کہ ہر انسان کو اس کے عمل سے وہی چیز ملتی ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے، حضرت ابوھریرۃؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے ایک آدمی نے کہا کہ میں آج کی رات اپنے مال میں سے کچھ حصہ صدقہ کروں گا، وہ رات میں نکلا اور اس نے اپنا مال ایک زانیہ کے ہاتھ میں صدقہ کردیا، جب صبح ہوئی تو لوگ اس پر تبصرہ کرنے لگے کہ اس نے فلاں بدکار عورت کو صدقہ کیا ہے، پھر دوسرے دن اپنا مال اس ارادہ سے لے کر نکلا کہ آج کی رات اس کو صدقہ کروں گا، جب رات ہوئی تو اس نے ایک چور کے ہاتھ میں صدقہ کردیا، صبح ہوئی تو لوگ پھر اس کے اس عمل پر تبصرہ کرنے لگے کہ اس نے فلاں چور کے ہاتھ میں اپنا مال صدقہ کیا، اسی طرح تیسرے دن اپنا مال اسی ارادے سے لے کر نکلا، تو جب رات ہوئی تو اس نے ایک مالدار شخص کے ہاتھ میں اپنا مال صدقہ کردیا ہے، چنانچہ ایک دن وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے خواب میں دکھلایا گیا کہ تمہارے صدقے اللہ کے نزدیک قبول ہو گئے، اس نے زانیہ کو اس لئے صدقہ دیا کہ شاید وہ اپنی گندی حرکت سے باز آئے، چور کو اس لئے دیا، شاید کہ وہ چوری سے رک جائے، اور اس نے مالدار کو اس لئے دیا، شاید کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر غور وفکر کرے۔

حضرات! ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ اخلاص سے انسان کے عمل کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے، بعض اوقات ایک ہی صف میں ایک امام کے پیچھے دو آدمی نماز پڑھتے ہیں، لیکن دونوں کی نماز میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، جس نمازی کی نماز میں اخلاص ہوتا ہے اور وہ سنت کے مطابق ہوتی ہے تو اس نمازی کی اللہ کے یہاں بڑی قدر ہوتی ہے، اور جس نمازی کی نماز میں اخلاص نہیں ہوتا، وہ نماز اس کے منھ پر ماردی جاتی ہے، غرض اخلاص ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال کو

درست طریقے سے انجام دے:

۱۔ اخلاص ایک جج کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس وقت تک فیصلہ نہ کرے جب تک کیس کا بغور مطالعہ نہ کرے۔

۲۔ اخلاص ایک مدرس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے تدریسی عمل میں بھرپور محنت کرے۔

۳۔ اخلاص ایک طالب علم کو مجبور کرتا ہے کہ وہ علم دین کے حصول میں تن من دھن کی بازی لگادے۔

۴۔ اخلاص ایک تاجر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ صاف ستھرا لین دین کرے، دھوکہ، فراڈ، خیانت اور جھوٹ سے اجتناب کرے۔

۵۔ اخلاص ایک قلم کار اور مصنف کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ اور قلم سے حق بات لکھے۔

۶۔ اخلاص ایک ملازم کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی پوری دیانتداری سے انجام دے۔

غرض اخلاص ہر آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ حق کا اور حق والوں کا ساتھ دے، اور ان کا دفاع کرے۔

حضرات! اب آیئے دیکھتے ہیں: اخلاص کے کیا فوائد اور ثمرات ہیں:

۱۔ دنیا وآخرت میں سربلندی ۲۔خوف اور غم سے نجات ۳۔پریشانیوں سے نجات ۴۔برائی اور بے حیائی سے بچنے کی توفیق ۵۔شیطان کے شر سے حفاظت۔ ۶۔خاتمہ اخلاص پر ہو تو انسان جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔ ۷۔اخلاص کے ذریعہ دل پاک ہوتا ہے۔ ۸۔اللہ کے عذاب سے نجات ہوتا ہے۔ ۹۔عرش الٰہی کا سایہ حاصل ہوگا۔

اخلاص کے منافی کاموں میں ریاکاری ہے، وہ نیکیوں کو ضائع اور اعمال صالحہ کو برباد کردیتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے دجال سے بھی زیادہ خطرناک بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کی دولت نصیب فرمائے اور ریاکاری سے حفاظت فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

اخلاص اور ریاکاری

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد ، فقد قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم :
"قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ." (الأنعام: ١٦٢) (آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری (ساری) عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت (سب) جہانوں کے پروردگار اللہ ہی کے لئے ہیں)

حضرات! دل کی عبادتوں میں اہم عبادت اخلاص نیت ہے، اخلاص کہتے ہیں دل کو ہر قسم کے خیال سے پاک کر کے اللہ کے لئے کام کرنے کو، اخلاص کامیابی کی بنیاد ہے، جس طرح عمارت کے لئے بنیاد کی ضرورت ہے، جسم کے لئے روح کی ضرورت ہے، اس کے بغیر کوئی عمل صحیح نہیں ہوگا، اسی طرح ہر عمل کے لئے اخلاص کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ، فَانْهَارَ بِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ." (التوبة: ١٠٩) (سو آیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور رضامندی پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر رکھی جو گرنے ہی کو ہے، پھر وہ عمارت اس کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑی، اور اللہ راہ نہیں دکھاتا ظالم لوگوں کو)

حضرات! کافروں کے اعمال چونکہ اللہ کے لئے نہیں ہوتے ہیں، اور ان میں

اخلاص کا عنصر نہیں ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنْثُوْرًا." (الفرقان: ٢٣) (اور ہم ان کاموں کی طرف متوجہ ہوں گے جو یہ کرچکے ہیں، سوان کو ایسا کردیں گے جیسے پریشان غبار) یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا ہے کہ کسی بھی عمل کی درستگی اور مقبولیت کی دلیل یہ ہے کہ وہ درست ہو، اوراللہ کے لئے ہو: "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ." (ابراهيم: ٢٤) (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی (اچھی) تمثیل کلمہ طیبہ کی بیان کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے، جس کی جڑ (خوب) مضبوط ہواوراس کی شاخیں (خوب) اونچائی میں جارہی ہوں)، اس لئے اخلاص ہر عمل میں مطلوب ہے، نماز، روزہ، زکاۃ، حج، جہاد، دعوت ہر چیز میں اخلاص مطلوب ہے، ایک مزدور، ایک مشیر، ایک افسر، ایک معلم، ایک متعلم ہر ایک سے اپنے عمل میں اخلاص مطلوب ہے، اگر عمل میں اخلاص ہے تو دنیا میں اچھے نتائج ظاہر ہوں گے اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ بہترین جزاء عطا فرمائیں گے۔

حضرات! اخلاص نیت کے سلسلہ میں تین آیتیں سنئے:

١- وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ، وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ." (البينة: ٥)
(حالانکہ انہیں بس یہی حکم ملا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں کہ دین کو اسی کے لئے خالص کرکے یکسو ہوکر، اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکاۃ دیا کریں)

٢- "قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ." (الأنعام: ١٦٢) (آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری (ساری) عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت (سب) جہانوں کے پروردگار اللہ ہی کے لئے ہیں)

٣- "فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهِ، فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا، وَلَا يُشْرِكْ

بِعِبَادَةِ رَبِّهِ اَحَدًا." (الكهف: ١١٠) (سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ نیک کام کرتا رہے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے)

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مدینہ میں کچھ افراد ایسے ہیں جنہوں نے کوئی وادی طے نہیں کی، مگر وہ اللہ کے یہاں اجر وثواب کے مستحق ہیں، ان کو عذر نے روک لیا ہے، دوسری حدیث میں ہے کہ انسان اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اس کو اس کا ثواب ملتا ہے، یہاں تک کہ بیوی کے منھ میں لقمہ ڈالتا ہے تو بھی اسے ثواب ملتا ہے۔ اور مشہور حدیث ہے کہ تین آدمی کہیں جارہے تھے، رات ہوگئی، غار میں پناہ لی، پھر بارش کی وجہ سے ایک چٹان نے غار کے منہ کو بند کردیا، اب ان تینوں کے پاس اخلاص سے کئے گئے عمل کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص والے عمل کو دیکھتے ہوئے ان کی دعا قبول کی، اوران کو غار سے نجات ملی۔

حضرات! اخلاص کی ضد ریاء ہے، اوراس کو چھوٹا شرک کہتے ہیں، شریعت میں ریا کاری کی بڑی مذمت کی گئی ہے، قرآن میں آیا ہے: "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ، اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ." (الماعون: ۴-۵) (بڑی خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں اور جو دکھاوا کرتے ہیں)، ریاکاری منافقوں کی صفات میں ہے: "وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلَاةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاءُوْنَ النَّاسَ." (النساء: ۱۴۲) (اور یہ لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں)، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ مَعِيَ فِيْهِ غَيْرِيْ، تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ." (میں شرک کرنے والے لوگوں کی شرک سے بری ہوں، جو بھی کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس میں وہ میرے ساتھ شریک کرتا ہے تو اس کو اس کے شرک پر چھوڑ دیتا ہوں)

اگر ریاکاری کے مرض میں انسان مبتلا ہو تو اس کو دو کام کرنے چاہئے:

۱۔اپنے کام پر لوگوں کی تعریف کا منتظر نہ رہے۔

۲۔اپنے کام کو لوگوں سے چھپائے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اخلاص اور ریاکاری دونوں جمع نہیں ہوسکتے، جس طرح آگ اور پانی جمع نہیں ہوسکتے، رسول اکرم ﷺ نے عبادات کو چھپانے اور ریاکاری سے دور رہنے والے شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ عرش کے سائے میں ہوگا: ایک وہ شخص جس نے صدقہ کیا تو اس کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہیں کہ دائیں ہاتھ نے کیا کیا، دوسرا وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو ایسا یاد کیا کہ اس کی آنکھیں بہہ پڑیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اخلاص کی دولت نصیب فرمائے اور ریاکاری سے دور فرمائے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

جمعہ ایک عظیم الشان دن

الحمد للّٰه ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد: فقد قال اللّٰه تعالى: "يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ، فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ، وَذَرُوا الْبَيْعَ، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ." (الجمعة :۹)

(اے مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو، اور خرید وفروخت چھوڑ دیا کرو، اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے)۔

جمعہ ایک بابرکت دن

حضرات! جمعہ کا دن ایک عظیم الشان دن ہے، یہ مسلمانوں کے لئے ہفتہ کی عید، اور بے حد اجر وثواب حاصل کرنے اور مغفرت پانے کا دن ہے، اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اپنے فضل وکرم سے اس دن کو ہفتہ کی عید کے طور پر دیا ہے، مزید برآں امت محمدیہ کو اس دن کو اختیار کرنے کی ہدایت دی، ورنہ سابقہ امتیں اس دن کو اختیار کرنے سے محروم رہیں۔

جمعہ کے معنی متفرق چیزوں کو اکٹھا کرنے کے ہیں، علامہ ابن اثیر نے ''النہایہ فی غریب الحدیث'' میں لکھا ہے کہ جمعہ میں لوگ اکٹھا ہوتے ہیں، اس لئے اس کو جمعہ کہا جاتا ہے، دوسرے اہل علم کا کہنا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار خیر وبرکت جمع کردی ہے، اس لئے اس کو جمعہ کہتے ہیں (صحیح ابن خزیمہ ج۳/۱۱۷)

حضرات! زمانہ جاہلیت میں جمعہ کا دن بڑا قابل احترام تھا، قریش اس دن جمع ہوتے، اور کوئی خطیب اس دن کھڑا ہوتا، اور تقریر کرتا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تذکرہ کرتا، اور اس بات پر فخر کرتا کہ ان میں ایک نبی ہوگا، اس دن کی اہمیت کے پیش نظر کعب بن لؤی نے اس کو یوم العروبۃ کا نام دیا تھا (جس کے معنی عربوں کا خاص

دن ہے)۔اس دن میں دو چیزیں اہمیت کی حامل ہیں: ایک جمعہ کا دن بہت مبارک ہے، دوسرے اس میں نماز جمعہ کو مشروع کیا گیا۔

جمعہ کا دن سب سے افضل دن

حضرات! سب سے پہلے ہم جمعہ کے دن کا تذکرہ کرتے ہیں، یہ سب سے افضل دن ہے، اس میں بے شمار خیر وبرکت جمع ہیں، بخاری شریف کی روایت ہے، حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم لوگ آخری امت ہیں، لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے، جب کہ پچھلی امتوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی، اور یوم جمعہ ان پر فرض کیا گیا، لیکن وہ اس دن کے بارے میں اختلاف کا شکار ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی، یہود نے ہفتہ کا دن اور نصاریٰ نے اتوار کا دن اختیار کیا۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوا جمعہ کا دن ہے، اس دن حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی، اسی دن وہ جنت میں داخل کئے گئے، اور اس دن اس سے نکالے گئے، اور قیامت بھی اسی دن آئے گی۔

ابن ماجہ کی روایت ہے کہ یہ دن جب بھی آتا ہے تو اللہ کے فرشتے، زمین وآسمان، ہوائیں، پہاڑ اور سمندر سب سہمے ہوتے ہیں۔

اس دن کی خصوصیات میں کثرت سے رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا ہے۔ جمعہ کا دن چونکہ تمام دنوں کا سردار ہے، اس لئے اس دن درود بھیجنے کا جو ثواب ہوتا ہے، دوسرے دنوں میں نہیں ہوتا۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ جب یہ دن آئے تو مجھ پر درود بھیجا کرو، کیونکہ تمہارے درود مجھ پر پیش کئے جائیں گے۔

جمعہ کے دن کی خصوصیات میں سورہ کہف کی تلاوت کرنا بھی ہے، جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف کی تلاوت کرتا ہے، وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ اس دن کی خصوصیات میں یہ ہے کہ اس دن کی نماز فجر کی پہلی رکعت میں الم سجدہ اور دوسری میں سورہ

انسان پڑھنا مستحب ہے۔

متفق علیہ حدیث ہے، اور حضرت ابو بردہ اور ابو موسیٰ اشعریؓ راوی ہیں، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے جس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور وہ امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک ہے، دوسرے یہ کہ عصر کے بعد کا وقت ہے، علامہ ابن حجرؒ اور حافظ ابن قیمؒ نے اس قول کے سلسلہ میں ۴۳/اقوال نقل کئے ہیں، اور انھیں دونوں کو صحیح ترین قرار دیا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ جو بھی مسلمان جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات کو فوت ہو تو اللہ تعالیٰ اسے قبر کے فتنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔

جمعہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کے لئے عید کا دن ہے، اور ظاہر ہے کہ عید کے دن روزہ نہیں رکھا جاتا۔

نماز جمعہ

نماز جمعہ اسلام کا شعار ہے، اس لئے اس دن نماز کے لئے خصوصی اہتمام کرنا چاہیے، اسلامی ممالک میں جمعہ کے دن چھٹی ہوا کرتی ہے، دینی مدارس میں بھی یہی معمول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن بہت اہتمام فرماتے تھے، نماز جمعہ کے مستحبات وسنن میں غسل کرنا، خوشبو لگانا، مسواک کرنا، اچھا لباس زیب تن کرنا، اور پہلے مسجد پہونچنے کی کوشش کرنا ہے۔

نمازِ جمعہ کے فضائل حدیثوں میں آئے ہیں:

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے جمعہ کے دن غسل کیا، پھر اول وقت میں جمعہ کے لئے نکلا تو گویا اس نے اونٹ کی قربانی دی، اس کے بعد جو نکلا تو گویا اس نے گائے کی قربانی دی، اس کے بعد جو نکلا اس نے سینگوں والی بکری کی قربانی دی، اس کے بعد جو آیا اس نے گویا مرغی کی قربانی دی، اس کے بعد جو آیا، اس نے انڈا کو اللہ کے سامنے پیش کیا، اور پھر امام خطبہ کے لئے نکل جاتا ہے تو فرشتے خطبہ سننے کے لئے آجاتے ہیں۔

صحیحین کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے غسل کیا اور جمعہ میں حاضر رہا، نماز پڑھی، پھر خاموش رہا، تو ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے سارے گناہ اس کے معاف ہوجاتے ہیں، اور مزید تین دن کے اور بھی۔

سنن ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضرت اویس بن اویس ثقفیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور جلدی جمعہ کے لئے نکلا تو اس کے ایک ایک قدم پر ایک سال کے روزے اور نماز کا ثواب ملے گا۔

عمداً جمعہ کی نماز چھوڑنے والے افراد کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سخت تنبیہ فرمائی ہے، صحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا کہ کسی کو نماز پڑھانے کا حکم دوں اور ایسے لوگوں کو جو جمعہ چھوڑ کر گھروں میں ہیں، ان کے گھر جلادوں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو لاپرواہی اور سستی کی وجہ سے جمعہ چھوڑ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دل پر مہر لگادیتے ہیں۔

نمازِ جمعہ کی فرضیت کی حتمی تاریخ نہیں ملتی، لیکن اتنی بات طے ہے کہ جمعہ کی نماز مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے فرض ہوئی، لیکن کفار کی ایذا رسانیوں سے جمعہ قائم کرنے کا موقع نہیں ملا، سفر ہجرت میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب بنی سالم بن عوف میں پہونچے، تو جمعہ کا وقت ہوگیا، اور آپؐ نے وہیں پہلی مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھائی۔

جمعہ کی نماز ہر عاقل، بالغ، مقیم، آزاد مسلمان پر فرض ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے آواز دی جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ جمعہ کے لئے نکلنا ہر مسلمان بالغ پر واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نماز جمعہ اخلاص کے ساتھ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

سورۂ جمعہ: خصوصیات اور پیغام

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصّلاة والسّلام علی سیّد الأنبیاء وإمام المرسلین محمد وعلی آله و صحبه أجمعین، أما بعد: فقد قال الله تعالی: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ، فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ، وَذَرُوا الْبَيْعَ، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ." (الجمعة: ۹)

سورۂ جمعہ مدنی سورت:

حضرات! یہ آیت سورۂ جمعہ کی ہے، اور سورۂ جمعہ قرآن کریم کے اٹھائیسویں پارے میں ہے، اس سورت میں خصوصیت کے ساتھ جمعہ کے دن، جمعہ کی نماز، جمعہ کی اذان کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ مدنی سورت ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہودیوں کو مخاطب کیا گیا ہے، کیونکہ یہود مدینہ میں تھے نہ کہ مکہ میں۔

پوری سورت گیارہ آیتوں پر مشتمل ہے، اور اس میں دو رکوع ہیں، صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوھریرۃؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

سورت کے مرکزی مضامین:

اس سورت میں چار باتیں بنیادی طور پر ذکر کی گئی ہیں:

۱۔ اس سورت کی پہلی آیت میں اللہ تعالی کی تسبیح وتعریف کا تذکرہ ہے۔

۲۔ دوسری آیت میں رسول اکرم ﷺ کے منصب، مرتبہ اور ان کی ذمہ داریوں کا

تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں چند امور اہم ہیں:

☆ محمد رسول اللہ ﷺ عام انسان کی طرح اگرچہ رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالی کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ کا کام قرآن کی تلاوت کرنا، دلوں اور دماغوں کو کفر وشرک سے، گناہوں سے اور برے اخلاق سے دور رکھنا، قرآن کے مضامین سے لوگوں کو آگاہ کرنا اور روز وشب کے صحیح معمولات سے واقف کرانا ہے۔

☆ آپ ﷺ کی نبوت صرف عرب کے لئے نہیں، بلکہ عجم کے لئے بھی ہے، اور قیامت تک آنے والے تمام افراد آپ ﷺ کے امتی ہیں۔

حضرات!

۳۔ تیسری بات اس سورت میں یہ بتائی گئی ہے کہ یہودی جو انبیاء کی اولاد ہیں، ان کو تورات دی گئی، لیکن انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا، تو ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر بوجھ لاد دیا جائے، گویا دوسرے الفاظ میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر وہ قرآن اور نبی پاک ﷺ کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے ہیں تو وہ گدھے کی طرح ہیں۔

یہودی اس پندار اور خودی میں تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں، ابھی بھی ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کو خدا کے یہاں خصوصی درجہ حاصل ہے، قرآن کریم نے چیلنج کیا کہ اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو موت کی تمنا کرو، اور مر کر وہ درجہ حاصل کرلو، لیکن صورت حال یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ موت سے ڈرتے ہیں۔

۴۔ چوتھی بات اس سورت میں جمعہ کے دن، نماز اور اذان سے متعلق ہے، اور آخری تین آیتوں پر مشتمل پورا ایک رکوع ہے، جمعہ کو جمعہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار جمعہ کی نماز ہجرت کے موقع پر بنوسالم بن عوف میں ادا فرمائی۔

آیات جمعہ اور ان سے مستنبط مسائل:

امام قرطبیؒ نے سورۂ جمعہ کی ان آخری تین آیتوں کے اتارے جانے کا سبب یہ ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں قحط پڑا، بازاروں میں قیمتیں بہت بڑھ گئیں، اسی حال میں جمعہ کے لئے صحابہ کرامؓ اکٹھا تھے، رسول اللہ ﷺ جمعہ کے لئے کھڑے ہو چکے تھے، اسی درمیان ایک تجارتی قافلہ آیا، جس کے پاس ڈھیر ساری غذائی چیزیں تھیں، اس وقت تک جمعہ کے آداب مسلمانوں کے سامنے نہیں آئے تھے، اور خطبہ کے وقت خرید وفروخت کی ممانعت بھی نہیں آئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ نماز میں اِدھر اُدھر جانے اور دیکھنے کی ممانعت ہے نہ کہ خطبہ میں، اس لئے ضرورت کے تحت چند افراد کو چھوڑ کر سب سامان خریدنے کے لئے چلے گئے (الجامع لأحکام القرآن ج:۱۸/ ۹۷)

اس تناظر میں یہ آیتیں نازل ہوئیں، جن میں جمعہ کے آداب واحکام بتائے گئے:

☆ مسلمانو! جمعہ کی نماز تم پر فرض عین ہے۔

☆ جمعہ کے دن اذان کے ساتھ مسجد کے لئے نکلنا واجب ہے، یعنی عام نمازوں میں تو اقامت سے پہلے پہونچ جانا کافی ہے، لیکن جمعہ میں خطبہ کی اذان سے پہلے پہونچنا واجب ہے، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں صرف ایک ہی اذان ہوتی تھی، اور وہ خطبہ کی، منبر مسجد کے پاس، اور مدینہ کی آبادی مختصر تھی، اس لئے یہ کافی تھی، لیکن جب آبادی کا پھیلاؤ ہوا، تو حضرت عثمان غنیؓ نے خطبہ کی اذان کے علاوہ اطلاع عام کے لئے اذان کا اضافہ کیا، اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہوا، اس لئے ہر حال میں خطبہ کی اذان سے پہلے مسجد آنا ضروری ہے۔

☆ نماز ادا کرنے کے بعد زمین میں پھیل جانے اور روزی تلاش کرنے کا حکم ہے، اس میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو معاش کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے، عبادت کے

وقت عبادت، اور دوسرے اوقات میں دوسرے کام، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ (حلال روزی کمانا فرض نماز کے بعد سب سے بڑا فریضہ ہے) (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر:۹۹۹۳)

☆ روزی کمانے کے ساتھ ذکر کا بھی حکم ہے، ذکر کا تعلق زبان سے بھی ہے، دل سے بھی اور عمل سے بھی، زبان سے ذکر یہ ہے کہ آدمی جہاں اور جس حال میں رہے، اگر اس وقت اللہ کا نام لینا خلاف ادب نہ ہو تو زبان کو اللہ کے نام سے تر رکھے، دل سے ذکر یہ ہے کہ اللہ کی یاد دل میں بسی رہے، اور عمل سے ذکر یہ ہے کہ اللہ کے احکام کے مطابق کام کیا جائے۔

حضرات! خلاصہ یہ کہ سورۂ جمعہ چار مرکزی باتوں پر مشتمل ہے: اللہ کی تعریف وتسبیح، رسول اللہ ﷺ کے مرتبہ اور ان کی ذمہ داریوں کا تذکرہ، یہودیوں کے احکام الٰہی پر عمل نہ کرنے کی مثال اور جمعہ کے آداب واحکام۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے علامہ سید سلیمان ندویؒ کو کہ وہ اس سورت سے متعلق ایک عجیب قرآنی نکتہ ارشاد فرما گئے: یہ چاروں باتیں جمعہ کے خطبہ میں آنی چاہئے، اور خطبہ جمعہ انہیں امور پر مشتمل ہونا چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

نماز ایک جامع عبادت

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء، وإمام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد : فقد قال الله تعالى : إن الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنكر ، ولذكر الله أكبر ، والله يعلم ما تصنعون (العنكبوت : ٤٣) بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی رہتی ہے، اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے، اور اللہ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے۔

حضرات! اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبادات کا جو جامع نظام اور سسٹم عطا فرمایا ہے، ان میں نماز کو بڑی اہمیت حاصل ہے، انسان چونکہ اللہ کا بندہ ہے، اس لئے بندگی کا سب سے بہترین مظہر نماز ہے، اور قیامت کے دن سب سے پہلے نماز ہی کا سوال ہوگا، اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ اگر کسی بندے کو دیکھو کہ وہ نماز کا پابند ہے تو اس کے ایمان کی گواہی دو، اور جس کا دل مسجد سے اٹکا رہتا ہے تو وہ قیامت کے دن عرش کے سائے میں ہوگا، جس روز اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو وہ نماز کا رخ کرتے تھے، نماز ہی آپ ﷺ کے لئے سہارا اور آسرا تھی، اور آپ کے دلوں کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں تھی۔

حضرات! قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اقامت صلاۃ کا تذکرہ سو سے زائد مقام پر کیا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو نماز کا حکم دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے کہ انہوں نے دعا کہ ربنا ليقيموا الصلاة (ابراہیم:۳۷) اے اللہ! میں نے ان کو غیر آباد وادی میں ٹھہرایا ہے

تا کہ وہ نماز قائم کریں)، حضرت اسماعیل کے تذکرہ میں ہے کہ وکان یأمر أهله بالصلاة والزكاة (مریم:۵۵) (وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکاۃ کا حکم دیتے تھے)، حضرت لوط، حضرت اسحاق، اور حضرت یعقوب کے تذکرہ میں آیا ہے: وأوحينا اليهم فعل الخيرات وإقام الصلاة وإيتاء الزكاة (الأنبياء:۷۳) (ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکاۃ دینے کی ہدایت کی)، حضرت موسی علیہ السلام کو اللہ حکم دیا: وأقم الصلاة لذكرى (طہ:۱۴) (میری یاد کے لئے نماز قائم کیجئے)، حضرت زکریا کے بارے میں آیا ہے کہ وهو قائم يصلي في المحراب (آل عمران:۳۹) (وہ محراب میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے)، حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے کہ قوم نے انہیں طعنہ دیتے ہوئے کہا: يا شعيب أصلوتك تأمرك أن نترك ما يعبد آباؤنا (هود:۸۷) (کیا تمہاری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے)، حضرت عیسی علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے: وأوصاني بالصلاة والزكاة ما دمت حيا (مریم:۳۱) (اللہ نے مجھے نماز اور زکاۃ کی پابندی کا حکم دیا، جب تک میں زندہ رہوں) اور حضور اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا: واعبد ربك حتى يأتيك اليقين (الحجر:۹۹) اور موت تک آپ اللہ کی عبادت کرتے رہئے۔ اور متقیوں کے متعلق فرمایا: الذين يقيمون الصلاة، و مما رزقناهم ينفقون (جو نماز قائم کرتے ہیں، اور ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں) (البقرة:۳)

حضرات! غرض نماز ایک ایسا فریضہ ہے، جو کسی نبی، ولی، قطب اور ابدال سے معاف نہیں ہے، اسی کے ساتھ ہر بالغ مسلمان مرد وعورت، امیر وغریب، چھوٹے یا بڑے، مسافر یا مقیم، بیمار اور صحت مند ہر ایک پر فرض ہے، اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر نماز پڑھے، اور اگر بیٹھنا دشوار ہو تو لیٹ کر پڑھے، اور اگر رکوع وسجدہ نہیں کر سکتا تو

اشاروں سے پڑھے، غرض کسی حال میں مسلمان اس فریضہ سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ نماز کا چھوڑنا انسان کو کفر تک پہونچا دیتا ہے، اس لئے نماز کا ہر حال میں اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ انتقال سے پہلے جو آخری وصیت فرمائی، اس میں یہی تھا کہ الصلاة، الصلاة، وما ملكت أيمانكم (نماز کی پابندی کرنا، اور اپنے ماتحتوں کا خیال رکھنا) (سنن ابی داود)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک آرڈیننس جاری فرمایا تھا: إن أهم أموركم عندي الصلاة، من حفظها وحافظ عليها حفظ دينه، و من ضيعها فهو لما سواها أضيع (موطا امام مالک) (میرے نزدیک تمام کاموں میں اہم کام نماز ہے، جس نے نماز کی کما حقہ حفاظت کی اس نے اپنے پورے دین کی حفاظت کی، اور جس نے نماز کو ضائع کیا، تو وہ دین کے دوسرے کاموں کو اور زیادہ برباد کرے گا)۔

حضرات! نماز کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک رسمی، سطحی، اور دکھاوے کی نماز ہوتی ہے، اس میں صرف مظاہرہ ہوتا ہے، خانہ پری ہوتی ہے، وہ نماز منافقین کی نماز ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: وإذا قاموا الى الصلاة قاموا كسالى يراؤن الناس، ولا يذكرون الله إلا قليلا (النساء:۱۴۲) (جب وہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو بہت کاہلی سے، محض لوگوں کو دکھانے کے لئے اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں)، سورۂ ماعون میں ہے: فويل للمصلين الذين هم عن صلاتهم ساهون (بڑی خرابی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، یہ نماز انسان کے منہ پر ماردی جاتی ہے، ، دوسری طرف وہ نماز ہے جو ایمانی اور قرآنی اور ربانی ہے، اس کا تذکرہ سورہ مؤمنون میں ہے: قد أفلح المؤمنون الذين هم في صلاتهم خاشعون (المؤمنون: ۱-۲) (وہ ایمان والے کامیاب ہوگئے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں)، یہی وہ نماز ہے جو انسان کے لئے نور اور روشنی کا ذریعہ ہے اور قیامت کے دن حجت ودلیل ہے، اور

اسی نماز سے انسان برائیوں اور بے حیائیوں سے دور رہتا ہے، اسی نماز سے دل کو سکون اور اطمینان ملتا ہے، یہی وہ نماز ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ نماز کی مثال ایک جاری نہر کی سی ہے، جس میں انسان غوطہ لگاتا ہے تو پاک وصاف ہو جاتا ہے، صحیح مسلم کی روایت ہے، حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رات میں اپ ﷺ کے لئے وضو کا پانی اور دیگر چیزیں لایا کرتا تھا، تو ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: مانگو کیا مانگتے ہو، میں نے کہا: أسأل مرافقتك في الجنة (میں جنت میں آپ کی معیت کا طالب ہوں) تو آپ نے فرمایا: فأعني على نفسك بكثرة السجود (تو نماز پڑھ کر اپنے بارے میں میری مدد کرو)

حضرات! نماز تو ایک فریضہ ہے، جس کا ادا کرنا ضروری ہے، لیکن اسی کے ساتھ نماز ایک پیمانہ ہے، جس سے زندگی کا نظام صحیح ہوتا ہے، جس کی زندگی صفت صلاۃ پر آجائے یعنی نماز کی ترتیب پر آجائے تو اس کی نماز حقیقی نماز ہوگی، نماز کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وقت کی پابندی کا سبق ملتا ہے، جو جس قدر اہتمام سے نماز پڑھے گا ہو اپنی پوری زندگی میں پابند، باسلیقہ، اور منظّم ہوگا، اس کا وقت رائیگاں نہیں جائے گا، نماز کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اجتماعیت اور اتحاد کا پیغام ملتا ہے، اختلافات کو بھلا کر ایک لڑی میں پرونے کا درس ملتا ہے، اطاعت وفرمانبرداری کا درس ملتا ہے کہ ایک امام کی انسان اقتدا کرتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اللہ کے لئے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

نماز میں خشوع وخضوع

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد: فقد قال الله تعالى:

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، اَلَّذِيْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ." (المؤمنون: ۱-۲)

(یقیناً وہ مومنین فلاح پا گئے، جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں)

حضرات! انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، ان نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہمہ وقت اور ہر دم اللہ کی یاد میں مشغول رہتا، لیکن چونکہ اس کو خلافت کا منصب دیا گیا، جس میں کاموں کا تنوع ہے، اس لئے ہمہ وقت ایک ہی کام میں مشغول نہ کر کے متعین وقت میں ایک طرز عبادت اور نظام عبادت دیا گیا ہے، اور وہ طرزِ عبادت نماز ہے۔

نماز دین کا اہم ستون، جنت کی کنجی، بیماریوں سے شفا، گناہوں کا کفارہ اور مومن کی معراج ہے۔ جس طرح دن میں جسم کو کئی بار خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، اِسی طرح روح کو بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ خوراک نماز ہے۔ دن ورات میں بار بار نمازوں کی ترتیب کا راز بھی یہی ہے کہ نفس انسانی کو غذا ملے، اور ماسویٰ اللہ سے غفلت اور قلب وروح پر مادیت سے بچاؤ کا پورا انتظام ہو۔

حضرات! نماز ایک ایسا فریضہ ہے، جو کبھی کسی سے ساقط نہیں ہوتا، بیماری ہو تب بھی نماز پڑھنا ہے، جنگ وجدال کی حالت میں بھی نماز پڑھنا ہے، کسی ولی اور بزرگ سے کسی حال میں نماز معاف نہیں، قرآن کریم میں ہے کہ: "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" (موت تک اللہ کی عبادت کرنی ہے) (الحجر: ۹۹)

حضرات! ہر عبادت کے دو رخ ہوتے ہیں: ایک ظاہر اور دوسرے باطن، اسی طرح نماز بھی ہے، قیام، رکوع، سجود، قعود وغیرہ نماز کے ظاہری پہلو ہیں، اگر اِن میں سے

کوئی چھوٹ جائے تو نماز نہیں ہوگی،.اور اگر واجبات میں سے کوئی فوت ہو جائے تو سجدہ سہو کئے بغیر نماز باطل ہو جائے گی۔

اسی طرح نماز کا معاملہ ہے، نماز کا اندرونی پہلو خشوع وخضوع ہے، یہی نماز کی روح ہے، اِس کے بغیر نماز بے اثر اور بے اجر ہے، جمہور علماء کے نزدیک فرضیت تو ساقط ہو جاتی ہے، لیکن ثواب نہیں ملے گا، امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ اِس روح سے خالی نماز باطل ہوگی۔

حضرات! خشوع وخضوع دو لفظ استعمال ہوتے ہیں: خشوع کے معنی پست ہونا، عاجزی کا اظہار کرنا، "وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا." (طـه: ۱۰۸) (اور قیامت کے دن تمام آوازیں پست ہو جائیں گی، اور تم کانا پھونسی ہی سنو گے)، اور خضوع کے معنی ماتحت ہونا اور تابع ہونا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ خشوع کی جگہ دل ہے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ نماز میں داڑھی سے کھیلتے دیکھا تو ارشاد فرمایا: "لَوْ خَشَعَ قَلْبُ هَذَا لَخَشَعَتْ جَوَارِحُهُ" (اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء وجوارح بھی پرسکون ہوتے) (مصنف ابن أبي شيبة، كتاب الصلاة، باب في مس اللحية في الصلاة: ۶۸۵۴)

امام اوزاعیؒ سے پوچھا گیا کہ نماز میں خشوع کیا ہے؟ فرمایا: نگاہ کا جھکانا، عاجزی سے پہلو بچھانا، اور دل کا غمزدہ ہونا.. خشوع کے ساتھ جو نماز ادا کی جاتی ہے اس سے لذت حاصل ہوتی ہے: "وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ، وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ عَلَى الْخَاشِعِيْنَ." (البقرة: ۴۵) (اور مدد لو صبر اور نماز سے، بے شک وہ گراں ضرور ہے، مگر خشوع رکھنے والوں پر نہیں)

اسی تناظر میں قرآن میں آیا ہے: "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ." (المؤمنون: ۱-۲)

حضرات!

خشوع وخضوع کو نقصان پہنچانے والی چیز یہ ہیں:

۱۔ نماز میں کنکھیوں سے دائیں بائیں دیکھنا۔
۲۔ کپڑوں اور داڑھی سے کھیلنا۔
۳۔ پھول بوٹے والا خوبصورت لباس پہن کر نماز پڑھنا۔
۴۔ جلدی جلدی نماز پڑھنا۔

حضرات!

خشوع وخضوع کیسے پیدا ہوگا؟

۱۔ اس استحضار سے کہ اللہ دیکھ رہا ہے،
أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ.
۲۔ پختہ عقیدہ اپنے اندر پیدا کرنے سے۔
۳۔ نماز کی ادائیگی میں جنت اور جہنم کا تصور سامنے ہو۔
۴۔ نماز میں پڑھی جانے والی سورتوں، اذکار پر غور کرنا۔
۵۔ زندگی کی آخری نماز سمجھ کر نماز پڑھنا۔

اللہ تعالیٰ ہم کو خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

مساجد ایمانی زندگی کے مراکز ہیں

الحمد للّٰہ ربّ العالمین ، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعہم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم: "وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُواْ مَعَ اللّٰہِ اَحَداً (سورۂ جن : ۱۸) (اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے: مسجدیں اللہ ہی کے لئے ہیں، تو اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو)

حضرات! روئے زمین پر پائی جانے والی تمام مسجدیں اللہ کا گھر ہیں، وہ ایمانی زندگی اور اسلامی معاشرہ کے مراکز ہیں، جہاں اللہ کے حضور میں سر جھکائے جاتے ہیں، اور بندگی کا اظہار کیا جاتا ہے، مسجدیں اللہ کی خاص علامتیں اور یادگاری مقامات ہیں، جہاں ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی رحمت برستی رہتی ہے: وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَإِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (جو بھی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا تو اس کا تعلق دلوں کے تقوی سے ہے) (الحج:۳۲)

حضرات! امت محمدیہ کو اللہ تعالی نے جو امتیازات عطا فرمائے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ روئے زمین کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ اس کے لئے سجدہ گاہ بنا دیا گیا ہے، جہاں کہیں بھی پاک جگہ ہو وہاں انسان نماز پڑھ سکتا ہے، جب کہ سابقہ امتوں کو صرف اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کا حکم تھا، باہر وہ اپنی عبادت نہیں کرسکتی تھی، لیکن امت محمدیہ کے ساتھ اللہ تعالی کا یہ انعام ہے کہ ساری زمین تیمّم کے لائق اور نماز پڑھنے کا لائق ہے: جُعِلَتْ لِیَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَطَھُوْراً (بخاری ومسلم)، اس لئے مسجدیں جہاں نمازیں ادا کی جاتی ہیں وہ مبارک ،مقدس اور متبرک حصہ زمین ہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک مرتبہ مسجد بن گئی وہ قیامت تک مسجد رہے گی، اس کو نہ منتقل کیا جاسکتا ہے، اور نہ بدلا جاسکتا ہے، مسجدوں کے بارے میں صحیح

مسلم کی مشہور حدیث ہے: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ جگہیں مسجدیں ہیں اور اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ جگہیں بازار ہیں (حدیث:۶۷۱)

حضرات! جب مسجدیں اللہ کے پسندیدہ مقامات ہیں تو ان کو بنانا، تعمیر کرنا، آباد کرنا کس قدر ثواب اور اجر کا کام ہوگا، مسجد کی تعمیر کا کام ہر کس و ناکس کا نہیں، بلکہ اسی کا ہے جس کو اللہ تعالی اس کام کے لئے چنے، جس کا ایمان اللہ پر مضبوط ہوگا، اور آخرت کو دل سے مانے گا، اور نماز کو قائم کرنے والا ہوگا، اور زکاۃ دینے والا ہوگا، اور اللہ ہی سے ڈرنے والا ہوگا، وہ مسجدوں کو آباد کرے گا: "اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَاَقَامَ الصَّلَاۃَ وَآتَی الزَّکَاۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ، فَعَسیٰ اُولٰئِکَ اَنْ یَکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ." (التوبہ :۱۸) مسجدوں کی تعمیر کے ثواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحیح بخاری کی یہ حدیث سنئے: جس نے اللہ کی رضا کے لئے مسجد بنائی اللہ تعالی جنت میں اس کے لئے گھر تعمیر کریں گے، ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ جس نے پرندہ کے گھونسلے کے برابر بھی تعمیر مسجد میں حصہ لیا تو اللہ تعالی جنت میں اس کے لئے گھر تعمیر کریں گے، مسجد کی تعمیر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس کو ظاہری طور پر بنانا، اس کی عمارت تیار کرنا، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کو نمازوں سے، عبادتوں سے، تلاوتوں سے، درس وتدریس سے آباد کرنا، ترمذی کی روایت ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جب تم جنت کے باغوں سے گذرو تو ان کے پھل کھالیا کرو، صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ فرمایا: مسجدیں، پھر صحابۂ کرامؓ نے سوال کیا کہ پھل کھانے سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عبادت کرنا اور ذکر واذکار میں مشغول ہونا۔

حضرات! دنیا کی سب سے پہلی مسجد بیت اللہ اور کعبہ مقدسہ ہے، اس کے بعد تمام مسجدیں ہیں، اور کعبہ کا پیغام اللہ کو ایک ماننا اور اسی سے وابستہ ہونا اور اسی پر بھروسہ کرنا ہے، چنانچہ تمام مساجد کا پیغام توحید ہوا، اس لئے مسجدیں ایمان تقسیم کئے جانے کے مقامات ہیں،

اگر کوئی شخص ہے جس کا مسجدوں سے گہرا تعلق ہے، تو اس کا ایمان مضبوط ہوگا، سنن ترمذی میں آیا ہے کہ اگر کسی شخص کو مسجد آتے جاتے ہوئے دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو(۲۶۱۷)اور ایسا ہی شخص قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا، اور اللہ کا منظور نظر ہوگا، مسجدیں اجتماعیت، اتحاد اور اخوت ومساوات کے مراکز ہیں، اور پنجوقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کرنے اور جمعہ کی نماز بڑی مسجدیں میں ادا کرنے کا راز یہی ہے کہ معاشرہ میں اتحاد کا پیغام جائے ، باہمی الفت ومحبت کی فضا عام کی جائے۔

حضرات! مسجدوں کے آداب اور اصول ہیں، ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

(۱)مسجد میں داخل ہوں تو داہنا پیر داخل کریں اور داخل ہونے کی دعا پڑھیں، داخل ہوتے ہی اعتکاف کی نیت کرلیں، اس سے اعتکاف کا ثواب ملے گا، داخل ہونے کے بعد، وقت میں گنجائش ہو اور مکروہ وقت نہ ہو تو تحیۃ المسجد پڑھ لیں، بدبودار چیز کھا کر مسجد نہ آئیں، مسجدوں میں اگلی صف میں بیٹھنا بڑی فضیلت کی بات ہے، لیکن گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنا جائز نہیں، مسجد میں نمازیوں کے سامنے سے گذرنے سے احتراز کریں، مسجد میں بلاضرورت باتیں نہ کریں۔

حضرات! آج معاشرہ میں مساجد کی کمی نہیں، محلّہ محلّہ میں مسجدیں ہیں، ماشاءاللہ بڑی حد تک ان میں نماز پڑھنے والے ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ایمانی روح کے ساتھ مسجدوں سے اپنے تعلق کو مضبوط کیا جائے، ہر محلّہ اور ہر علاقہ کے لئے مسجد پاور ہاؤس کی شکل اختیار کرلے، جہاں سے لوگ مربوط ہو کر صحیح معنوں میں اسلامی زندگی گذارنے کے عادی ہوجائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

ایمان وعمل صالح

ایمان بالآخرۃ

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً، وَاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ." (المؤمنون: ۱۱۵) (کیاتمہارا خیال تھا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بلا مقصد پیدا کردیا ہے،اورتم ہمارے پاس لوٹا کر لائے نہ جاؤ گے)

حضرات! قرآن کریم جن حقیقتوں کو ماننے ،قبول کرنے اوران پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت دیتا ہے،اوران کوزندگی کی بنیاد بنانے پر اصرار کرتا ہے،اُن میں خدا پر ایمان لانے کے بعد آخرت کا مسئلہ ہے۔یعنی قرآن کہتا ہے کہ جس طرح اپنے سر کی آنکھوں سے خدا کو نہ دیکھنے اور رب کی آواز کو کانوں سے نہ سننے کے باوجود تمہارے نزدیک خدا کی ہستی ہے، اوراس کا ہونا ایک حقیقت ہے،اسی طرح دنیوی زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے، جو عارضی اورفانی نہیں ہے، بلکہ دائمی ہے،اوراس میں دنیوی اعمال کی جزا اورسزا دی جائے گی۔

حضرات! آخرت کا عقیدہ کیوں ضروری ہے؟اس کا جواب یہ ہے:

۱۔دنیا میں انسان یوں ہی نہیں پیدا ہوا ہے، بلکہ بامقصد پیدا ہوا ہے،اگر آخرت کا عقیدہ درست نہ ہوتو اس مقصد کا کیا حاصل؟اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً، وَاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ." (المؤمنون: ۱۱۵) (کیاتمہارا خیال تھا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بلامقصد پیدا کردیا ہے،اورتم ہمارے پاس لوٹا کر لائے نہ جاؤ گے)۔

۲۔دنیا میں برائی اور بھلائی موجود ہیں،اللہ کی صفت عدل کا تقاضا ہے کہ اس کی جزاء اورسزا دے،چنانچہ آخرت کا عقیدہ ضروری ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ

ذَرَّةٍ خَيْراً يَّرَهُ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ." (الزلزال: ۷-۸) (جو کوئی ذرہ بھر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس کسی نے ذرہ بھر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا)

حضرات ! آخرت کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک موت سے لے کر قیامت تک، دوسرے قیامت سے لے کر ہمیشہ ہمیش۔ ایمان بالآخرۃ ایک تخم کی طرح ہے، جب دل کی زمین پر پڑ جاتا ہے، اور زمین اس کو قبول کر لیتی ہے، تو اس سے ایک سرسبز پودا ظاہر ہوتا ہے، آخرت پر یقین رکھنے والی زندگی اس سے مختلف ہوتی ہے، اس کے اندر تکبر، ذاتی بلندی اور زمین میں فتنہ وفساد کا عنصر نہیں ہوتا ہے، اور وہ کہتا ہے: "رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ" (الأحقاف: ۱۵) (اے میرے پروردگار! مجھے اس پر مداومت دے کہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ کو اور میرے والدین کو عطا کی ہے)۔ آخرت پر ایمان رکھنے والا حضرت ماعز اور حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہما کی طرح گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ مدائن کی فتح کے موقع پر کسریٰ کے تاج کو بیت المال میں جمع کرنے والے کی طرح خوفِ خدا کا حامل ہوتا ہے۔

حضرات ! انکارِ آخرت کا عقیدہ دنیاوی زندگی سے استفادہ کا ایک جنون پیدا کرتا ہے، ہر جگہ سے یہ صدا آتی ہے کہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست، اور قرآن کی زبان میں: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ. (محمد: ۱۲) (اور جو کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں، اور کھا پی رہے ہیں، جس طرح چوپائے کھاتے پیتے رہتے ہیں، اور جہنم ہی ان کا ٹھکانہ ہے)

دنیا کی چیزیں اس کی نظر میں پُرفریب بن جاتی ہیں، سنجیدگی سے کم، لہو ولعب سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، نیز تکبر اس شخصیت کا وطیرہ بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں آخرت کے عقیدہ کو بسا دیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

فرشتے اور ان کا فرضِ منصبی

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالىٰ: "اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلاً وَّمِنَ النَّاسِ، إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ. (الحج: ۷۵)
(اللہ چن لیتا ہے پیام پہونچانے والے فرشتوں میں سے اور آدمیوں میں سے بھی، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے)

حضرات! ہمارا عقیدہ اور ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں، ان میں کچھ نظر آتی ہیں اور کچھ نظر نہیں آتی ہیں، نظر نہ آنے والی مخلوقات میں جنات ہیں، جنات کو اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا ہے، اور ان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے، وہ اللہ کے احکامات کے مکلّف ہیں، لیکن ایک دوسری مخلوق جو نظر نہیں آتی ہے، اور وہ نورانی اور روحانی ہے، فرشتہ کے نام سے متعارف ہے، فرشتہ کے معنی قاصد اور پیغام رساں کے ہیں۔ عربی میں ان کو ملک اور ملائکہ کہتے ہیں، یہ اَلوکۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی پیغام رسانی کے ہیں۔

حضرات! قرآن کریم میں فرشتوں کی بے شمار صفات کا تذکرہ ہے، ایک جگہ آیا ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَداً، سُبْحَانَهٗ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ، وَهُمْ بِأَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (سورۃ الأنبیاء: ۲۶-۲۷) (مشرک کہتے ہیں کہ رحمٰن اولاد والا ہے، اس کی ذات پاک ہے، بلکہ وہ سب اس کے معزز بندے ہیں، کسی بات میں اللہ پر سبقت نہیں لے جاتے ہیں، بلکہ اس کے فرمان پر کاربند ہیں)، سورۂ تحریم (آیت: ۶) میں ہے: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ، وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (انہیں

اللہ تعالی جو حکم دیتا ہے، وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے، بلکہ انھیں جو حکم دیا جائے اسے بجا لاتے ہیں) فرشتے خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں، لوگوں کے لئے بشارت بن کر اترتے ہیں، انسانوں کے اعمال کی نگہبانی کرتے ہیں، قبروں میں محاسبہ کرنے آتے ہیں، جنت اور دوزخ کی ذمہ داری بھی ملائکہ کے ذمے ہے۔

حضرات! فرشتوں کی تاریخ صدیوں پرانی ہے: انبیاء علیہم السلام کی تمام سیرتیں فرشتوں کی آمد، ان کی بشارت اور نصرت سے معمور ہیں، تورات، انجیل اور قرآن ان کے کارناموں کے شاہد ہیں، اللہ نے ان کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان خانہ میں بھیجے گئے، حضرت لوط علیہ السلام کی حفاظت اوران کی قوم کی بربادی پر مامور ہوئے، حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کو بشارت انہوں نے دی۔ آں حضرت ﷺ کی حفاظت ومختلف فرائض پر مامور ہوئے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں ان کا وجود ہے، یونانی فلسفے میں ان کو عقولِ عشرہ کہا جاتا ہے۔ یہودی اور عیسائی ان کو کروبیم کہتے ہیں، جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں، ہندوؤں میں دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں، صابی مذہب میں ستاروں اور سیاروں کی صورت میں ان کو تسلیم کیا گیا، غرض یہ روحانی وسائط ہیں، جو صانع ومصنوعات اور خالق ومخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں، ویسے قرآن کریم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام اور حضرت میکائیل کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل کو دو بار ان کی اصلی حالت میں دیکھا۔

حضرات! یہاں مجھے فرشتوں کی تاریخ بیان نہیں کرنی ہے، بلکہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں ایک طرف اللہ نے ساری کائنات کو انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے، وہیں دوسری طرف فرشتوں کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے، وہ ان کے لیے رحمت ومغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں: "ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلَائِکَتُہُ لِیُخْرِجَکُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ

وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْماً" (وہ ایسا ہے کہ وہ خود اور اس کے فرشتے بھی تمہارے اوپر رحمت بھیجتے رہتے ہیں، تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئے، اور مؤمنین کے حق میں تو رحیم ہے ہی) (الأحزاب:۴۳) اور صحیح بخاری ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں، تو جبرئیل کو پکار کر کہتا ہے کہ اللہ نے فلاں بندے سے محبت کرلی، تم بھی محبوب کرو، پھر جبرئیل پورے آسمان والوں میں اعلان کرتے اور آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں یہ آواز لگائی جاتی ہے، اور اس شخص کے لیے مقبولیت لکھ دی جاتی ہے۔

حضرات! قرآنی آیات اور احادیث گواہ ہیں:

(۱) جو حضرات اللہ کے حضور توبہ کرتے ہیں، فرشتے ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

(۲) لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والوں کے لیے فرشتے دعا کرتے ہیں۔

(۳) نماز سے فارغ ہو کر انسان ذکر وتسبیح میں رہتا ہے تو فرشتے اس کے لئے دعا کرتے ہیں۔

(۴) پہلی صف والوں پر فرشتے دعا کرتے رہتے ہیں۔

(۵) صفوں میں مل کر کھڑے رہنے والوں کے لیے فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

(۶) درود شریف پڑھنے والوں کے لئے فرشتے دعائیں کرتے ہیں۔

(۷) مریض کی عیادت کرنے والوں کے لئے فرشتے دعائیں کرتے ہیں۔

حضرات! کن لوگوں پر فرشتے اترتے ہوتے ہیں؟

(۱) استقامت اختیار کرنے والوں پر فرشتے اترتے ہیں: "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلَائِکَۃُ أَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا، وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو، اور نہ رنج

کرو، اور خوش ہو جنت کے ملنے پر، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے) (حم السجدة:۳۰)

(۲) نمازِ فجر اور نمازِ عصر باجماعت پڑھنے والے پر فرشتے باری باری آتے ہیں (صحیح بخاری)

(۳) ذکر کرنے والوں پر فرشتے اترتے ہیں: "لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُم الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ." (صحیح مسلم:۲۷۰)

(۴) فرشتے جمعہ کے دن نمازیوں کے نام لکھتے ہیں۔

(۵) تلاوت کرنے والوں پر فرشتے اترتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس نورانی مخلوق کی حفاظت میں ہمیشہ رکھے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

صراطِ مستقیم اور اس کے بنیادی اصول

الحمد للّٰه رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، قال اللّٰه تعالى: أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم، بسم اللّٰه الرحمن الرحيم: "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْماً، فَاتَّبِعُوْهُ، وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ، فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ، ذٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ، لَعَلَّكُم تَتَّقُوْنَ." (الأنعام: ١٥٤)۔ (اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ یہی میری سیدھی شاہ راہ ہے، سو اسی پر چلو، اور دوسری راہوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس سب کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے، تاکہ متقی بن جاؤ)

حضرات! ہم میں ہر شخص سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے، سورۂ فاتحہ قرآن کی پہلی سورت ہے، وہ خلاصۂ قرآن اور شفاء کی سورت ہے، صحیح مسلم میں حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دی ہے، جب بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری تعریف کی، جب بندہ کہتا ہے: الرَّحمٰنِ الرحِيمِ، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: أَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ، میری بندے نے میری تعریف کی، جب بندہ کہتا ہے: مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: مَجَّدَنى رَبِّى میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، جب بندہ کہتا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ میرے بندے اور میرے درمیان مشترک ہے، جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هٰذَا لِعَبْدِيْ وَ لِعَبْدِيْ مَا سَاَلَ (یہ میرے بندہ کے لئے ہے، اور میرے بندے کو وہ ملے گا، جو وہ مجھ سے مانگے گا)۔

حضرات! اس سورت میں صراط مستقیم کی دعا ہے، صراط مستقیم کیا ہے؟ اس میں وضاحت کردی گئی ہے کہ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے، جن پر اللہ تعالی نے انعام کیا، نہ وہ یہود ہیں، نہ نصاری، اب سوال باقی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ تعالی نے انعام کیا ہے، اس کا جواب سورۂ نساء کی اس آیت میں دیا گیا: وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَأُوْلٰئِكَ مع الذينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ، وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقاً (النساء:٦٩) (اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جب پر اللہ نے اپنا خاص انعام کیا ہے، یعنی پیمبر اور اولیاء اور شہداء اور صالحین)

حضرات! اللہ تعالیٰ کا یہ ازل سے نظام رہا ہے کہ ہدایت کے لئے اس نے افراد کا بھی انتظام کیا ہے، اور یہ افراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک لوگوں کی صورت میں ہر زمانے میں رہے ہیں، اور اصول وضوابط کا بھی انتظام کیا ہے، اور یہ اصول آسمانی کتابوں کی شکل میں موجود ہیں، قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تین جگہ بہت واضح انداز میں صراط مستقیم کے اصول بیان کئے ہیں: ایک سورۂ انعام میں، دوسرے سورۂ اسراء میں، تیسرے سورۂ لقمان میں، سورۂ انعام (۱۵۲-۱۵۴) میں آیا ہے کہ: "قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُم...... الخ" کہہ دیجئے آؤ، میں سنادوں تم کو تمہارے رب نے کیا چیزیں حرام کی ہیں: شرک نہ کرنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اولاد کو قتل نہ کرنا، بدکاری کے قریب نہ جانا، ناحق کسی کی جان نہ لینا، ناپ تول کو پورا پورا ادا کرنا، عدل و انصاف کرنا، عہد کو پورا کرنا۔

سورۂ اسراء میں بھی اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو حضرت موسی علیہ السلام کے واسطہ سے یہی ہدایات دی تھیں، لیکن انہوں نے ان ہدایات پر عمل نہیں کیا، تو اللہ تعالی نے ان کو منصب خلافت وامامت سے معزول کردیا، وہ ہدایات سورۂ انعام میں مذکور ہدایات

کے مطابق ہیں۔

اسی مضمون کو سورۂ لقمان میں اللہ تعالی نے حضرت لقمان علیہ السلام کی زبانی بیان کیا ہے، سورۂ فرقان میں عباد الرحمٰن کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں بھی یہی پہلو ہے، سورۂ مومنون میں انہی خوبیوں کا تذکرہ ابتدائی آیات کیا گیا ہے۔

حضرات! یہ تمام اصول صراط مستقیم کے بنیادی دفعات ہیں، جن کی طرف سورۂ فاتحہ میں اشارہ دیا گیا ہے، پانچوں نمازوں میں ہم اللہ تعالی سے یہی دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اسی راستہ پر چلا، لیکن عملاً مخالفت کرتے ہیں، اور صراط مستقیم کے اصول پر عمل نہیں کرتے، جب کہ ہر انسان سے اللہ تعالی نے خواہ عبادات ہوں یا معاملات ان میں کثرت کا مطالبہ نہیں کیا ہے، بلکہ بہتری کا مطالبہ کیا ہے: لِيَبْلُوَكُم أَيُّكُم أَحسَنُ عَمَلاً (تاکہ آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے)، دنیا کا اصول ہے کہ اگر کوئی انسان کسی ملک کی سرحد کو پار کرتا ہے تو اسے شوٹ (Shut) کردیا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اتنے بردبار ہیں کہ ہم صبح وشام اس کے حدود کو پامال کرتے ہیں، لیکن ہم کو وہ موقع دیتے ہیں، آیئے دعا کریں کہ اللہ تعالی ہم کو صراط مستقیم کی نعمت نصیب فرمائے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

امت محمدیہ کی خصوصیات

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد، فقد قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً." (البقرة : ۱۴۳) (اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط (درمیانی امت) بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو، اور رسول تم پر گواہ ہوں)

حضرات! یہ امت اور ملت جس کے ہم اور آپ فرد ہیں، امت محمدیہ کے نام سے جانی جاتی ہے، یہ آنے کے لحاظ سے تو ساری قوموں کے مقابلہ میں بعد میں آئی، لیکن اپنی خصوصیات اور امتیازات کے لحاظ سے تمام امتوں پر فائق ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے گواہی دی ہے: نَحْنُ الآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَومَ القِيَامَةِ (صحیح بخاری:۸۷۶) ہم دنیا میں وجود کے لحاظ سے تو آخری ہیں، مگر جنت میں داخل ہونے کے لحاظ سے یا گواہی کے لحاظ سے قیامت کے دن سبقت لے جانے والے ہیں۔

حضرات! انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالی نے متعدد قومیں برپا کیں، وہ آئیں اور گذر گئیں، قرآن میں ان کے عروج و زوال کی داستان آج بھی ہمارے لئے عبرت و نصیحت کا سامان ہے، لیکن قرآن میں جس قوم کا تذکرہ سب سے زیادہ آیا ہے وہ بنی اسرائیل ہے، یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد، قرآن کریم میں ہے: يَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ، وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (البقرة: ۴۰) (اے اولاد یعقوب! میری جو نعمتیں تم پر ہوئی ہیں، ان کو یاد کرو کہ کیسے کیسے انعامات، عنایات، سلطنت و فوقیت تمہیں دی گئی ہے)، لیکن بنی اسرائیل

نے خدا کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کی، تو اللہ نے انہیں ملعون اور اپنے غضب کا مستحق قرار دیا: "لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا، وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ." (المائدة : ۷۸) (بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان پر لعنت ہوئی داود اور عیسی بن مریم کی زبان سے، یہ اس لئے کہ انہوں نے برابر نافرمانی کی اور حد سے آگے نکل نکل جاتے تھے)

حضرات! قرآن کریم گواہ ہے کہ جتنے انبیاء کرام حضرت یعقوبؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک آئے، وہ سب بنی اسرائیل میں آئے، یہود میں آئے، لیکن اللہ نے ان کی ناشکری کی وجہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا، اور آپ کے ساتھ ایک قوم، ایک امت کو بھیجا، اس کو خیر امت قرار دیا، معتدل امت قرار دیا، اور عالمی نبی کی عالمی امت بنایا، اور اس کو آفاقی پیغام عطا کیا، مکانی لحاظ سے اس امت کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالی نے قبلہ، بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف بدلا، اور اعلان کردیا کہ جس طرح ہم نے قبلہ بدل کر تمہیں مرکزیت عطا کی ہے اسی طرح ہم نے تمام قوموں میں تم کو ایک معتدل قوم اور امت بنایا ہے، تاکہ لوگوں کے لئے نمونہ بنو، اور رسول تمہارے لئے نمونہ ہوں۔

حضرات! امت محمدیہ کے ساتھ اللہ تعالی کی شان کریمی کا ایک مظہر تو یہ ہے کہ شرعی احکام میں اس نے بہت رخصت عنایت فرمائی ہے: پچھلی امتوں میں صرف پانی سے پاکی حاصل کی جاسکتی تھی، دوسری چیزوں سے نہیں، اس امت کو اللہ تعالی نے تیمّم کی نعمت عطا فرمائی کہ انسان بیمار ہو اور پانی کا استعمال نقصان دہ ہو تو نیت کے ساتھ پاک مٹی پر اپنے دونوں ہاتھوں کو مارے، پھر چہرے اور ہاتھوں پر پھیر لے تو پاک ہوجاتا ہے، اور اس سے نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

پچھلی امتوں کو اپنی نمازیں صرف عبادت گاہوں میں ادا کرنی ہوتی تھی، لیکن اس امت کے لئے پورے روئے زمین کی پاک جگہ میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے، پچھلی امتوں میں کپڑے پر نجاست لگ جاتی تھی تو پانی سے دھونا کافی نہیں ہوتا تھا، بلکہ حکم شرعی تھا کہ جس جگہ نجاست لگی ہے اس حصہ کو کاٹ دیا جائے (بخاری، کتاب الصوم) لیکن

اس امت پر اللہ کا انعام ہوا کہ ناپاک کپڑے کو پانی سے دھو لینے پر پاک ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرات! اعتدال و توازن اس امت کی اہم خصوصیت ہے، اس کے لئے قرآن نے وسط کا لفظ استعمال کیا ہے، جو دو کناروں کے بیچ اور درمیان میں ہوتا ہے، دنیا میں جتنی چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں وہ اعتدال وصحیح توازن کے ساتھ ہیں، اس لئے امت مسلمہ سے مطالبہ ہے کہ ہر چیز میں اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھے، عقائد میں اعتدال، عبادات میں اعتدال، اخلاقیات میں اعتدال، معاملات میں اعتدال ہونا چاہیے۔

امت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہترین امت ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگوں کے نفع کے لئے نکالی گئی ہے، اس کا کام اچھی باتوں کی تلقین اور بری باتوں سے روکنا، اگر امت یہ کام کرتی رہے گی تو خیر امت ہے، ورنہ وہ خیر امت نہیں کہلائے گی۔

امت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا عمل تھوڑا، لیکن ثواب بہت زیادہ ہے، ظاہر ہے کہ اس امت کی عمریں مختصر ہیں، اس لئے اس کو بعض راتیں اور دن ایسے دیئے گئے ہیں، جن میں عبادت کر کے یہ مقام حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حضرات! امت محمدیہ کے فضائل میں علمائے امت کی بھی شان نرالی ہے، وہ اللہ کے منظور نظر ہیں، انبیاء کے وارث ہیں، کائنات کی تمام مخلوقات ان کے لئے دعائیں کرتی ہیں، تفسیر ابن کثیر میں حضرت ثعلبہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالی فرمائیں گے، میں نے تمہارے سینوں میں اپنا علم و معرفت اس لئے رکھا تھا تاکہ تمہاری مغفرت کروں۔

اس لئے امت مسلمہ کا ہر فرد اپنی جگہ معجزہ ہے، ہر ایک کو اپنی ذمہ داری پوری تندہی اور نشاط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے، اللہ کے یہاں نجات صرف خصوصیات کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اعمال کی بنیاد ہے، جب یہود و نصاری کی امیدیں، تمنائیں ان کو نہیں بچا سکیں، تو ہم کو بھی ان سے نجات مل نہیں سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر شخص کو صحیح راستہ پر چل کر زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

تقرب الٰہی کیسے حاصل ہو؟

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد، فقد قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ، لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ، لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِى الْآخِرَةِ، لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ." (يونس: ٦٢-٦٣) (سنو، سنو، اللہ کے دوستوں پر قطعاً نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیزگاری اختیار کئے رہے، ان کے لئے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتیں بدلا نہیں کرتیں، یہی بڑی کامیابی ہے)

حضرات! انبیاء کرام جن چیزوں کی اہمیت اور خصوصیت سے دعوت دیتے تھے وہ بنیادی طور پر تین ہیں:

۱۔ عقائد کی تصحیح۔ اس کو علمائے عقائد واصول نے سنبھالا۔

۲۔ عبادات ومعاملات اور حلال وحرام کا بیان، اس کی تفصیل فقہاء نے بیان کی اور پوری امت کی رہنمائی کی۔

۳۔ اخلاص واحسان (ہر کام اللہ کے لئے کرنا، اور اس دھیان سے کرنا کہ میرا معاملہ، مجھے اور میرے عمل کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے) اخلاص واحسان اور دوسرے الفاظ میں ربانیت کا یہ شعبہ سب سے زیادہ دقیق اور گہرا ہے، پورے دینی نظام میں اس کو حیثیت وہی ہے جو جسم انسانی میں روح کی ہوتی ہے، اور الفاظ کے مقابلہ میں معنیٰ کی، اس شعبہ کی ذمہ

داری صوفیاء کرام نے لی ہے، وہ خود راہ یاب تھے، اور دوسروں کی رہنمائی کرتے تھے، وہ خود سیراب تھے، اور دوسروں کو سیراب کرتے تھے، بڑے بانصیب اور انتہائی سعادت مند تھے۔

حضرات! منصب رسالت کے چاروں اصولوں میں ایک اہم اصول تزکیہ ہے، تزکیہ کہتے ہیں: نفس کو شرک، گناہ اور خراب عادتوں سے پاک کرنا، اس کو تزکیہ کا نام دیجئے، یا تصوف کا، احسان کا نام دیجئے یا سلوک کا، بہرحال یہ ایک انسانی ضرورت اور ربانی نظام کا حصہ ہے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں سات قسموں کے بعد فرمایا ہے: "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا." (الشمس:۹۔۱۰) (وہ شخص کامیاب ہوگیا، جس نے نفس کو پاک کیا، اور وہ ناکام ہوا، جس نے اس کو گندہ کیا) قرآن کریم کا یہ بھی بیان ہے: نفس کو پاک کرنے والا جنت میں جائے گا: "وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوَى" (النازعات:۴۰۔۴۱) (جو اپنے رب کے پاس جوابدہی سے ڈرے، اور نفس کو خواہشات سے پاک رکھے تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے)

حضرات! رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ خود پوری زندگی صرف فواحش ومنکرات سے دور ہی نہیں رہے، بلکہ صحابہ کرامؓ کو دور رکھا، ان کے سامنے پہلے برائیوں کی شناعت بیان کی اور نیک کاموں پر ابھارا، جس کا اثر یہ تھا کہ وہ راتوں کے عبادت گذار اور دن کے شہہ سوار تھے، ان کے یہاں وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل بھی تھی اور خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات بھی، وہ شریعت وطریقت دونوں کے جامع تھے۔ سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے:

شریعت طریقت سے مربوط
راہِ مولی میں جانے کی کوشش

حضرات! شریعت وطریقت کے جامع وہ علمائے ربانی اور اولیاء اللہ بھی تھے، جنہوں نے باطنی اوصاف وکیفیات، تقوی وطہارت، اخلاص واحسان اور توکل علی اللہ،

صبر وشکر کو بڑی خوبی کے ساتھ امت کے افراد میں منتقل کیا، ان کی ایک طویل تاریخ ہے، ان کی کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ پوری کی پوری قوم بدل گئی، اس نے توبہ کی، اور اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہوئی، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، صرف حضرت سید احمد شہیدؒ کے دعوتی دوروں کو دیکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ لاکھوں افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اور توبہ کی، کشمیر کے علاقہ میں سید علی ہمدانیؒ کا ذکر آتا ہے، انہوں نے بڑے شہروں، قصبات، اور دیہاتوں کے تین دورے کئے کہ پورا کشمیر بدل گیا، سچ کہا ہے علامہ اقبال نے:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرات! میں نے قرآن کریم کے سورۂ یونس کی آیت بڑھی تھی، اس میں اشارہ کیا گیا ہے: اللہ کے اولیاء کو نہ آئندہ کا ڈر ہوگا اور اور ماضی کا کوئی غم، اسی آیت میں بتادیا گیا کہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے اور ولایت کے درجہ تک پہونچنے کے لئے کسی لمبے چوڑے وظیفہ کی ضرورت نہیں، بلکہ سچے دل سے یقین اور اللہ کے ڈر کو دلوں میں بٹھانے کی ضرورت ہے، یہ دونوں صفات اگر حاصل ہو جائیں تو انسان اللہ کا منظور نظر ہو جاتا ہے، ولی کہلاتا ہے، ربانی کے لقب سے پکارا جاتا ہے، اور پوری کائنات اس کے تابع ہوتی ہے، حدیث پاک میں کہا گیا ہے: انسان فرائض کی وسعت بھر پابندی کرے، اور نوافل کا اہتمام کرے تو اللہ کا مقرب ہو جاتا ہے:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

اس لئے ضرورت ہے کہ انسان بری باتوں سے دور رہے اور اچھی باتوں سے آراستہ ہو، اور اہل اللہ کی صحبت کو لازم پکڑے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیقات سے نوازے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

شریعت کی بالادستی

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ، وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ." (المائدة: ٥٠) (کیا یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اور جو قوم یقین وایمان رکھتی ہے اس کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہوسکتا ہے)

حضرات! اللہ ربّ العزت ہمارے خالق ومالک ہیں، وہ ہماری فطرت، ضروریات اور عادات واطوار سے واقف ہیں، انھوں نے جس طرح سے انسان کے کھانے، لباس وپوشاک کا انتظام کیا ہے، اسی طرح انہوں نے زندگی گزارنے کے لیے ایک نظام زندگی دیا ہے، اس کو ہم شریعت کے نام سے جانتے ہیں: "ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ." (الجاثیۃ: ١٨) (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا، سو آپ اسی پر چلے جایئے، اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے)

حضرات! یہ شریعت انسان کا بنایا ہوا نظام نہیں، بلکہ اللہ کا قانون اور الٰہی نظام ہے، یہ یونان کے فلاسفہ کی طرح صرف نظریہ نہیں، جس کا خواب دیکھا جارہا ہے اور اس کی تعبیر دیکھنے میں نہیں آرہی ہے، اور نہ اشتراکی نظام کی طرح قانون ہے جس کو ستّر سال کی معمولی سی مدت بے نام ونشان کردے، یہ ایک متوازن معتدل، اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ قانون ہے۔ جس نے ایک ہزار سال تک ایشیا، افریقہ اور دنیا کے بڑے حصے پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت خاموشی کے ساتھ ان پر اثر انداز ہوا۔

حضرات! شریعت نے انسانی زندگی کے تینوں میدانوں کو متاثر کیا ہے: جسمانی

یعنی جسم کے تقاضوں کو پورا کیا، معاشرہ کے تقاضوں کو بھی پورا کیا اور روحانی ضروریات کی بھی تکمیل کی، اس کی نمایاں خصوصیات میں یہ خصوصیت ہے کہ یہ اعتقادی شریعت ہے، مشرق ومغرب ہر جگہ کے ماننے والوں کا صرف ایک ہی عقیدہ ہے: "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" اس شریعت کی دوسری خصوصیت اس کا عالمگیر ہونا ہے، یعنی پوری انسانیت کی شریعت ہے: "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً" (سبأ: ٢٨) (اور ہم نے تو آپ کو سارے انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)، ایک خصوصیت یہ بھی ہے وہ روح اور مادہ کی جامعیت کا لحاظ رکھتی ہے، دنیا سے بھی اس کا تعلق ہے اور آخرت سے بھی ہے۔

حضرات! اسلامی شریعت کی خصوصیات میں عدل اور اعتدال ہے، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن وامان کا قیام، اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہیں، کیوں کہ وہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور امور خانہ داری، بچوں کی پرورش عورتوں سے متعلق کی جائے، کیوں کہ وہی ان کاموں کو بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال یہ ہے کہ حقوق وفرائض کی تعیین میں افراط وتفریط نہ ہوجائے، جیسے خواتین کے حقوق کا مسئلہ، نہ ان کو پامال کیا جائے اور نہ ان کو اتنا اونچا بڑھایا جائے کہ جن ذمہ داریوں کے اٹھانے کی سکت ان میں نہیں، ان کو بھی ان سے متعلق کردیا جائے، شریعت اسلامی کا اصل امتیاز یہی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین معاشرتی تقاضوں اور عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط وتفریط سے پاک ہیں۔

حضرات! عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، دنیا بہت ترقی کرچکی ہے، پہلے انسان بیل گاڑی پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش کا سفر کرنے لگا ہے۔ اور سمندروں میں غوطہ لگانے لگا ہے، اس لئے ایسا فرسودہ نظام اس ترقی یافتہ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا، ظاہر ہے کہ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے، اسلام دین فطرت ہے، تو جس طرح پیروں سے چلنا، آنکھوں سے دیکھنا، کانوں سے سننا فطرت ہے، اور ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، اسی طرح اسلامی قانون قانون فطرت ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں: ایک انسان کی فطرت، دوسرے وہ وسائل وذرائع جواس کوگھیرے ہوئے ہیں،غور کیا جائے تو جتنی تبدیلیاں ہیں، یہ سب اسباب سے تعلق رہتی ہے، انسان کی فطرت میں کوئی تبدیلی، پکوان کے طریقے ضرور بدلے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے،لیکن بھوک پیاس جیسے ہوتی تھی ویسے اب بھی ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے نہ کہ اسباب ووسائل، وہ انسان کی فطری خواہشات کوکنٹرول کرتا ہےاوراس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ طاقت کا استعمال ظلم کودور کرنے کے لیے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے۔

حضرات! دنیا کے جتنے قوانین ہیں، سب اسلامی قانون کے خوشہ چیں ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا چارٹر اسلامی قانون کا چربہ ہے، آج کی دنیا کے لیے یہ پیغام ہے کہ جہاں کہیں اسلامی قانون سے اعراض کیا گیا، وہاں لوگ مشکلات ومصائب سے دوچار ہوئے۔

اس لیے اسلامی شریعت رحمت ہے، نہ کہ زحمت، اسلام سراپا رحمت ہے، اورامن وسلامتی ہے، میں نے شروع میں ایک آیت پیش کی تھی: کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اوراللہ سے بڑھ کران کے لئے فیصلہ کرنے والا کون ہوگا؟

سنن ابوداؤد میں ہے کہ مدینہ میں دوقبیلے تھے: بنوقریظہ اور بنونضیر، بنونضیر فضیلت وبرتری میں اپنے کو بڑا سمجھتے تھے، بنوقریظہ کے کسی آدمی نے بنی نضیر کے کسی آدمی کوقتل کیا تو اس کوقصاصاً قتل کیا جاتا تھا، اور بنونضیر کے کسی آدمی نے بنوقریظہ کے کسی آدمی کوقتل کیا تو سو وسق اونٹ دیت تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہود آپ کے پاس قضیہ لے کرآئے، آپ نے عدل وانصاف سے فیصلہ کیا، پھراللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

"اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ، وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ." (المائدة: ٥٠) (کیا یہ لوگ زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اور جوقوم یقین وایمان رکھتی ہےاس کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہوسکتا ہے)

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

حصول جنت کے طریقے

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا." (الكهف: ١٠٧)

(بے شک جولوگ ایمان لائے، اورانہوں نے نیک عمل کئے ان کی مہمانی کے لئے فردوس کے باغ ہوں گے)۔

حضرات! اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں جہاں ایک طرف "الرحمن" اور "الرحیم" ہے، وہیں دوسری طرف "القَهَّار" اور "الجَبَّار" ہے، دونوں کے نمونے اور علامتیں اس دنیا اور آخرت میں پورے طور پر نمایاں ہوں گی، دنیا میں اس کی رحمت کا اثر قرآن کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے: "كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ، وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْراً" (ہم ہرایک کی مدد کرتے ہیں اُن میں سے بھی اور اِن میں سے بھی، آپ کے پروردگار کی بخشش میں سے کسی پر بندنہیں (الاسراء: ٢٠) اوراس کے غضب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ، اِنَّ اَخْذَهُ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ" (هود: ١٠٢) (اورآپ کے پروردگار کی پکڑ اسی طرح ہے جب وہ بستی والوں کو پکڑتا ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتے رہتے ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی تکلیف دہ بڑی سخت ہے)، آخرت میں اللہ کی رحمت وغضب کے نمایاں مظاہر جنت اور دوزخ ہیں، حدیث شریف (صحیح مسلم: ٧٣٥٥) میں آیا ہے: جنت ودوزخ میں ایک مرتبہ مباحثہ ہوا، دوزخ نے کہا کہ میرے اندر سخت اور تکبر والے افراد ہوں گے، اور جنت نے کہا کہ میرے اندر کمزور اور مسکین افراد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے

اس کا فیصلہ فرمایا: جنت! تم میری رحمت ہو، تمہارے ذریعہ میں جس پر چاہوں گا، رحم کروں گا اور دوزخ تم میرے عذاب ہو، تمہارے ذریعہ میں جس کو چاہوں گا سزادوں گا، "وَلِكِلَيْكُمَا عَلَيَّ مِلْؤُهَا......" (اور دونوں کو بھرنا یہ میرے ذمہ ہے)، اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر شخص کو جہنم سے دور رکھے۔

حضرات! جنت میں داخلہ اور جہنم سے نجات ہی اصل کامیابی ہے، آیئے غور کریں، جنت کیا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ اللہ کی رحمت ہے، جنت کے معنی باغ کے ہوتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے، صحیحین میں ہے کہ حدیث قدسی میں آیا ہے: "أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ مَا لاَ عَيْنٌ رَأَتْ، وَلاَ أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلاَ خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ" (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کی ہیں، جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے ان کے بارے میں کچھ سنا، اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کے متعلق کوئی تصور پیدا ہوا) (صحیح مسلم: ۷۳۱۱)

حضرات! جنت کی زندگی ہمیشہ کے لیے ہوگی، اس میں کبھی موت نہیں آئے گی، ہمیشہ تندرستی ہوگی، بیماری نہیں آئے گی، ہمیشہ جوانی کا لطف ملے گا، بڑھاپا نہیں آئے گا، ہمیشہ خوشحالی ہوگی، بدحالی کبھی نہیں آئے گی، حضرت ابوسعید خدریؓ نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے: "إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَحْيَوْا، فَلاَ تَمُوتُوا أَبَداً، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَصِحُّوا، فَلاَ تَسْقَمُوا أَبَداً، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَشِبُّوا فَلاَ تَهْرَمُوا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَنْعَمُوا، فَلاَ تَبْأَسُوا أَبَداً" (صحیح مسلم: ۷۳۳۶)، اور صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے: موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، اور اس کو ذبح کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اے جنت والو! تمہارے لئے جنت میں ہمیشہ رہنے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، تو تم کو موت نہیں آئے گی، اور اے جہنم والو! تمہارے لئے دائمی جہنم ہے تو اس میں تم کو موت نہیں آئے گی)

حضرات! جنت میں بالاخانے ہوں گے، محلّات ہوں گے، دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی، انواع واقسام کے سامان ہوں گے، لیکن یہ کس کے لئے ہوں گے؟ قرآن کریم کی

آیت میں اس کا جواب ہے: "إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا" (جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے ان کے لیے قیام گاہ کے طور پر جنت الفردوس ہے، یعنی جنت کا اعلیٰ حصہ ہے)، سنن نسائی (حدیث: ۳۳۵۶) میں جنت کے مستحقین کی وضاحت ہے کہ "میں جنت کے ادنیٰ درجہ میں، درمیانی درجے میں اور اعلیٰ درجے میں ایک گھر کی ضمانت لیتا ہوں جو اللہ پر ایمان لائے اور میرے راستے میں جہاد کرے"۔

حضرات! کھانا کھلانا کتنی عام بات ہے، نرم گفتگو کرنا کتنا آسان نسخہ ہے، مسند احمد میں آیا ہے کہ ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک جنت میں ایسے بالاخانے ہوں گے، جن کا بیرونی منظر اندر سے اور اندرونی منظر باہر سے دیکھا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے تیار کیا ہے جو کھانا کھلائے، بات نرمی سے کرے اور مسلسل روزے رکھے اور رات میں نماز پڑھے، اللہ تعالیٰ اولاد دیتا بھی ہے اور اولاد امتحان کے طور پر چھین بھی لیتا ہے، جب اولاد کا انتقال ہو تو ایسے موقع پر "إِنَّا لِلّٰه وإنّا إليه راجعون" پڑھ کر اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا چاہیے، جامع ترمذی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب کسی آدمی کا بیٹا فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کی، وہ کہتے ہیں: جی ہاں! پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ اس نے تیرا شکر ادا کیا اور "إنّا للّٰه وإنّا إليه راجعون" پڑھا، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام "بیت الحمد" رکھ دو یعنی شکرانے کا گھر۔

حضرات! فرض نمازوں سے پہلے اور فرض نمازوں کے بعد آپ ﷺ سنت پڑھتے تھے اور نفل کا اہتمام فرماتے تھے، ان کو بلا عذر ترک نہیں فرماتے تھے، اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن اگر فرائض میں کوتاہی ہوئی تو اسے نفل کے ذریعہ پورا کیا جائے گا، ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جو ظہر سے پہلے چار، اس کے بعد دو، مغرب کے بعد دو، عشاء کے بعد دو، اور فجر سے پہلے دو یعنی بارہ رکعتوں کا اہتمام کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کے

لئے جنت میں گھر بنائیں گے۔

اسی طرح چاشت کی نماز پر جنت میں گھر بنانے، مسجد بنانے پر جنت میں گھر بنانے کا وعدہ کیا گیا ہے، صفوں میں خالی جگہ پُر کرنے پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، دس مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھنے پر جنت میں ایک محل کا وعدہ کیا گیا ہے، مریض کی عیادت پر جنت کی بشارت آئی ہے۔

حضرات! آج کل صفوں میں انسان کھڑا ہوتا ہے اور اچھا خاصا فاصلہ ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مَنْ سَدَّ فُرْجَةً رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً، وَبَنَى لَهُ بَيْتاً فِي الْجَنَّةِ.“ (ابن ماجہ: کتاب إقامة الصلاة والسنة، الترغيب والترهيب للألباني: ۵۰۵) (جس نے صفوں کے درمیان خلا کو پر کیا اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کا مرتبہ بلند کریں گے، اور جنت میں اس کے لئے گھر بنائیں گے)

مذاق میں جھوٹ بولنا تو کوئی عیب نہیں شمار کیا جاتا، جب کہ یہ گناہ ہے، سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ جو شخص مذاق میں جھوٹ بولنا چھوڑ دے اس کے لیے جنت کے درمیانی حصہ کی ضمانت لیتا ہوں، مسلمان سے ملاقات کرنا یا مریض کی عیادت کرنا ایک عام بات سمجھی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا.“ (سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز: ۱۵۱) (تم پاکیزہ ہو، اور تمہارا چلنا پاکیزہ ہے، اور تم نے جنت میں اچھا مقام حاصل کیا)۔

بازار جانا کتنی ضرورت کی چیز ہے، لیکن مسنون طریقے سے جائے تو جنت میں داخلہ آسان ہو جاتا ہے (جامع ترمذی) غرض اللہ تعالیٰ کی رحمت جنت میں داخلہ کے لیے بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

تو ہی داتا ہے کہ دینے کے لیے
تیری رحمت کے ہیں دروازے کھلے

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

انسانی کردار کے اعلیٰ نمونے

(سورۂ یوسف کی روشنی میں)

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: ”لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ، مَا كَانَ حَدِيثاً يُفْتَرَىٰ، وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ.“ (يوسف: ۱۱۲) (انبیاء کرام کے بیان میں ہوش مندوں کے لیے ضرور عبرت ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں، جو گڑھ لی گئی ہو، البتہ گزشتہ کتابوں کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی وضاحت اور اہل ایمان کے لیے ہدایت رحمت ہے)

حضرات! قرآن کریم ایک معجزہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا، معجزہ کہتے ہیں ایسی چیز کو جو انسان کے بس میں نہ ہو، اور انسان اس کے مثل کرنے سے عاجز ہو۔ یہ صرف انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے، اولیاء کو جو حیرت انگیز صلاحیتیں ملتی ہیں ان کو کرامت کہا جاتا ہے اور اللہ کے بعض نافرمانوں کو بھی کوئی انوکھی چیز دے دی جاتی ہے، جیسے دجال وغیرہ، اس کو قرآن کریم کی زبان میں استدراج (ڈھیل) کہتے ہیں۔

قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے، اس کے بہت سے دلائل ہیں، ایک دلیل یہ ہے کہ اس کے ظاہر کی طرح کوئی عبارت نہیں پیش کی جا سکتی، اسی طرح اس میں اس کے قوانین اور احکامات ہیں، ان کے مثل بھی کوئی چیز نہیں لائی جا سکتی ہے، اسی طرح جو واقعات اور قصے اس نے بیان کئے ہیں عبرت ونصیحت کے لیے، وہ بھی اپنے حسنِ بیان اور بلاغت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے جانے کی دلیل ہیں۔

قرآن کے واقعات میں کچھ واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ صرف ایک جگہ آیا

ہے، انھیں میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ سے پوچھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں شریفوں میں سب سے زیادہ شریف کون ہیں؟ پھر آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: یوسف علیہ السلام، ان کے والد بھی، ان کے دادا بھی، ان کے پردادا اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہیں۔

قرآن نے حضرت یوسفؑ کے واقعہ کو احسن القصص کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو متعدد باتیں اور نصیحتیں مختلف نصوص میں بیان کی گئی ہیں، وہ سورۂ یوسف میں یکجا ذکر کر دی گئی ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں کوئی ایسی بات نہیں، صرف انبیاء کے ساتھ خاص ہو، بلکہ اس میں عام آدمی کے سیکھنے کی بھی بہت سی باتیں ہیں، قرآن میں عام طور پر انبیاء کی نبوت کے بعد کے حالات ذکر کئے گئے ہیں، لیکن سورۂ یوسف میں بچپن سے اخیر عمر تک کے حالات کو اچھے انداز میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، تاکہ زندگی کے ہر مرحلہ میں لوگوں سے استفادہ آسان ہو جائے، یہ سورت رسول اللہ ﷺ پر اس لئے اتاری گئی، تاکہ معلوم ہو سکے کہ حضرت یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے جو کچھ کیا ممکن ہے کہ قریش بھی آپ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کریں۔

حضرات! یہاں پورا قصہ بیان کرنا مقصود نہیں، بس چشم تصور میں قصے کے مختلف حصوں کو لائیے اور اس کے پیغام کی طرف توجہ مرکوز کیجئے:

(۱) یہ معلوم ہے کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، اس میں اچھے عمل کے ذریعہ ہی آخرت کی تعمیر ہو سکتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ایک امتحان سے دوسرے بڑے امتحان پر منتہی ہوتی ہے، والد سے دور کیا جانا، بھائیوں کا حسد، کنویں میں ڈالا جانا، غلام بنا کر بیچا جانا، عزیز مصر کا اپنی طرف مائل کرنا، پھر ان کو جیل میں ڈالا جانا ہے۔ یہ تمام امتحان کی گھڑیاں ہیں، ان میں یوسف علیہ السلام کا حسن وخوبی کے ساتھ معاملہ کرنا اور ہمت نہ ہارنا۔ یہ ان کی کامیابی کی شاہِ کلید ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام کا جب امتحان ہوا تو ہمارا بھی امتحان ہوگا، اور امید رکھنی چاہئے کہ اگر امتحان ہو رہا ہے تو یہ ان شاء اللہ اللہ کے تقرب کا ذریعہ ہوگا۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے،

سورج اور چاند سجدہ کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ انبیاء کا خواب سچا ہوتا ہے، چنانچہ اس خواب کے پورا ہونے میں ایک عرصہ لگا، اس لئے ایک انسان کو اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، یہ مرحلہ اللہ تعالیٰ سے دعا کا ہے کہ انسان جب اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرماتے ہیں۔

(۳) تدبیر و توکل: عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی، سارے دروازے بند ہیں، بظاہر نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام گناہ سے بچنے کے لیے دروازے کی طرف لپکتے ہیں اور پھر دروازے کھلتے جاتے ہیں اور گناہ سے بچ جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اگر انسان ہمت کرے اور حوصلہ سے کام لے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور مدد ہوتی ہے اور ممکنہ اسباب و وسائل فراہم ہو جاتے ہیں۔

(۴) دعوت کے موقع کو غنیمت جاننا۔

مصر میں بادشاہ کے خلاف دو خادموں کے متعلق زہر دینے کا الزام تھا، ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان میں سے ایک نے خواب دیکھا کہ وہ شراب نچوڑ رہا ہے اور دوسرا خواب دیکھا کہ وہ سر پر ٹوکری رکھے ہوئے ہے، دونوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک صالح انسان سمجھ کر، ان سے خواب کی تعبیر معلوم کی، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع کو غنیمت جانا اور داعی کا کردار پیش کیا، اور دونوں کے خواب کی تعبیر بھی بتائی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر انسان کو اپنے مقصد سے نہیں ہٹنا چاہیے، ہر انسان اپنی سطح سے دعوت کا جو کام انجام دے سکتا ہے اسے انجام دینا چاہیے، اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہیں ہے، اور نہ بہت زیادہ علم وفضل کی ضرورت ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے قصّے کا نچوڑ ہے: صبر اور تقویٰ "اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ" (یوسف: ۹۰) صبر نام ہے استقامت کے ساتھ مصیبت کے مقابلہ کا، اور تقویٰ نام ہے خوفِ خدا کا۔

اللہ تعالیٰ توفیقات سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمین

انبیاء کرام کی دعائیں اور دعا کے آداب

الحمد للّٰه رب العالمين ، والصلاة على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد، فقد قال اللّٰه تعالى: أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم ، بسم اللّٰه الرحمن الرحيم: "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ، اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ." (غافر : ٦٠) (اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ مجھے پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل ہوکر داخل ہوں گے)

حضرات! سیرت نبوی میں جو کمالات جمع ہیں، ان کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک دعا اور دوسرے دعوت، دعوت چونکہ مجمع کی چیز ہے، اس لئے نمایاں نظر آئی، لیکن دعا چونکہ خلوت کی چیز ہے، اس لئے بہت کم لوگوں کو اس کی اہمیت کا احساس ہوا، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا: "اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ." (غافر : ٦٠)

حضرات! تمام انبیاء کرام کی زندگی میں دعا اور دعوت کا عنصر نمایاں ہے، وہ دن میں دعوت کا کام کرتے تھے، اور رات کی تنہائی میں اللہ کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے تھے، قرآن کریم نے انبیاء کرام کی دعاؤں کا ایک مجموعہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے:

حضرت آدم علیہ السلام کی دعا ہے: "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ، وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا، وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ." (الأعراف : ٢٣) (اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا، اور اگر آپ ہماری مغفرت نہیں فرمائیں گے اور ہم پر رحم نہیں کریں گے تو یقیناً ہم بڑے گھاٹے میں آجائیں گے)

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ہے: "رَبِّ اِنِّیْ مَغْلُوْبٌ، فَانْتَصِرْ." (القمر: ١٠) (اے میرے رب! میں درماندہ ہوں، سو تو بدلہ لے لے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے: "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ، اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ." (البقرة :١٢٧) (اے ہمارے پروردگار! تو ہم سے قبول کر، یقیناً تو ہی سب کچھ سننے والا ہے، اور سب کچھ جاننے والا) اور دوسری جگہ ہے: "رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ." (إبراهيم: ٤٠) (اے میرے پروردگار! مجھ کو بھی نماز کا پابند رکھئے، اور میری اولاد میں بھی ایسے لوگ پیدا فرمایئے جو نماز قائم کرنے والے ہوں، اے ہمارے پروردگار! ہماری دعا قبول کیجئے)

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا ہے: "رَبِّ قَدْ آتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ، فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ، اَنْتَ وَلِیِّ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ، تَوَفَّنِیْ مُسْلِماً وَاَلْحِقْنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ." (یوسف :١٠١) (اے پروردگار! تو نے مجھے حکومت بھی اور باتوں کی حقیقت کا علم بھی دیا (خواب کی تعبیر)، اے آسمانوں اور زمین کے خالق! تو ہی میرا کارساز دنیا اور آخرت میں ہے، مجھے جب بھی موت دے تو اس حال میں دے کہ میں مسلمان ہوں، اور موت کے بعد مجھ کو نیک لوگوں میں شامل کر دے)

حضرت موسی علیہ السلام کی دعا ہے: "رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ، یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ." (طه : ٢٥-٢٨) (اے میرے پروردگار! میرا حوصلہ اور فراخ کر دے، اور میرا کام مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان میں جو لکنت ہے اس کو دور کر دے، تاکہ لوگ میری بات خوب سمجھ سکیں)

اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی دعا ہے: "رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ." (البقرة : ٢٠١) (اے ہمارے پروردگار! مجھ کو دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بہتری، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا)

حضرات! چھٹی صدی مسیحی میں معاشرہ میں جو خرابیاں آ گئی تھیں ان میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ بندہ اور خدا کا تعلق جس کو دعا کے نام سے جانا جاتا ہے کمزور ہو گیا تھا، دعا کا سرچشمہ اندر ہی اندر خشک ہو گیا تھا، انسان ایک اللہ کو پوجنے کے بجائے ۳۶۰؍ خداؤں کو پوجتا تھا، رسول اللہ ﷺ کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انسانیت کو صرف دعا کی لذت ہی نہیں عطا فرمائی، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کے تعلق کو جوڑ دیا۔

زمانۂ جاہلیت میں دعاء سے محرومی کا ایک بڑا سبب یہ غلط تخیل تھا کہ خدا ہم سے بہت دور ہے، ہماری آواز اس تک کیسے پہونچ سکتی ہے، اس غلط تخیل کو قرآن کریم نے سورۂ بقرہ کی اس آیت سے توڑا: "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ، فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ، وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ." (البقرة: ۱۸۶) (اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں کہ میں قریب ہوں یا دور تو آپ میری طرف سے کہہ دیجئے کہ میں قریب ہی ہوں، اتنا قریب کہ جب پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی بات کا جواب دیتا ہوں، اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں، اور مجھ پر یقین رکھیں، تا کہ ان پر پوری طرح فلاح دارین کا دروازہ کھل سکے)

دوسرا غلط عقیدہ یہ تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور بھی نفع پہونچانے والا اور نقصان پہونچانے والا ہے، اسی وجہ سے قرآن نے کہا: "وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ، فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذاً مِنَ الظَّالِمِیْنَ." (یونس: ۱۰۶) (اور اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو نہ پکارنا، جو کوئی بھی ہو وہ نہ تم کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، اور اگر بالفرض تم بھی ایسا کر بیٹھے تو تمہارا شمار بھی ظالموں میں ہوگا)

حضرات! دعا کی شرائط میں ہے کہ انسان کا کھانا اور پینا حلال ہو، اور پورے جذبہ اور اندرونی کیفیت کے ساتھ دعا کی جائے، تو اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرماتے ہیں، قرآن کریم میں آیا ہے: "یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ! كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً." (المؤمنون:

۵۱) (اے پیغمبرو! پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، میں خوب جانتا ہوں تمہارے کئے ہوئے کاموں کو) اور دوسری جگہ آیا ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ." (البقرة: ۱۷۲) (اے ایمان والو! پاک چیزوں میں سے جو ہم نے دی رکھیں ہیں کھاؤ، پیو) اور ایک جگہ آیا ہے: "اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ." (النمل: ۶۲) (یہ بت بہتر ہے یا وہ جو بے قرار کی فریاد سنتا ہے، جب وہ اسے پکارتا ہے، اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے، اور تم کو زمین کا خلیفہ بناتا ہے)

حضرات! اوقات دعا میں فرض نمازوں کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اذان اور اقامت کے درمیانی وقفہ میں دعا قبول ہوتی ہے، رات کے آخری پہر میں دعا قبول ہوتی ہے، جمعہ کے دن ایک ایسا وقت ہے، جس میں دعاء قبول ہوتی ہے، اور وہ خطبہ شروع ہونے سے نماز کے اختتام کے وقت ہے یا عصر کے بعد کا وقت ہے۔

حضرات! ہماری زندگیوں میں دعا کا عنصر بہت کم ہو گیا، ہم تدبیر خوب کرتے ہیں، لیکن دعا کا اہتمام کم کرتے ہیں، جب کہ تدبیر کے ساتھ دعا کا بھی اہتمام خوب ہونا چاہئے، دوسروں سے دعا کرانا اچھی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: أَيْ أُخَيَّ أَشْرِكْنَا فِيْ دُعَائِكَ وَلَا تَنْسَانَا (جامع ترمذی، کتاب الدعوات: ۳۹۱۰) (اے میرے بھائی! دعا میں مجھے بھی یاد رکھنا)، لیکن یہ یاد رہے کہ جس استحضار نیت اور جذبہ سے انسان خود اپنے لئے دعا کرے گا، دوسرا دعا نہیں کر سکتا، اس لئے مقبول اوقات میں اپنے لئے خود دعا کرنی چاہئے، بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی چیزوں کے لئے دعا کریں، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے دعا کی کیا ضرورت؟ جب کہ ایسا نہیں، انسان چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، اس لئے اس کو ہر چیز اللہ ہی سے مانگنی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نمک اور جوتے کا تسمہ اگر ٹوٹ جائے تو اس کو بھی پہلے اللہ کے حضور میں رکھے، پھر تدبیر کرے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

دعا انسانی ضرورت ہی نہیں، بلکہ عبادت بھی ہے

الحمد للّٰه ربّ العالمین، والصلاة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آله و صحبه أجمعین، أمّا بعد! فقد قال اللّٰه تعالی: أعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰه الرحمن الرحیم:
"وَاسْأَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهِ." (النساء : ۳۲) (اور طلب کرو اللہ سے اس کے فضل کو)

حضرات ! دو حقیقتیں ہیں، جو ہماری روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں: ایک یہ کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، لیکن وہ اس قدر عاجز ہے کہ ہر لمحہ اور صبح وشام جس چیز کا ضرورت مند ہے اس کو وجود میں بھی نہیں لاسکتا ہے، نہ وہ خود سے کھانے کے لئے دانہ پیدا کرسکتا ہے، اور نہ پانی کا قطرہ لاسکتا ہے، نہ وہ ہوا اور دوسری چیزیں فراہم کرسکتا ہے۔

دوسری حقیقت یہ کہ ہمارا خالق اور اللہ اتنا عظیم اور بڑا ہے کہ کائنات کی ساری چیزیں اسی کے اختیار میں ہیں، وہی اس لائق ہے کہ انسان کے سامنے ہاتھ پھیلائے، اور اپنی ضرورتوں کی کشکول اس کے سامنے رکھ دے، اسی عمل کا نام دعا ہے۔

حضرات ! اسلام میں دعا کی بڑی اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی آیتوں میں جا بجا فرمایا: دعا مانگو، اللہ تمہاری دعا قبول کرے گا: سورۂ نساء میں ہے: "وَاسْأَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهِ." (نساء:۳۲) اور سورۂ الم السجدۃ میں ہے: "تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّطَمَعاً." (الم السجدۃ:۱۶) (ان کے پہلو بستروں سے الگ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ڈر اور امید کے ساتھ یاد کرتے رہتے ہیں) رسول اللہ ﷺ جو بندگی کا اعلیٰ نمونہ تھے دعا کرنے کی خوب ترغیب دیتے تھے: ایک جگہ فرمایا: الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ (جامع ترمذی بروایت نعمان بن بشیر:۳۶۹۹) (دعا ہی عبادت ہے) اور

ایک جگہ فرمایا: الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ. (جامع ترمذی، بروایت انس بن مالک:۳۶۹۸)

دعا ایک ضرورت ہی نہیں، بلکہ عبادت، اور خدا کو مطلوب ہے، جو دعا کرتا ہے اللہ تعالی اس سے خوش ہوتا ہے، اور جو دعا نہیں کرتا ہے، اللہ تعالی اس سے ناراض ہوتا ہے، حدیث میں آیا ہے: مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ (جامع ترمذی، حدیث:۳۸۹۳) جس کے لئے دعا کے دروازے کھل گئے، اس کے لئے رحمت کے دروازے کھل گئے۔

حضرات ! انسانوں کا مزاج یہ ہے کہ ان سے کوئی چیز مانگی جائے تو ان کو ناگواری ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالی کو دعا سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں، بلکہ جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتے ہیں (سنن ترمذی:۳۳۷۳)، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مصیبتیں آچکی ہیں دعا ان میں بھی نافع ہے، اور جو آنے والی ہیں دعا ان سے بھی بچاتی ہے، اس لئے اے اللہ کے بندو! تم دعا کا اہتمام کرو (جامع ترمذی بروایت: عبداللہ بن عمر)

حضرات ! انسان کا یہ مزاج ہے کہ وہ عام طور پر مصیبت کے وقت ہی دعا کرتا ہے، یہ بندہ کی خودغرضی ہے، اسی لئے جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو چاہتا ہے کہ مشکل وقتوں میں اس کی دعا قبول کی جائے تو اسے چاہئے کہ بہتر اوقات میں بھی دعا کرے، دعا چونکہ عبادت ہے، اس لئے رائیگاں نہیں جاتی، انسان جب بھی دعا کرتا ہے تو یا تو اس کو وہی چیز مل جاتی ہے، جس کی وہ دعا کر رہا ہے، یا آخرت میں اجر کی صورت میں محفوظ ہو جاتی ہے، یا اس کی دعا کی بقدر اس کی مصیبت دور کر دی جاتی ہے، ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پروردگار بہت حیاء والے اور کریم ہیں، جب بندہ ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس سے حیاء کرتے ہیں کہ اس کے ہاتھوں کو خالی واپس کر دیں۔

حضرات ! رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کو دیکھئے تو صبح وشام کے دعاؤں کا اہتمام ملتا ہے، ہر موقع کی دعائیں احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اس

طرح دعاء کرو کہ دل میں یقین ہو کہ اللہ اسے ضرور قبول ہی فرمائیں گے، دعاء میں کیفیات کو خاص دخل ہے، اس کو قرآن کریم میں (تضرُّعاً وخفیةً) گڑگڑا کر اور آہستہ آہستہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے طائف میں اور عرفات میں جو دعائیں کی ہیں اور جس کیفیت کے ساتھ کی ہیں وہ دعاء کے باب میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔

حضرات! آج کل جو حالات ہیں ان کی اصلاح کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنی چاہئے اور مناسب تدبیر بھی کرنی چاہئے، بڑی حماقت کی بات ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے، دعا کو بے کار سمجھا جائے، ایسا کرنا ایمان میں کمزوری کی دلیل ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

اعمال صالحہ پر تین بشارتیں

الحمد للّٰه ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد ! "يَآيُّها الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيداً يُصلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ، وَيَغْفِرلَكُمْ ذُنُوبَكُمْ، وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيماً." (الأحزاب: ٧٠) (اے ایمان والو! ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہا کرو، اور ہمیشہ سیدھی سچی بات کہا کرو)

حضرات! یہ سورۂ احزاب کی آیت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے تین ذمہ داریوں اور تین بشارتوں کا تذکرہ فرمایا ہے، سب سے پہلی ذمہ داری ایمان کا حاصل کرنا، اصل چیز ایمان ہے، کیونکہ بغیر ایمان کے کوئی چیز معتبر نہیں، خواہ انسان لاکھوں رکعت نماز پڑھ لے، لاکھوں دن روزے رکھ لے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ایمان کو حاصل کیا، ان کا ارشاد ہے: ایمان اتنی اہم چیز ہے جس کو ہم نے پہلے سیکھا، پھر قرآن سیکھا، حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مال اس کو بھی دیتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں، اور جس کو نہیں چاہتے ہیں، لیکن دین اسی کو دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں (شرح السنۃ بروایت عبداللہ بن مسعود: حدیث: ٢٠٣٠)

دوسری ذمہ داری تقوی اختیار کرنا ہے، تقوی نام ہے حرام چیز سے بچنے اور حلال کے بجالانے کا، نیت کے درست کرنے کا، اگر نیت درست ہو تو چھوٹا عمل احد پہاڑ کے برابر ہو جائے گا، اور اگر نیت درست نہیں ہے تو بڑے سے بڑا عمل ذرۂ بے مقدار ہوگا۔ امام ابوداؤد ایک بڑے محدث ہیں، ان کو پانچ لاکھ حدیثیں یاد تھیں، پانچ لاکھ سے انہوں نے آٹھ ہزار سے زائد حدیثیں اپنی کتاب میں جمع کی ہیں، وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ ہزار سے زائد

حدیثیں اپنی کتاب میں جمع کیں ہیں، ان میں سے چار حدیثیں انسان کے دین کے لئے کافی ہیں، اگر کوئی شخص ان چار کو زندگی کا نصب العین بنالے تو پوری شریعت اس کے اندر آجائے گی:

پہلی حدیث: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)، جب نیت درست ہوگی، تو اعمال بھی درست ہوں گے، اور انسان کو تقوی کا اعلیٰ مقام حاصل ہوگا، احسان وتزکیہ کا جو سلسلہ ہے، وہ بھی نیتوں کا قبلہ درست کرنے کے لئے ہے۔تصوف کا آغاز ہوتا ہے: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا دارمدار نیتوں پر ہے) اور اختتام ہوتا ہے: أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّهُ يَرَاكَ (اللہ کی عبادت کرو اس خیال کے ساتھ گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ تصور نہ پیدا ہو تو یہ حقیقت ہے کہ اللہ تم کو دیکھ رہا ہے)

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ”عن أبي هريرة رضي الله عنه: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو ترک کردے) (بخاری ومسلم)

تیسری حدیث میں ہے کہ: عَنْ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يقول: "اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ." (بخاری:۲۰۵۱) (حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے یعنی حلال کو اختیار کرنا چاہئے، اور حرام سے بچنا چاہئے)

چوتھی حدیث میں ہے کہ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ (صحیح بخاری:۱۳) (کوئی انسان مکمل ایمان والا نہیں ہوسکتا ہے، جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

احیاء علوم الدین میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ

تم اپنی عمارتوں کو اتنی اونچی نہ بناؤ کہ پڑوسی کی ہوا رک جائے، ہاں اگر پڑوسی اجازت دے تو کوئی حرج نہیں، اور جب پھل خرید کر لاؤ تو کچھ پڑوس میں بھی بھیج دو، اور اگر دینے کی گنجائش نہ ہو تو چھپا کر لاؤ، اور اپنی ہانڈی کی بو کے ذریعہ تکلیف نہ دو۔

ان چاروں حدیثوں پر اگر گہری نگاہ ڈالی جائے تو ایک عبادات سے متعلق، دوسری اخلاقیات سے، تیسری معاملات سے، چوتھی معاشرت سے متعلق ہے

تیسری ذمہ داری سچ بولنا، جھوٹ نہ بولنا، کیونکہ جھوٹ بولنا ہر برائی کی جڑ ہے

تین بشارتیں: اللہ تعالی اعمال کی اصلاح فرمائے گا، گناہوں کو بخشش دے گا، اور آخرت کی عظیم ترین کامیابی دے گا۔

اللہ تعالیٰ ان تینوں صفات سے ہمارے ظاہر وباطن کو مزین کردے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

رزق کے دروازے

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال اللّٰه تعالىٰ: "اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ من عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ، اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ." (العنکبوت : ٦٢) (اور اللہ روزی کھول دیتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے، اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے، بے شک اللہ ہی ہر چیز سے خوب واقف ہے)

حضرات ! معاملات اسلام کا بہت بڑا شعبہ ہے، اس میں بھی مالی معاملات خصوصی طور پر زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، کسبِ معاش ایک اہم پہلو ہے، وہ انسانی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کو جو شریعت ملی ہے، اس میں اس کو ایک فریضہ سے تعبیر کیا گیا ہے: "كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ (المعجم الكبير للطبراني: ٩٩٩٣) (حلال رزق کمانا بھی ایک فریضہ ہے) اور سورۂ جمعہ میں آیا ہے کہ "فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ." (جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا رزق تلاش کرو) (جمعہ:١٠) اور ایک جگہ ارشاد ہے: "فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ" (سو تم اللہ کے پاس رزق تلاش کرو) (العنکبوت:١٧)

حضرات ! سیرت کی اہم کتب "أسد الغابۃ" ج ١/٤٢٤ میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ سے سعد الأنصاری نے مصافحہ کیا تو دیکھا کہ ان کی دونوں ہتھیلیاں سخت ہیں، آپ ﷺ نے سبب دریافت کیا تو انھوں نے عرض کیا: میں کھیتی میں پھاوڑے اور کدال

سے کام کرتا ہوں، تاکہ اپنے بچوں پر خرچ کروں، یہ سن کر آپ ﷺ نے ان کے ہاتھوں کو چوما اور ارشاد فرمایا: "هٰذِهٖ يَدٌ لَا تَمَسُّهَا النَّارُ" (یہ وہ ہاتھ ہے، جس کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی)۔

احیاء علوم الدین ج ٢/٦١ میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، ان کی نظر ایک ہٹے کٹے نوجوان پر پڑی، جو حصولِ رزق کے لیے جدوجہد کر رہا تھا، اسے دیکھ کر بعض صحابہؓ نے کہا: افسوس کہ یہ اس کام میں مشغول ہے، کاش اس کی جوانی اور طاقت راہِ خدا میں کام آتی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کہو، اگر یہ شخص دستِ سوال دراز کرنے سے بچنے کے لیے اور لوگوں سے بے نیاز ہونے کی غرض سے محنت کر رہا ہے تو وہ راہِ خدا میں ہے، اور اگر یہ شخص اپنے ضعیف و ناتواں والدین اور مجبور و بے کس بچوں کے لیے محنت کر رہا ہے تو وہ راہِ خدا میں ہے، ہاں البتہ اگر وہ دوسروں پر فخر کے لیے محنت کر رہا ہو تو وہ راہِ خدا میں نہیں ہے، بلکہ راہِ شیطان میں ہے۔

حضرات ! دنیا میں آنے والے ہر نبی نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش ضرور اختیار کیا، حضرت آدم علیہ السلام نے زراعت کی، حضرت نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے، حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کپڑا فروش تھے، حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بنا کر بیچتے تھے، اور خاتم النبین محمد ﷺ نے متعدد تجارتی اسفار کئے، بخاری کتاب الاجارہ میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے ارشاد فرمایا: دنیا میں آنے والے ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں، تو صحابہؓ نے عرض کیا: کیا آپ نے بھی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں، میں بھی قیراط (مکہ کا مروجہ سکہ) کے عوض اہلِ مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

صحابۂ کرامؓ کی معاشرتی سرگرمیاں متنوع ہیں، حضرت ابوبکرؓ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، مقام سُنح میں ان کا کارخانہ تھا، حضرت عمرؓ بھی کپڑے کا کاروبار کرتے تھے،

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ ایک زمانہ میں ان کی تجارت اتنی وسیع ہوئی تھی کہ ایران تک پہنچ چکی تھی۔ حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید وفروخت کرتے تھے، حضرت علیؓ نے بھی کسب معاش کے لیے مزدوری کی، ان کے علاوہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت طلحہ بن عبداللہؓ مختلف ذرائع معاش اختیار کئے ہوئے تھے۔

حضرات! اسلام ایک معتدل مذہب ہے، جہاں اس میں مال کمانے کی فضیلت بیان کی گئی ہے، وہیں یہ بھی بتایا گیا کہ مال ودولت دھوکہ اور فتنہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر انسان مال کمانے میں اس حد تک مشغول ہے کہ اصل مقصد حیات متأثر ہو رہا ہے یا اس کو ناجائز طریقہ سے حاصل کر رہا ہے تو جہنم کا ایندھن بنے گا اور سخت عذاب سے دوچار ہوگا۔

حضرات! آج کل اکثر حضرات یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے رزق میں برکت نہیں، ہم روزی کمانے کے لیے اتنی محنت کرتے ہیں، دن رات جدوجہد کرتے ہیں، پھر بھی خرچ پورے نہیں ہوتے۔

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اس بات پر یقین ہونا چاہیے کہ ہم سب کا رازق، بلکہ کائنات میں ہر جاندار کا رازق اللہ ہے، رزق کے فیصلے ہماری محنت وکوشش کی بنا پر، عقل ودانش کی بنا پر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں:

ولو کانت الأرزاقُ تَجری علی الحِجا
هَلَکنَ إذاً من جَهلِهنَّ البهائمُ

(اگر روزی عقل کی بنا پر جاری ہوتی تو جانور اپنی بے عقلی کی وجہ سے مرجاتے)

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے ساتھ جس کو چاہے زیادہ روزی عطا کرتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں کم روزی دیتے ہیں، یہ انھیں کے اختیار میں ہے: ”نَحنُ قَسمنَا بَینَهُم مَعِیشَتَهُم فِی الحَیَاةِ الدُّنیَا وَرَفَعنَا بَعضَهُم فَوقَ

بَعضٍ لِیَتَّخِذَ بَعضُهُم بَعضًا سُخرِیًّا.“ (الزخرف: ۳۲) (ہم نے تو ان کی دنیوی زندگی تک میں ان کی روزی تقسیم کر رکھی ہے، اور ہم نے ایک کے درجے دوسرے سے بلند کر رکھے ہیں، تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے)

تیسری بات یہ ہے کہ تمام خزانوں کی چابیاں صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ سے رزق طلب کرنا چاہیے: ”وَاِن مِن شَیءٍ اِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهٗ، وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعلُومٍ.“ (الحجر: ۲۱) (اور جو چیز بھی ہے ہمارے پاس، اس کے خزانے کے خزانے ہیں، اور ہم اسے ایک متعین مقدار ہی سے اتارتے ہیں)

رزق میں برکت کے اسباب:

(۱) ایمان وعمل صالح: ”مَن عَمِلَ صَالِحاً مِن ذَکَرٍ اَو اُنثیٰ وَهُوَ مُؤمِنٌ فَلَنُحیِیَنَّهٗ حَیَاةً طَیِّبَةً“ (النحل: ۹۷) (جو شخص بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ایمان والا ہو تو اسے ہم یقیناً بہت ہی پاکیزہ زندگی عطا کریں گے یعنی رزق میں برکت، اور دوسری جگہ آیا ہے: ’وَمَن اَعرَضَ عَن ذِکرِی فَاِنَّ لَهٗ مَعِیشَةً ضَنکاً“ (طه: ۱۲۷)۔ (جو میرے ذکر سے روگردانی کرے گا تو دنیا میں یقیناً تنگ حال رہے گا)

(۲) تقویٰ: رزق میں برکت کے اسباب میں اہم سبب تقویٰ ہے یعنی اللہ کا ایسا خوف جو انسان کو اس کی نافرمانی اور محرمات کے اجتناب سے روک دے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَمَن یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجعَل لَّهٗ مَخرَجاً، وَیَرزُقهُ مِن حَیثُ لَا یَحتَسِبُ“ (اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی راہ پیدا کر دیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا)۔ (الطلاق: ۲-۳) ”وَلَو اَنَّ اَهلَ القُرىٰ اٰمَنُوا وَاتَّقَوا لَفَتَحنَا عَلَیهِم بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالاَرضِ“ (اگر یہ بستیوں والے ایمان لاتے اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے تو ہم

ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے) (اعراف:۹۶)

(۳) **تلاوتِ قرآن**: رزق کی برکت کے اہم اسباب میں سے ایک بڑا سبب تلاوت قرآن ہے، جو اسے پڑھے گا تو اس کو اس کی برکت نصیب ہوگی اور اس کی زندگی میں، اہل وعیال میں اور رزق میں برکت آئے گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"وَهٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ، وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" (الأنعام: ١٥٦) (یہ کتاب جو ہم نے نازل کی ہے یہ بڑی بابرکت ہے، اس لئے تم اس کی اتباع کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

(۴) **شکر الٰہی**: "وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ، وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ، اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْدٌ" (ابراهيم: ٧) (اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے تمہیں اطلاع دی تھی کہ اگر تم شکر کروگے تو تمہیں ضرور زیادہ دوں گا، اور اگر تم ناشکری کروگے تو بے شک میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے) رزق میں برکت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جتنا رزق عطا کرے اس پر اللہ کی حمد وثنا بیان کی جائے اور حسب گنجائش اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ کیوں کہ جب بھی انسان اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو تو خوب دے، اور اے اللہ! تو روک کر رکھنے والے کے مال کو برباد کردے (بخاری ومسلم)۔

(۵) **قناعت**: انسان کو اللہ جو دے، اس پر انسان قناعت کرے اور اُس کثرتِ مال کی طلب سے اجتناب کرے، جو اسے اللہ سے غافل کردے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ، حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" (التکاثر:۱-۲) (تمہیں زیادہ مال کی چاہت نے غافل کردیا ہے، یہاں تک کہ تم قبرستان جا پہنچے)۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:"يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ: مَالِيْ مَالِيْ، وَهَلْ لَكَ يَا ابْنَ آدَمَ! مِنْ مَالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ، أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ، أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ." (صحیح مسلم،

کتاب الزہد والرقائق:۷۶۵۹)

حضرات! قناعت کی صفت کیسے پیدا ہوگی؟ صحیح مسلم میں آیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"اُنْظُرُوْا اِلٰى مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَاِنَّهُ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ." یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اپنے سے کم تر انسان کی طرف دیکھے گا تو اللہ کی ان نعمتوں کو حقیر نہیں سمجھے گا جو اس نے اسے عطا کر رکھی ہیں، اور ان نعمتوں میں تین نعمتیں ایسی ہیں کہ جو کسی کے پاس موجود ہوں تو اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پوری دنیا جمع کردی ہے، اور وہ ہیں: صحت، امن، اور ایک دن کی خوراک، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِناً فِيْ سِرْبِهِ، مُعافًى فِيْ جَسَدِهِ، عِنْدَهُ قُوْتُ يَوْمِهِ، فَكَأَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا." (جامع ترمذی:۲۵۱۷) (تم میں سے جو شخص صبح کے وقت تندرست ہو، اپنے آپ میں پر امن ہو، اور اس کے پاس ایک دن کی خوراک موجود ہو تو گویا اس کے لیے پوری دنیا کو جمع کردیا گیا)۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

سال نو اور احتساب نفس

محرم الحرام اور ہجری کلینڈر

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و صحبہ ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین، وبعد: فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم: "اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اِثْنَا عَشَرَ شَھْراً فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ مِنْھَا اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ." (التوبۃ: ٣٦) (بے شک مہینوں کا شمار اللہ کے نزدیک بارہ ہی ہیں، کتاب الٰہی میں (اس روز سے) جس روز کہ اس نے آسمان اور زمین پیدا کئے، اور ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں)

حضرات! محرم الحرام ہجری تقویم (جنتری) کا پہلا مہینہ ہے، ہجری جنتری محرم سے شروع ہوتی ہے، مسندِ حاکم میں سعید بن مسیّب سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ہجری سال کی تعیین کی، انہیں کے زمانے میں ایک چیک آیا، جس میں صرف شعبان لکھا ہوا تھا، اس پر سوال پیدا ہوا کہ کون سا شعبان مراد ہے؟ اِس سال کا یا سالِ گذشتہ کا، پھر اہلِ شوریٰ بلائے گئے، مشورہ ہوا، کسی نے کہا: بعثت نبوی کو سال کا آغاز مانا جائے، کسی نے کہا: ولادتِ نبوی کو، اور کسی نے ہجرتِ نبوی کو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہجرتِ نبوی کی رائے دی، اور اس کو قبول کیا گیا۔

پھر مہینہ کی بات آئی، کس کو ہجری سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رائے دیتے ہوئے کہا کہ محرم ہی کو پہلا مہینہ شمار کیا جائے، کیونکہ وہ محترم مہینہ ہے، اور لوگ بھی اس میں حج سے لوٹتے ہیں۔

امام ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری میں فرماتے ہیں: سنہ کی تعیین کے سلسلہ میں چار

نکات سامنے آئے: ولادت، بعثت، ہجرت، وفات، ان میں ہجرت کو اہمیت دی گئی، کیونکہ ولادت اور بعثت کی تعیین میں نزاع اور اختلاف تھا، اور وفات کا وقت طے کرنے سے افسوس وحسرت کی ابتداء ہورہی تھی، اس لئے ہجرت کو موضوع بنایا گیا، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ہجرت تو صفر کے اخیر سے ربیع الاوّل کے نصف اول تک مکمل ہوئی ہے، اس لئے ہجری سال کا آغاز ربیع الاوّل سے ہونا چاہیے، لیکن ربیع الاوّل کے بجائے محرم کے ذریعہ سے مہینہ کا آغاز اس لئے ہوا کہ ذی الحجہ میں بیعتِ عقبہ ہوئی، اس کے بعد جو چاند طلوع ہوا، وہ محرم کا تھا، اور نبی پاک ﷺ نے محرم ہی میں ہجرت کا عزم کیا۔

حضرات! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ہر گھر اور دَر تک اسلام کا پیغام پہونچا چکے، اور مکہ کے گردوپیش میں بھی اس دعوت حق کی دستک دی تو ہر طرف آپ کی صدا رد کی گئی، طنز وتشنیع کے تیر پھینکے گئے، ناامیدی اور انکار کی اس گھنگھور گھٹا میں روشنی کا صرف ایک چراغ تھا، جو مدینہ کی سرزمین میں جلا تھا، اس لئے وہاں ہجرت کی، جب کسی قوم پر دعوتِ دین کا حق ادا کردیا جائے، اور ان پر حجت پوری کی جائے، تو اپنے دین کی حفاظت اور دوسری قوموں تک دعوتِ دین کی غرض سے وطن عزیز کو چھوڑنا ہجرت ہے۔ تلاشِ معاش اور امن وامان کی طلب میں ترکِ وطن کرنا ہجرت نہیں ہے، جیسا کہ آج کل سمجھا جاتا ہے۔

نبوت کے چودھویں سال آپ کو ہجرت کی اجازت ملی، آپؐ نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا، اس کی اطلاع صرف حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ کو تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نازک فیصلوں کے اظہار میں احتیاط اور پردہ دری ضروری ہے، افسوس کہ آج امت میں اس کا فقدان ہے، ہم اغیار کے لئے اشتعال انگیز سرخیوں کے ذریعہ سے گرما گرم مواد فراہم کردیتے ہیں، یہ جرأت نہیں، بے وقوفی ہے۔

اہلِ مکہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ محمدؐ ہجرت کرنے والے ہیں، اگر آپؐ مدینہ چلے گئے تو پھر اسلام کو مٹانا مشکل ہوگا، چنانچہ شب میں آپؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا، ایسی حالت

میں آپؐ کے پاس اہلِ مکہ کی کچھ امانتیں تھیں، آپؐ نے یہ امانتیں حضرت علیؓ کو سپرد کیں، اور ان سے خواہش کی کہ آج کی شب آپؐ کی استراحت گاہ پر وہ چادر اوڑھ کر آرام کریں۔

اس میں دو باتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ امانت ودیانت کا بڑا سبق ہے، دوسرے یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو معلوم تھا کہ یہ بستر بسترِ مرگ ہے، لیکن بسروچشم اس خطرہ کو مول لینا قبول کرلیا۔

حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، اس درمیان بے مثال قربانیاں دیں، گھر میں جو کچھ تھا سب لے لیا، (پانچ ہزار درہم ساتھ لیا)، ان کے والد حضرت ابوقحافہؓ بہت سن رسیدہ اور نابینا تھے، انہوں نے کہا کہ ابوبکر نے کچھ نہیں چھوڑا؟ تو حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ نے گھر کے ایک کونے میں مٹی اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیئے، اور جہاں حضرت ابوبکرؓ دینار ودرہم رکھتے تھے، اپنے دادا کی طمانیتِ قلب کے لئے اس کو دکھایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے بچوں کی ایسی تربیت کرنی چاہیے کہ دین کے لئے پیش آنے والے سرد وگرم حالات میں والدین کا ساتھ دے سکیں۔

جب آپ ﷺ غار میں پہونچے تو آگے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ نے غار صاف کیا، اور بعض روایات کے مطابق ایک سوراخ سے جو کہ بند ہونے سے باقی رہ گیا تھا سانپ نے آپؓ کو ڈس لیا، اس سے معلوم ہوا کہ ہم کو بڑوں کی خدمت میں دلچسپی لینا چاہیئے، اگرچہ اس میں ذاتی نقصان ہو، اس کے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

تین دن کے بعد غار سے غیر معروف راستہ سے نکلے، چونکہ حضرت ابوبکرؓ تاجر تھے، لوگ ان کو جانتے تھے، پوچھتے تھے کہ یہ کون ہیں: دَلِیْلٌ یَدُلُّنِی (راہبر ہیں، جو ہمیں راستہ بتارہا ہے)، لیکن حضرت ابوبکرؓ کا منشا یہ تھا کہ یہ ہمارے روحانی راہبر ہیں، اس سے پتہ چلا کہ مومن کو معاملہ فہم، خطرات کے بارے میں محتاط اور امکانی اندیشوں سے چوکنا رہنا

چاہیے، اور ایسی بات کہنی چاہیے کہ جو حقیقت کے مطابق ہو، اور آزمائش کا سبب نہ بنے۔

جب آپؐ مدینہ پہونچے، تو مدینہ کی زمین آپ کے لئے چشم براہ تھی، بچے خوشیوں کے نغمے اور ترانے گا رہے تھے:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا   مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا   مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ
أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا   جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

یہ منظر بڑوں کے استقبال اور خیر مقدم کا درس دیتا ہے۔

یہ چند باتیں تھیں، جو ہجری کلینڈر اور ہجرت کے واقعہ سے متعلق تھیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ان پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

محرم الحرام اور اس کی خصوصیات

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد ، فقد قال الله تعالى : إن عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا فى كتاب الله يوم خلق السماوات والأرض منها أربعة حرم ، فلا تظلموا فيهن أنفسكم (التوبة :٣٦) (مہینوں کی تعداد اللہ تعالی کے نزدیک بارہ ہی ہے، لوح محفوظ میں اسی روز سے جس روز کہ اللہ آسمان وزمین پیدا کئے ہیں، ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں، تو تم ان میں اپنی جانوں پر زیادتی نہ کرو)۔

محترم حضرات! اسلامی جنتری اور کلنڈر کا پہلا مہینہ محرم الحرام ہے، یہ ان چار مہینوں میں ہے، جن کو اللہ تعالی نے محترم بنایا ہے، اور یہ احترام وتقدس آسمان وزمین کے پیدا کئے جانے ہی سے ہے، اس لئے ان میں نیکی کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے، اور برائی کی سزا بھی دو چند کر دی جاتی ہے، اسی وجہ سے صاف حکم آیا ہے کہ فلا تظلموا فيهن أنفسكم (ان مہینوں میں اپنے نفس پر ظلم نہ کرو) یعنی گناہوں سے بچو اور نیکیوں کو کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت کرو۔

محرم الحرام کی ایک دوسری مستقل خوبی اور فضیلت یہ ہے کہ یہ شہر اللہ یعنی اللہ کا مہینہ ہے، ویسے دیکھا جائے تو کائنات کی تمام چیزیں، آسمان، زمین، چاند سورج، نباتات اور جمادات سب اللہ کے ہیں، لیکن یہاں رسول اللہ ﷺ نے محرم کو شہر اللہ قرار دیا ہے تو محدثین نے لکھا ہے کہ کسی چیز کی نسبت اللہ کی طرف کرنا یہ اضافت تشریفیہ کہا جاتا ہے، یعنی کسی کو شرف اور عزت دلانے کے لئے اللہ کی طرف منسوب کرنا، دنیا میں لاکھوں مکانات ہیں، لیکن خانہ کعبہ کو بیت اللہ (اللہ کا گھر) کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کا شرف سب سے اعلی ہے، تاریخ میں لاکھوں کروڑوں اونٹنیاں

پیدا ہوئیں، لیکن حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو اللہ نے ناقۃ اللہ یعنی اللہ کی اونٹنی قرار دیا ہے، اسی طرح سال کے بارہ مہینوں میں رسول اللہ ﷺ نے محرم الحرام کو شھر اللہ یعنی اللہ کا مہینہ قرار دیا ہے۔

محرم الحرام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نفلی روزہ بھی ہے، رمضان المبارک کے روزے تو ہر مسلمان پر فرض ہیں، لیکن فرض روزوں کے بعد سب سے افضل روزوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: أفضل الصيام بعد رمضان شهر الله المحرم (صحیح مسلم) یعنی رمضان المبارک کے بعد سب سے افضل روزے محرم الحرام کے ہیں، محدثین نے لکھا ہے کہ چونکہ محرم سے سال کا آغاز ہوتا ہے تو شریعت مطہرہ نے یہ پسند کیا کہ سال کا آغاز روزہ سے کیا جائے، محرم الحرام کی دسویں تاریخ تو خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے، اس کو عاشوراء کہا جاتا ہے، یہ دن قدیم تاریخ میں اہمیت کا حامل رہا ہے، جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں کے یہودیوں کو عاشوراء کا رکھتے دیکھا، آپ نے ان سے دریافت فرمایا، تو انہوں نے کہا کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دی تھی، اور فرعون اور اس کی لشکر کو دریا میں ڈبو دیا تھا تو اس کے شکرانہ میں ہم عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ نحن أحق بموسى منكم (ہم تمارے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کے زیادہ مستحق ہیں)، چنانچہ آپ ﷺ نے اس دن خود روزہ رکھا اور صحابہ کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، پھر ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے وفات سے پہلے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو دس کے ساتھ نو یا گیارہ کو روزہ ضرور رکھوں گا، تاکہ یہودیوں سے مشابہت ختم ہو جائے، اگلے سال تو آنحضرت ﷺ کا وصال ہو گیا، لیکن آپ کی حدیث کی روشنی میں یہ اصول بن گیا کہ نو یا گیارہ کے روزے بھی رکھنا چاہئے، تاکہ یہودیوں کی مخالفت ہو سکے۔ جہاں تک اس روزے کے ثواب کا مسئلہ ہے تو حضور اکرم ﷺ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ صيام يوم عاشوراء إني أحتسب على الله أن يكفر السنة الماضية (

یوم عاشوراء کے روزے سے ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالی بندے کے پچھلے ایک سال کے گناہ معاف فرمادیں گے، کتنا بڑا انعام ہے کہ صرف ایک دن کا روزہ اور بارہ مہینہ کے گناہ خواہ وہ رات کی تاریکی میں ہوں یا دن کے اجالے میں دونوں کو اللہ تعالی معاف فرمائیں گے۔

حضرات! محرم الحرام چونکہ اسلامی جنتری کا پہلا مہینہ ہے، اور اسی سے اسلامی کلنڈر کا آغاز ہوتا ہے، اس لئے اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے، صاف سن لیجئے اسلامی کلنڈر کو باقی رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا فرض کفایہ ہے، اگر اس میں کوتاہی ہوگی تو سب گنہگار ہوں گے، سرکاری کاموں کے علاوہ جن میں ہم مجبور نہیں ہیں، ہمیں اسلامی اور عربی تاریخ معلوم کر کے اپنے پروگرام رکھنا چاہئے، قدیم زمانے میں جو جنتریاں رائج تھیں ان میں تاریخ کے اہم واقعہ کو بنیاد بنایا جاتا تھا، مثال کے طور پر عراق میں بخت نصر جو بڑا بادشاہ گذرا ہے اس کی پیدائش سے سن کا آغاز ہوتا تھا، یہودیوں نے اپنے کلنڈر کی بنیاد بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور آزاد ہونے یا حضرت سلیمان کی تخت نشینی سے وابستہ کیا، رومیوں نے اپنے کلنڈر کو سکندر فاتح کی پیدائش سے وابستہ کیا، عیسائیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش سے وابستہ کیا، بکرمی جنتری راجہ بکر ماجیت کی پیدائش سے شروع ہوتی ہے، اس طرح مختلف بادشاہوں کی پیدائش، اور ان کی تخت نشینی سے کلنڈروں اور جنتریوں کا آغاز ہوتا رہا، اسلامی جنتری سے پہلے عالم الفیل کو بنیاد بنایا گیا، ولادت نبوی کو بنیاد بنایا گیا، بعثت کے واقعہ کو بنیاد بنایا گیا، اسراء و معراج کو، آیت قتال کو، سورۂ براءت کو، غزوہ بدر اور حجۃ الوداع کو بنیاد بنایا جاتا رہا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں بھی یہی طرز عمل رائج رہا، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ہجری جنتری کی بنیاد پڑی، اس سلسلہ میں تین واقعات بہت اہم ہیں: مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ۱۶ھ میں خط لکھا کہ آپ کے سرکاری آرڈر اور دستاویزات آتی ہیں ان میں تاریخ درج نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس شوری بلائی، الأدب المفرد میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس

ایک خط آیا، جس میں صرف شعبان لکھا ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کس سال کا شعبان مراد ہے، اس سال کا یا گذرے سال کا، پھر مجلس شوری بلائی۔ مجلس شوری بلائی گئی، کسی نے کہا کہ کہ ایرانیوں اور رومیوں کی تاریخ لے لی جائے تو اس کو اس وجہ سے نامنظور کیا گیا کہ دوسری قوم کی مشابہت اس میں ہے اور جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اسی میں ہوگا۔ ایک رائے یہ آئی کہ ولادت رسول یا وفات رسول کو اس کلنڈر کی بنیاد مانا جائے لیکن ان کو نامنظور کردیا گیا کہ امت یا تو خوشیوں میں مست ہوجائے گی یا غم وافسوس منانے لگے گی، آخری رائے آئی کہ ہجرت سے اس کا آغاز ہو، یہ رائے پیش کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نعم ، الهجرة فرقت بين الحق والباطل (جی ہاں، ہجرت نے حق وباطل میں فرق کو واضح کردیا ہے)، اس پر تمام صحابہ متفق ہوگئے۔ ہجری جنتری سے سے پہلے سال کا آغاز محرم سے ہوتا تھا تو اس کو باقی رکھا گیا، اب مہینہ کی بات آئی کہ ہجری کلنڈر کا پہلا مہینہ کون سا ہوگا، کیونکہ ہجرت تو صفر میں ہوئی تو اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے آئی کہ بیعت عقبہ ثانیہ چونکہ ذی الحجہ میں ہوئی ہے، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا تھا، اسی لئے محرم ہی کو ہجری سال کو پہلا مہینہ مانا جائے۔ اس طرح ہجری کلنڈر حضرت رضی اللہ عنہ کی یادگار ہے۔

حضرات! اللہ رب العزت کا یہ تقدیری نظام کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت محرم الحرام کی پہلی تاریخ کو ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بے شمار خوبیاں ہیں، ایک خوبی سب پر بھاری ہے کہ سارے صحابہ مرید رسول ہیں، اور حضرت عمر مراد رسول ﷺ ہیں، رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی تھی اے اللہ! اسلام کو عمر بن خطاب یا عمرو بن ھشام یعنی ابوجہل سے مضبوط کر، اللہ نے حضرت عمر کے حضور اکرم ﷺ کی دعا قبول فرمائے۔

انصاف زمانے سے یارب ہے مٹا جاتا
دنیا کو عمر جیسے عادل کی ضرورت ہے

عاشوراء کی فضیلت
اور شہادت کی تاریخ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء، وإمام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين ، أما بعد : فقد قال الله تعالى : ولا تقولوا لمن يقتل فى سبيل الله أموات ، بل أحياء ، ولكن لا تشعرون (البقرة :١٥٤)

(اور جو لوگ اللہ کے راستہ میں شہید کئے جائیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں،، لیکن تم سمجھتے نہیں ہو)

حضرات! محرم الحرام کا مہینہ ہر سال آتا ہے، اور اپنی تاریخ، اہمیت وفضیلت اور شرعی احکام کے ساتھ آتا ہے، محرم الحرام ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے، اور اسی سے اسلامی ہجری کلینڈر کا آغاز ہوتا ہے، اس لئے اس مہینہ کو بطور احتساب، محاسبہ، جائزہ کے یادرکھنا چاہئے، اس میں ہماری فکر یہ ہونی چاہئے کہ آئندہ کے لئے ہم نئے عزم، نئے حوصلہ کے ساتھ منصوبہ بندی کریں اور اس پر پوری پابندی سے عمل کریں، زندگی تو برف کی سل کی طرح ہے جو ہر دم، ہر لمحہ پگھل رہی ہے، کہنے والے نے صحیح کہا ہے:

قیمت غم حیات کی تو دام دام لے
بہار ہو کہ خزاں دونوں سے کام لے

حضرات! محرم الحرام کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ چار محترم مہینوں میں سے ایک ہے، ان چار مہینوں (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں اعمال کا ثواب بڑھا

دیا جاتا ہے، اور عبادات کرنے میں اضافی اجر سے نوازا جاتا ہے، اسی مہینہ کی دسویں تاریخ عاشوراء کے نام سے جانی جاتی ہے، یعنی اس مہینہ کی دسویں تاریخ، یہ دن بہت تاریخی ہے، دسویں واقعات اس دن پیش آئے، جن میں سب اہم واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالی بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دی، اور ظالم حکومت کا خاتمہ ہوا، اسی خوشی میں رسول اللہ ﷺ نے یہود مدینہ کو اس دن سے روزہ رکھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ہم موسی علیہ السلام کی اتباع کے زیادہ حق دار ہیں، چنانچہ آپ نے روزہ رکھا، اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا، مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صیام یوم عاشوراء إني أحتسب علی الله أن یکفر السنة التي قبله (صحیح مسلم) عاشوراء کا روزہ رکھنے سے اللہ تعالی ایک سال پہلے کے گناہ معاف فرمادیتے ہیں، اور یہ بھی فرمایا کہ اگر میں اگلے سال تک رہا تو نو محرم کا بھی روزہ رکھوں گا، تا کہ یہود کی مخالفت ہو سکے۔

حضرات! محرم الحرام اسی مہینہ کو شہادت کے مہینے کے نام سے جانا جاتا ہے، اسی مہینہ کی ایک تاریخ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا ہے، اور اس مہینہ کی دس تاریخ کو سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، گویا اس مہینہ میں دو واقعات شہادت پیش آئے۔ اس تناظر میں یہ مہینہ شہادت کا بھی قرار پایا، شہادت موت کا سب سے اعلی درجہ ہے، وہ صبر واستقامت کی علامت ہے، شہادت مظلومیت کی سند بھی ہے، وہ مطلوب ومقصود مؤمن بھی ہے، اللہ تعالی قرآن کریم میں جن چار مقبول بندوں کا تذکرہ فرمایا ہے، ان میں شہداء کو خاص اہمیت حاصل ہے، شہداء وہ ہوتے ہیں، جو راہ حق میں اخلاص کے ساتھ اپنی جان نچھاور کردیتے ہیں، صحیح مسلم کی روایت ہے کہ جس کی موت اس حال میں آئے کہ اس کے اندر راہ خدا میں شہادت کا جذبہ نہیں تو وہ منافق کی موت مرتا ہے۔

قرآن کریم کے سورۂ توبہ میں اللہ کا محبوب ومقبول بننے کے تین نسخے بیان فرمائے ہیں: اللہ کی محبت، رسول اللہ ﷺ کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ۔ ان تینوں کو آٹھ چیزوں پر مقدم رکھا

جاتا رہے گا، اللہ تعالی اپنے قرب سے نوازتے رہیں گے۔ قل ان کان آباؤکم وأبناؤکم واخوانکم وازواجکم، وعشیرتکم، و أموال اقترفتموها، و تجارة تخشون کسادها، ومساکن ترضونها، أحب الیکم من الله و رسوله و جهاد فی سبیله، فتربصوا حتی یأتی الله بأمره، والله لا یهدی القوم الکافرین (التوبة : ٢٤)

حضرات! رسول اللہ ﷺ آمد کے بعد تاریخ اسلام کی سب سے پہلی شہیدہ جنہوں نے اپنا جان جان آفریں کے سپرد کی، یہ اپنے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایمان لائیں، ان کے صاحبزادہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت سمیہ، حضرت یاسر، حضرت عمار تینوں کو مکہ تپتی زمین میں سزا دی جاتی، اللہ کے رسول اللہ ﷺ کا گذر ہوتا تو فرماتے: صبرا یا آل یاسر، فان موعدکم الجنة، ابوجہل نے نیزہ مارا، اور سنہ سات نبوی میں ان کی شہادت ہوئی، شہداء کی فہرست میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا ہے، ان کے اسلام لانے کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے، حضور اکرم ﷺ کو ستایا گیا، اس سے آپ دل برداشتہ ہوئے اور ابوجھل سے ان کا انتقام لیا، اور اپنے اسلام کا اعلان کیا، آپ کے اسلام لانے سے مکہ میں اسلام کو استحکام ہوا، آپ غزوہ بدر میں شریک ہوئے، اور شیبہ کو قتل کیا، غزوہ احد میں وحشی بن حرب حبشی نے آپ کو نیزہ مارا اور پھر شہید ہوئے، ستاون سال کی عمر میں شہادت کا جام نوش کیا۔ ان شہیدان راہ وفا کے ساتھ شہداء بدر، شہداء احد، شہدائے خندق کی ایک زریں اور طویل تاریخ ہے، پھر اگر خلفائے راشدین میں دیکھیں تو تین خلفاء راہ خدا میں شہید ہوئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نماز کی حالت میں ابولولو مجوسی نے نیزہ مارا، جس سے آپ شدید زخمی ہوئے، اور آپ کی دعا پوری ہوئی: اللهم ارزقني شهادة في سبيلك، واجعل موتي في بلد رسولك ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شہیدان راہ وفا میں میں، تیسرے خلیفہ، عشرہ مبشرہ میں شامل، اور ذو

النورین کے لقب سے ملقب، اسلام کی راہ سب سے پہلی ہجرت حبشہ کی طرف کرنے والے ، بارہ سال تک خلافت کے نظام کو سنبھالنے والے عبداللہ بن سبأ یہودی کی سازشوں کا شکار ہوئے اور راہ حق شہادت پائی، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی خلفائے راشدین کی فہرست میں ہیں، آپ کے بے شمار فضائل ومناقب ہیں، ۳۵ھ میں نظام خلافت سنبھالا، اور ۲۱ رمضان ۴۰ھ کو عبدالرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

شہدائے اسلام میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نوجوان جنت کے سردار ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی، لیکن انہوں نے فتنہ کے خوف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کر لی، اس طرح رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہوئی، إن ابني هذا سيد ، لعل الله أن يصلح به بين فئتين من المسلمين. ۵۰ھ میں زہر دے کر ان کو شہادت ہوئی، اور جہاں تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ ہے وہ تفصیلی ہے، انہوں نے جو موقف یزید کے مقابلہ میں اختیار کیا، وہ بالکل حقیقت پر مبنی تھا، اور اس میں امت کے لئے بڑی رہنمائی ہے، کسی قارسی شاعر نے کہا ہے:

جان داد ، نہ داد، دست دردست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

(جان دے دی، لیکن یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں، سچ یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کی بناء حسین نے قائم رکھی)۔ یہ شہدائے اسلام ہیں، ان کے تذکرہ سے روح کو روحانی وایمانی غذا ملتی ہے، ضرورت ہے کہ ایسے تذکروں سے ہم اپنی مجلسوں کو آباد رکھیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

وقت کی اہمیت اور اس کے تقاضے

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد! فقد قال الله تعالى : "قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ، الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ." (المؤمنون: ۱-۳)

(یقیناً وہ مومنین فلاح ہوگئے، جو اپنی نمازیں خشوع رکھنے والے ہیں، اور جو لغوبات سے برکنار رہنے والے ہیں)

حضرات! ہجری تقویم اور جنتری کا ایک سال اور مکمل ہوا، اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے، اور یہ نظام اُسی وقت سے قائم ہے، جب سے دنیا قائم ہے، اور آسمان وزمین کی تخلیق ہوئی ہے، انہیں میں چار مہینے محترم ہیں: ذوالقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب، سال کا آغاز محرم سے ہوتا ہے، اور اختتام ذی الحجہ پر، ذی الحجہ قربانی کا مہینہ تھا، گویا ذی الحجہ ہم سے مانگ رہا تھا، اور محرم شہادت کا مہینہ ہے، یہ ہم کو مانگ رہا ہے، اور اسلام اللہ کے احکام کو ماننے کے ساتھ اللہ کی ماننے کا نام ہے۔

حضرات! قرآن کریم میں آیا ہے: آسمان وزمین کی پیدائش اور دن ورات کی الٹ پھیر میں عقلمندوں کے لئے بے شمار نشانیاں موجود ہیں (آل عمران: ۱۹۰)، سال کا آنا اور جانا یہ اللہ کی نشانی ہے، سال مہینوں سے عبارت اور مہینے ہفتوں سے اور ہفتے دن سے اور دن گھنٹوں سے اور گھنٹے منٹ اور منٹ سکنڈ سے عبارت ہیں، گویا ایک منٹ اور ایک سکنڈ کو ضائع کرنا بہت بڑے حصہ کو ضائع کرنا ہے، کیونکہ زمانہ ماضی، حال اور مستقبل کا نام ہے، اور ان مختلف خانوں میں تقسیم ہے، اس کی قدر وقیمت جاننا اور اس کو کام میں لاکر قیمتی بنانا انسان کا سب سے اہم

مسئلہ ہے، کسی کہنے والے نے کہا: سب سے زیادہ طویل اور سب سے زیادہ مختصر، سب سے زیادہ تیز رفتار اور سب سے زیادہ سست ترین، سب سے زیادہ تقسیم ہونے والی اور سب سے زیادہ کھینچ جانے والی اور سب سے زیادہ نظر انداز کی جانے والی چیز وقت ہے، وقت۔

سال شروع ہوتا ہے تو انسان ایک دوسرے کو مبارک باد دیتا ہے، کارڈ چھپواتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے، لیکن غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کی عمر گھٹ رہی ہے، وہ ایک سال اور موت سے قریب ہوگیا:

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم
چپکے چپکے، لمحہ لمحہ، دم بدم

مگر اسی کا سب سے زیادہ افسوس بھی ہوتا ہے، زندگی کا ایک ایک لمحہ اتنا قیمتی ہے کہ ایک گنہگار، بدکار، فاسق وفاجر، کافر ومشرک زندگی بھر گناہوں میں لت پت ہو، اگر وہ لا إلٰه إلاّ اللّٰه پڑھ لے تو جنت میں داخل ہوجائے، اور زندگی بھر کا عبادت گزار اگر اللہ کا انکار کردے تو جہنم میں چلا جائے۔

حضرات! انسان کو اللہ تعالیٰ نے مختصر زندگی دی ہے، اس میں جو کچھ وہ بوئے گا اسی کی فصل کاٹے گا، یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، چار دن کی اس زندگی پر دائمی زندگی کا انحصار ہے، لیکن یہ عالم رنگ وبو غفلتوں کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے انسان کو جا بجا اس طرف توجہ دلائی ہے، فرمایا: وہی اللہ ہے، جس نے رات دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنایا، اس شخص کے سمجھنے کے لئے جو سمجھنا چاہے اور شکر گزار بننا چاہے (الفرقان: ۶۱-۶۲)۔

حضرات! وقت کی قدر وقیمت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کتنے ہی مقامات پر وقت کی قسم کھائی ہے، کبھی رات کی اور صبح قسم کھائی ہے، وَاللَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى، وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى، وَاللَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ، وَالصُّبۡحِ اِذَا

تَنَفَّسَ، وَاللَّيۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ وَالصُّبۡحِ اِذَا اَسۡفَرَ"، اور کبھی خود زمانے کی قسم کھائی ہے: "وَالۡعَصۡرِ، اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِىۡ خُسۡرٍ" سورج ہو یا چاند ہو دونوں کی آمد سے وقت کا علم ہوتا ہے، ان قسموں کا بڑا مقصد انسان کو عمر عزیز کی گزرتی لہروں سے نفع اٹھانے کی طرف توجہ دلانا ہے، قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پوچھے گا: "اَوَ لَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ (کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا وہ سوچ سکتا تھا (الفاطر: ۳۷) اور حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ اپنی عمر کہاں گذاری، اپنی جوانی کس مقصد میں خرچ کی؟

حضرات! وقت کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عبادتیں مقرر فرمائیں ہیں وہ وقت ہی کے اندر ہیں، بے وقت ادا کرنے سے وہ ادا نہیں ہوگی، پانچوں نمازیں وقت پر نہ ادا ہوں اور بعد میں ادا ہوں تو قضا کہلاتی ہیں، اسی طرح روزہ، زکاۃ، حج وغیرہ ہیں، کوئی شخص جمادی الأولی میں عمرہ کرنے جائے اور حج کے ارکان ادا کرے تو یہ نیت اور ادائیگی بالکل بے کار ہے، کیونکہ حج ذی الحجہ کے مہینے کے ساتھ خاص ہے، اور پانچ دنوں کے اندر ہی ادا ہوتا ہے، اور اس میں جو وقت جس کا ہے اسی وقت میں ادا کرنا ہوگا، ورنہ دم (جرمانہ) واجب ہوجائے گا۔

حضرات! سورۂ فرقان کے آغاز میں ایمان والوں کی صفات بیان کی گئیں ہیں، انہیں میں ایک صفت ہے: "وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ (ایمان والے وہ ہیں جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں)، یعنی لغو باتیں اور لغو معاملات نہیں کرتے ہیں، وہ فضول کاموں سے بچتے ہیں۔

حضرات! قرآن کریم گواہ ہے کہ ایک قوم تھی بنی اسرائیل، ان سے ایک موقع پر کہا گیا کہ وہ ایک جانور ذبح کریں، انہوں نے سادہ سے حکم کو نہیں مانا، سوال پر سوال کرتے چلے گئے، اور لغو باتوں میں مشغول ہوئے، اس طرح انہوں نے معاملہ کو مشکل بنا

لیا، اس سے معلوم ہوا کہ بے کار سوالات کرنا اور ان کو موضوع بحث بنانا شریعت میں جائز نہیں: "یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَسْأَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَلَکُمْ تَسُؤْکُمْ." (المائدة: ١٠) (اے ایمان والو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار گذریں)

امام داؤد ایک بہت بڑے امام ہیں، انہوں نے سنن ابوداؤد ترتیب دی ہے: پانچ لاکھ حدیثوں میں سے چار ہزار آٹھ سو حدیثیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں، پھر ان میں سے چار حدیثیں ایسی منتخب کی ہیں، جو اسلامی نظامِ زندگی کی جامعیت پر گواہ ہیں، انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کے اسلام کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے۔

حدیث شریف میں ہے، صحیح بخاری کی روایت ہے: "نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِیْهِمَا کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ (دو نعمتیں ایسی ہیں، جن کے متعلق اکثر لوگ خسارے میں ہیں: ایک صحت مندی اس کو صحیح کام میں استعمال نہیں کرتے، دوسرے خالی اوقات ان کو مفید کاموں سے نہیں پُر کرتے) اور دوسری جگہ فرمایا: اِغْتَنِمْ خَمْساً قَبْلَ خَمْسٍ: حَیَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ، صِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، فَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، غِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ. (مستدرک علی الصحیحین، کتاب الرقاق: ٧٩١٦) (پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت جانو: زندگی کو موت سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، خالی اوقات کو مشغولیت سے پہلے، مالداری کو فقیری سے پہلے، جوانی کو بوڑھاپے سے پہلے)

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں: میں صوفیاء کی صحبت میں ایک لمبی مدت تک رہا، لیکن میں نے دو باتیں ان سے سیکھی ہیں: وقت تلوار کے مانند ہے، آپ نے اس کو کسی عمل میں مشغول نہ کیا تو وہ خود کاٹ دے گا، دوسرے یہ کہ نفس کی حفاظت کیجئے، کیونکہ اس کو اگر کسی اچھے کام میں مشغول نہیں کیا، تو وہ برے کام میں مشغول ہوجائے گا۔

حضرات! وقت کے بچانے کے اصول ہیں، جن سے اہم اپنے اوقات کو منضبط کرسکتے ہیں:

نظام الأوقات (ٹائم ٹیبل)۔ اگر ہم ہر کام کے لئے ایک وقت طے کرلیں گے اور اس میں وہ کام کریں گے تو ہمارا وقت بچے گا، دوسری بات یہ کہ جسمانی صحت کی حفاظت۔ یعنی جو کام بھی کریں، اعتدال، میانہ روی کے ساتھ کریں اور جسمانی صحت کا بھی خیال رکھیں، تیسری بات یہ کہ اپنے کاموں کا جائزہ لیتے رہیں، اس سے کام میں پختگی آئے گی، اور کم وقت میں زیادہ کام ہوگا۔

وقت کو ضروری اور غیر ضروری کاموں میں صرف کے سلسلہ میں دو واقعے اختصار سے سنئے:

(١) ہارون رشید کے دربار کا واقعہ بہت مشہور ہے، ایک مداری آیا، اس نے ایسا کرتب دکھایا جو لوگوں کے لئے باعث حیرت تھا، اس نے ایک سوئی زمین میں گاڑی اور اس کے ناکے سے دس سوئیاں گذار دیں، لوگوں نے بہت تعجب کیا، ہارون رشید کو بھی حیرت ہوئی، اس نے اعلان کیا کہ اس کو سو دینار دیئے جائیں اور سو کوڑے لگائے جائیں، لوگوں کے پوچھنے پر ہارون رشید نے تشریح کی کہ سو دینار اس وجہ سے دیئے جائیں گے کہ اس نے غیر معمولی کرتب کا مظاہرہ کیا، اور سو کوڑے اس وجہ سے کہ اس نے اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو لایعنی کام میں صرف کیا۔

(٢) علامہ شبلی ایک سفر میں تھے، جہاز میں کچھ خرابی آگئی، سارے مسافر پریشان تھے، لیکن پروفیسر آرنلڈ جہاز میں بھی مطالعۂ کتاب میں مصروف تھے، علامہ شبلی نعمانی نے حیرت واستعجاب کے ساتھ آرنلڈ سے اس حالت میں بھی مطالعہ کی وجہ دریافت کی تو پتہ چلا کہ جو وقت ہے، اس کو غنیمت جانیں اور جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم کو وقت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ ربّ العالمین

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور پیغام عمل

عصر حاضر میں سیرت طیبہ کی معنویت

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین ، أمابعد! فقد قال اللّٰہ تعالی : أعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ." (الأحزاب: ۲۱)

(رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے)

حضرات! سیرت کا موضوع اہم ترین موضوعات میں سے ہے، جس نے سیرت کا مطالعہ نہیں کیا، اس سے علم کا ایک بہت بڑا حصہ چھوٹ گیا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم سیرت اس طرح سیکھتے تھے جس طرح قرآن سیکھتے ہیں، مشہور محدث امام زہریؒ فرماتے ہیں: سیرت میں دنیا و آخرت کا علم موجود ہے، اسماعیل بن محمد بن سعد بن وقاص فرماتے ہیں کہ ہمارے والدِ محترم ہم کو سیرت کا درس دیتے تھے، اور ایک ایک پہلو کو شمار کراتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ تمہارے آباء واجداد کے کارنامے ہیں، ان کو ضائع نہ کرنا۔ بلاشبہ ہم دین کو مکمل شکل میں اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے ، جب تک کہ سیرت کا پورا مطالعہ نہ کرلیں ، سیرت نبوی نام ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک کی زندگی کے جامع بیان کا۔

حضرات! ہر مسلمان سے مطالبہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نمونہ بنائے ، تمام رہنمایانِ عالم اور مصلحینِ انسانیت میں آپ کی ذات ایسی ہے جو اسوہ بنائے جانے کے لائق ہے، کسی بھی شخص کو نمونہ بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر چند باتیں پائی جائیں:

١۔ اس نے کسی ایک قوم یا ایک طبقہ کو اپنا مخاطب نہ بنایا ہو۔

٢۔ وہ شخص زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کرتا ہو۔

٣۔ اس کی تعلیمات اور اس کا دیا ہوا پیغام محفوظ طریقہ سے ہم تک پہونچا ہو۔

دنیا میں جتنے مذاہب رائج ہیں ان میں یہودیت، عیسائیت اور ہندو مشہور ہیں:
جہاں تک یہودیت کی بات ہے تو وہ صرف نسلی مذہب ہے اور عیسائیت کے بارے میں حضرت عیسیٰ کا یہ مشہور جملہ ''متی انجیل'' میں موجود ہے کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا، ظاہر سی بات ہے کہ جس مذہب کی تعلیمات ایک نسل تک محدود ہوں، وہ کیسے پوری انسانیت کے لئے رہنما ہوسکتی ہیں۔.ہندو مت کو قدیم مذہب سمجھا جاتا ہے، شاید کسی مذہب میں اتنی طبقہ واریت پائی جاتی ہو جتنی ہندو مت میں ہے، برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ایک ایسا مذہب جو انسانوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ رکھتا ہو، وہ کیسے قابلِ نمونہ ہوسکتا ہے۔

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، آپؐ نے کبھی اس کو ایک نسلی یا جغرافیائی مذہب کی حیثیت سے پیش نہیں کیا، بلکہ دین واسلام کو ایک آفاقی تصور دیا، قرآن کہتا ہے: هُدًى لِلنَّاسِ، أُمَّةٌ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، رَسُولٌ رَحْمَةٌ لِلعَالَمِينِ، جو کتاب ہے وہ پوری انسانیت کے لئے ہے، جو امت ہے وہ پوری انسانیت کے لئے برپا کی گئی ہے، اور جو رسول ہیں وہ تمام لوگوں کے لئے رحمت ہیں، اسلام میں معیارِ فضیلت اللہ کا خوف اور ڈر ہے۔اسلام کا حکم ہے کہ نماز کی امامت وہی کرے گا جو سب سے زیادہ قرآن کو محفوظ رکھنے والا ہو، سالم جو ابوحذیفہ کے غلام تھے، ان کو امام بنایا گیا، سیاسی اعتبار سے دیکھئے، حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اجلۂ صحابہ پر امیر بنایا، جب کہ وہ زید بن حارثہؓ کے بیٹے تھے، قانونی اعتبار سے دیکھئے، تو معلوم ہوگا کہ فاطمہ بنت محمد بھی اگر چوری کرتی تو ان کا بھی ہاتھ کاٹا جاتا، سماجی اعتبار سے دیکھئے، تو معلوم ہوگا کہ حضرت زیدؓ کا نکاح حضرت زینب بنت جحشؓ سے

کرایا، تاکہ معلوم ہوجائے کہ اصل معیار اخلاق اور تقوی ہے۔آخرت کے سلسلہ میں اعلان کر دیا کہ اصل معیار اعمال ہیں، نہ کہ انساب۔

حضرات! سیرتِ نبویؐ ایسا حسین گلدستہ ہے، جس میں نوع بنوع کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔اپنوں اور منافقوں کے ساتھ آپؐ نے اچھا معاملہ کیا، مشہور منافق عبداللہ بن اُبی بن سلول کے ساتھ آپؐ نے اچھا سلوک کیا، قرآن کا اعلان ہے: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ." (الأحزاب: ٢١)

حضرات! ہجری کیلنڈر کا ایک مہینہ ربیع الاول ہے، رسول ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اسے ربیع الاول کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، اس کے معنی پہلی بہار کے ہیں، ممکن ہے کہ جب اس مہینہ کا نام رکھا گیا ہو تو یہ مہینہ موسم بہار کے آغاز کا ہو، لیکن اس مہینہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے کئی یادیں وابستہ ہوگئیں، اور اب یہ مہینہ واقعۃً بہار، بلکہ سدا بہار ہوگیا۔اِسی مہینہ میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی، اِسی مہینہ میں آپ نے ہجرت فرمائی اور اِسی میں آپ کی وفات ہوئی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سیرت طیبہ کی معنویت کو صحیح انداز میں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وصلّى اللّٰه تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله و صحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

فضائل رسول صلی اللہ علیہ وسلم

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد: فقد قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ، حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ." (التوبة: ١٢٨)

(بے شک تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری ہی جنس میں سے، جو چیز تمہیں نقصان پہنچاتی ہے، انھیں بہت گراں گزرتی ہے، تمہاری بھلائی کے حریص ہیں، ایمان والوں کے حق میں تو بڑے ہی شفیق ہیں، مہربان ہیں)

حضرات! ربیع الأول کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، اس مہینہ کے آتے ہی سیرت نبوی کے جلسے جگہ جگہ منعقد ہوتے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کے تذکرہ سے دل ونگاہ کو روشن کیا جاتا ہے، آپ ﷺ صرف مسلمانوں کی ضرورت نہیں، بلکہ پوری کائنات کی ضرورت ہیں، کہنے والے نے کہا ہے:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

حضرات! ہر انسان کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیرت نبوی کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے ہمارا کون سا فائدہ متعلق ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دین کو مکمل شکل میں اس وقت نہیں سمجھ سکتے، جب تک کہ سیرت کا پورا مطالعہ نہ کرلیں، کیونکہ سیرت نبوی نام ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک کی

زندگی کے جامع بیان کا، اگر ہم آپ کی زندگی کے حالات کو نہیں سمجھیں گے تو نہ قرآن سمجھ سکتے ہیں اور نہ حدیث، اور نہ شریعت کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔

حضرات! حضرت آدمؑ کی اولاد میں تمام خوبیوں اور خصوصیات، ظاہری و باطنی کمالات، جسمانی وروحانی صفات، اخلاقِ کریمانہ کی حامل اگر کوئی شخصیت ہے تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ تمام اہلِ اسلام کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ آپ جیسا کامل ومکمل نہ کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا، اس وقت دنیا میں جو کمالات واوصاف پائے جاتے ہیں وہ آپ کے کمالات کا پرتو اور عکس اور اس کی کرنیں اور شعائیں ہیں۔

حسن یوسف، دم عیسی، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اسی وجہ سے انسانوں کے بس میں نہیں کہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن کے بیان کا حق ادا کرسکیں، کہنے والوں نے کہا ہے:

لا یمکن الثّناء کما کان حقه
بعد از خدا بزرگ توئی قصه مختصر

حضرات! آپ ﷺ کی شخصیت اور ذات کے کئی پہلو ہیں، اور ہر پہلو بہت روشن وتابناک ہے، ایک پہلو فضائل سے متعلق ہے:

قرآنِ کریم نے آپ کے فضائل کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے، قرآن کہتا ہے: وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں) (القلم: ٤) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (اور آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کردیا) (الشرح: ٤)
قرآن کہتا ہے: "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ، حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ." (التوبة: ١٢٨) (بے شک تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری ہی جنس سے، ان کو تمہاری ہر تکلیف بہت گراں

اورشاق گذرتی ہے،ان کوتمہاری فوز وفلاح کی بڑی حرص،اورخاص کروہ ایمان والوں کے لئے بڑےشفیق اور ہمدرد ہیں) اورقرآن کہتا ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ، ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ، قَالَ ءَ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ، قَالُوْا اَقْرَرْنَا، قَالَ فَاشْهَدُوْا، وَاَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ." (آل عمران: ٨) اور(وہ وقت یادکرو جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت کی قسم سے دوں، پھر تمہارے پاس اس (چیز) کی تصدیق کرنے والا آئے، جوتمہارے پاس ہے تو تم اس (رسول) پرایمان لانا اورضرور اس کی مدد کرنا، (پھر) فرمایا: تم اقرار کرتے ہواور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے: ہم اقرار کرتے ہیں، فرمایا: گواہ رہنا، اور میں (بھی) گواہوں میں سے ہوں)

حضرات! رسولِ پاک ﷺ کی سیرت طیبہ کا جب بھی ذکر ہوتو ضروری ہے کہ ہمیں آپ کے اوصاف، خصوصیات، شمائل وآداب کا علم ہو۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا: میں محمدؐ ہوں، میں احمد ہوں، مسلم شریف ہی میں ہے: حضرت واثلہ بن الاسقعؓ سے مروی ہے: ’’اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کی اولاد میں کنانہ کو چنا، کنانہ کی اولاد میں قریش کو چنا، قریش کی اولاد میں ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم کی اولاد میں مجھ کو چنا۔‘‘

مسلم شریف کی ایک تیسری روایت میں ہے کہ میں اولادِ آدم کا سردار ہوں، اور سب سے پہلے قبر سے اٹھوں گا، اور سب سے پہلے سفارش کروں گا، اور میری سفارش قبول کی جائے گی، اور میرے ہاتھ میں حمد وثنا کا جھنڈا ہوگا، اور سارے انبیاء علیہم السلام میرے جھنڈے تلے ہوں گے۔ بخاری ومسلم کی روایت ہے: میری اور تمام پیغمبروں کی مثال ایسی ہے کہ ایک شاندار محل ہے، جس کی تعمیر بڑی حسین اور خوبصورت کی گئی ہے، لیکن اُس کی تعمیر میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے، دیکھنے والے اس محل کو ہر طرف سے گھوم پھر کر

دیکھتے ہیں، اُن کو اس سے تعجب ہوتا ہے، سوائے ایک اینٹ کی جگہ کے کہ اس حسین عمارت میں نقص ہے: حضورؐ نے فرمایا: میں نے اُس خالی جگہ کو بھر دیا ہے، اور میرے ذریعہ اُس کی تکمیل ہوئی ہے۔

یہ فضائل اور صفات ہیں، جن سے رسول پاک ﷺ متصف ہیں، سورہ انبیاءؑ میں اسی حوالہ سے آیا ہے: "وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ، اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ، وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِلْعٰلَمِيْنَ." (الأنبياء: ١٠٥-١٠٧) (اور لوحِ محفوظ میں لکھنے کے بعد ہم نے آسمانی کتابوں میں بھی لکھ دیا کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے، اور یقیناً اس میں نصیحت ہے ماننے والوں کے لئے اور اے محمدؐ! ہم نے آپ کو دنیا جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

حضرات: آپ ﷺ کی سیرت کے متعدد پہلو ہیں: ان میں ایک پہلو معجزات کا ہے، معجزہ اس عجیب وغریب عمل کو کہا جاتا ہے، جو اللہ تعالی انبیاء کو عطا فرماتے ہیں، اگر انبیاء سے کوئی عجیب وغریب چیز ظاہر ہو تو وہ معجزہ ہے، اور اگر کسی ولی یا بزرگ سے ظاہر ہو تو وہ کرامت ہے، تو قرآن میں بہت سے پیغمبروں کے معجزات کا تذکرہ کیا گیا ہے، قرآن نے اس کے لئے آیۃ یا بینۃ کا لفظ استعمال کیا ہے، معجزات بذات خود نہ مقصود ہوتے ہیں، اور نہ مطلوب، انبیاء کا کام جمادات ونباتات میں تصرف کرنا نہیں، دلوں میں تبدیلی پیدا کرنا، ان کے اندر ایمان ویقین اور اللہ کی وحدانیت کی روح پھونکنا، معجزات کی حیثیت ایک ذریعہ کی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو خدا کی طرف موڑنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

حضرات! اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انبیاء کی زندگیوں کا ہر باب خود ایک معجزہ نظر آئے گا، چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ کا قریش کی پیہم سازشوں کے باوجود زندہ وسلامت رہنا، امی ہونے کے باوجود قرآن مجید پڑھنا، کم وسائل کے باوجود لشکروں پر غلبہ

پانا، اور ہزار رکاوٹوں کے باوجود دین کا غالب آنا معجزہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک اہم معجزہ جس کا قرآن کی سورۂ روم میں بھی ذکر آیا ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ بعثت نبوی کے آغاز میں روم اور ایران دنیا کی دو بڑی طاقتیں تھیں، ان میں برابر جنگیں ہوتی رہتی تھیں، بعثت نبوی کے آٹھویں سال ۶۱۶ء میں ایرانیوں نے رومیوں کو شکست دی کہ ان کی طویل وعریض سلطنت کی دھجیاں اڑا دیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رومیوں کا سورج اب ہمیشہ کے لئے غروب ہوجائے گا، رومی مذہباً عیسائی تھے، اس لئے مسلمانوں کو ان سے یک گونہ ہمدردی تھی، ان کے مقابلہ میں ایران آگ کو پوجنے والے تھے، مشرکین مکہ ان کی طرف داری کررہے تھے، جب رومی ہار گئے تو مشرکین مکہ خوش ہوئے، اور مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ ہمارے ایرانی بھائی رومیوں پر غالب آگئے، اور ہم بھی تم پر غالب آئیں گے، اسلام کے ابتدائی دور میں جہاں مکہ کے مسلمانوں کو ستایا جارہا تھا، یہ خبر بڑی شاق معلوم ہوئی، اور مسلمانوں کے غم والم میں مزید اضافہ ہوا، عین اس حالت میں ماضی، حال اور مستقبل کے جاننے والے علیم وخبیر اللہ رب العزت نے اعلان کردیا کہ: "الٓمّٓ، غُلِبَتِ الرُّوْمُ، فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ، فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ، لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ، وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ." (الروم: ۱-۵) (الف، لام، میم اہل روم مغلوب ہوگئے، ایک قریب کی زمین میں اور وہ اپنی اس مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے چند سال کے اندر، اختیار اللہ کو پہلے ہی تھا اور پیچھے بھی ہے اور اسی روز اہل ایمان خوش ہوگے)۔ چنانچہ ۶۲۵ء میں حالات نے رخ بدلا، اور رومی ایرانیوں پر غالب ہوئے، اور قرآن کی پیشین گوئی نو برس کے بعد پوری ہوئی۔

قرآن کریم کا ایک دوسرا معجزہ معجزہ شق القمر ہے، آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی کے بالکل اخیر میں رونما ہوا، قریش مکہ نے یہود کے مشورہ سے آنحضرت ﷺ سے چاند کو شق کرنے کا مطالبہ کیا تھا، صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا چشم دید بیان ہے کہ ہم آپ

ﷺ کے ساتھ منی میں تھے کہ چاند پھٹ گیا، اور اس کا ایک ٹکڑا حراء کی طرف چلا گیا، آپ نے فرمایا: گواہ رہنا۔

حضرات! حدیث شریف میں آپ کے بے شمار معجزات کا تذکرہ کیا گیا ہے، مکہ مکرمہ میں عمیر بن وہب نے صفوان بن امیہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قتل کا مشورہ کیا، اور رسول اللہ ﷺ کے پاس قتل کے ارادہ سے مدینہ آئے، آپ کے سامنے بیٹھ کر کہا کہ ہم اپنے قیدیوں کو چھڑانے آئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اور صفوان نے مکہ میں بیٹھ کر کیا مشورہ کیا تھا؟ وہ حیران رہ گئے، اور اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کا اقرار کرلیا۔

دلائل النبوۃ میں بے شمار ایسے واقعات ہیں، جن سے اشارہ ملتا ہے کہ درخت نے آپ کی نبوت کی گواہی دی، لکڑی سے رونے آواز آئی، تھوڑا کھانا پوری جماعت کے لئے کافی ہوگیا، تھوڑا پانی پوری جماعت کے لئے کافی ہوگیا، درختوں اور پتھروں نے آپ کو سلام کیا، مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اس درخت کو جانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔

یہ معجزات دراصل آپ ﷺ کی خصوصیات میں داخل ہیں، آپ کے ذریعہ اللہ نے ہدایت کا کام لیا، لیکن آپ ان خوبیوں کے حامل ہونے کے باوجود ہمارے لئے نمونہ ہیں، ایک شخص آپ کے پاس آیا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا، آپ نے فرمایا: ڈرو نہیں، میں ایسی عورت کا لڑکا ہوں جو کچے گوشت کھاتی تھی (سنن ابن ماجہ: ۳۳۱۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لقد جاءكم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رؤووف رحيم.

وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله و صحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی

الحمد للّٰہ رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعهم بإحسان إلی یوم الدین، أمّا بعد، فقد قال اللّٰہ تعالی: "وَمَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (سورۃ الأنبیاء: ۱۰۷) (اے محمد ﷺ! ہم نے آپ کو سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا) وقال تعالی: "فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ، وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَا نۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ. (آل عمران:۱۵۹) (پھر یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ ان کے ساتھ نرم رہے، اور اگر آپ تُندخو، سخت طبع ہوتے تو وہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہوگئے ہوتے)

حضرات! ربیع الاول کا مہینہ گذر رہا ہے، ہر طرف سیرت کے جلسے منعقد ہو رہے ہیں، گویا پوری فضا ذکرِ رسول سے معطر ہے، ربیع کے معنی موسمِ بہار کے ہے، ممکن ہے کہ جب اس مہینہ کو اس نام سے موسوم کیا گیا، اس وقت بہار کی ابتدا ہو رہی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے تو یہ مہینہ حقیقی معنوں میں موسم بہار ہوگیا:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

اسی ربیع الاوّل کے مہینہ میں ولادتِ رسول ہوئی، اسی ربیع الاوّل کے مہینہ میں ہجرتِ نبوی ہوئی، اور اسی ربیع الاول کے مہینہ میں آپ کی وفات ہوئی، اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمۡ مَّيِّتُوۡنَ (آپ کو بھی مرنا ہے، اور انھیں بھی مرنا ہے)، وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ، اَفَاۡئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ (الأنبیاء: ٤) (اور ہم نے آپ سے قبل بھی کسی بشر کو ہمیشگی کے لئے نہیں بنایا تھا، سو کیا اگر آپ کی وفات ہوجائے تو یہ ہمیشہ رہیں گے)

قرآن پاک میں نبی رحمت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد صفات

کا ذکر آیا ہے، یہ صفات اپنی جگہ پر اہم ہیں، لیکن آپ کی سب سے اہم صفت سورۂ انبیاء میں ہے: اے محمد ﷺ! ہم نے آپ کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

وما أرسلناك إلا رحمۃً لِلعالمین!

حضرات! رسول اللہ ﷺ تمام عالم کے لئے رحمت ہیں، اس رحمت میں مکان و مقام کی ہمہ گیری کے ساتھ زمان وزمانہ کی وسعت بھی شامل ہے، اور قیامت تک کے آنے والے عرصے کو محیط ہے، جس طرح اللہ سارے جہاں کا رب ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ پوری دنیا کے لئے رحمت ہیں، اور ان کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہے۔

آپ ﷺ کی رحمتوں کی دو قسمیں ہیں: ایک عمومی سطح کی ہیں، اور دوسرے خصوصی سطح کی۔

عمومی سطح کی رحمتوں میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپؐ نے انسانیت کو ایک اللہ کا تصور دیا ہے کہ خدا کو ایک ماننا بظاہر بہت معمولی بات لگتی ہے، لیکن یہ الحاد و انکار اور شرک و مخلوق پرستی کے مقابلے میں ایک انقلابی عقیدہ ہے، خدا کا انکار کرنے سے بے شمار بیماریاں جنم لیتی ہیں: انسانیت کی تذلیل، توہم پرستی وغیرہ، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بے برکتی اور نحوست کے خطرات سے نجات دلانے والی چیز توحید کا عقیدہ ہے۔ توحید سب سے بڑی عزت اور شرک سب سے بڑی ذلت ہے، ایک اللہ کے سامنے جھک کر انسان ہزار خداؤں سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

رسولِ پاک کی رحمت کا ایک پہلو یہ ہے کہ سارے انسان برابر ہیں، کسی کالے کو کسی گورے پر، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقوی اور خوف خدا کے، زمانہ جاہلیت میں انسان کا درجہ جانوروں سے زیادہ پست ہوگیا تھا، اس کو بے وقعت اور ذلیل تصور کیا جاتا تھا، انسان مختلف خانوں میں بٹا ہوا تھا، خود ہندوستان میں طبقاتی تقسیم کا حال یہ تھا کہ اس کو برہمن، چھتری، ویش اور شودر چار طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا، چاروں طبقات میں زبردست فرق تھا، اگر کسی شودر نے اشلوک سن لیا تو اس کے کان میں سیسہ

پگھلا کر ڈال دیا جاتا، اگر برہمن کے گھر میں پہونچ گیا تو وہ گھر ناپاک ہو جاتا تھا، الغرض ایک دوسرے طبقہ کے درمیان بڑا اختلاف تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ آپ نے انسانیت کو اس کا صحیح مقام یاد دلایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ، وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا." (الإسراء: ۷۰) (ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور دریا میں سواری اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی)۔ سنن بیہقی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ، فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللّٰهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلَى عِيَالِهِ (پوری انسانیت اللہ کا کنبہ ہے، اور اس کے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اور آرام پہنچائے) (بروایت انسؓ)، انسانیت کی بلندی اور خدا سے اس کے قرب و اختصاص کا اظہار اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے جو صحیح مسلم کی ایک حدیث قدسی میں ہے: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا: اے فرزند آدم! میں بیمار ہوا تو مجھے دیکھنے نہیں آیا، بندہ کہے گا: پروردگار! میں تیری عیادت کیا کر سکتا ہوں، تو تو رب العالمین ہے؟ ارشاد ہوگا: کیا تمہیں معلوم نہیں ہوا کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑ گیا تھا تو اگر اس کی عیادت کو جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا ایک مظہر ہے کہ آپ ﷺ نے علم کی حوصلہ افزائی کی، جہالت کو سماج کے لئے خطرہ بتایا، اور پہلی وحی میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی، اور آپ ﷺ نے بلا تفریق و امتیاز علم کو عام فرمایا اور دین و دنیا کے علم کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

آپ ﷺ کی رحمت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ آپ نے دین و دنیا کے درمیان فرق کو ختم کیا، اور عرصے سے قائم دینی اور دنیاوی خلیج کو پاٹ دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ دنیا کے کام اگر نیت کی درستگی کے ساتھ کئے جائیں تو دین بن جاتے ہیں: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا دارومدار نیت پر ہے)۔

غرض حضور اکرم ﷺ کی ذات سراپا رحمت ہے، آپ کے دنیا میں آنے ہی سے بے شمار انقلابات آئے اور تبدیلیاں نمایاں ہوئیں، آپ کو بھیج کر اللہ تعالیٰ نے اس انسانیت پر رحم کیا جس کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، چنانچہ آپ کی ذات کائنات کے ذرہ ذرہ کے لئے رحمت ہے، آپ کی رحمت کا سلسلہ ولادت باسعادت سے شروع ہو گیا، حضرت حلیمہ سعدیہ نے واضح طور پر برکتوں کو محسوس کیا، ان کی اونٹنی بہت تیز چلنے لگی، اور بہت زیادہ دودھ دینے لگی۔ بچپن سے جوانی تک پہونچنے میں آپ ﷺ کی نیکی سچائی کے تذکرے ہونے لگے، ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا خود بیان کرتی ہیں: اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ غریبوں کے کام آتے ہیں محتاجوں کی مدد کرتے ہیں اور پریشان حالوں کا خیال رکھتے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ جو خادم رسول تھے کہتے ہیں: میں نے دس برس آپ ﷺ کی خدمت کی، مگر آپ نے کبھی کسی معاملہ میں باز پرس نہیں فرمائی (شمائل ترمذی)

حضرات! خصوصی رحمتوں میں یہ ہے کہ امت کے ساتھ آپ ﷺ کی ہمدردی یہ تھی کہ آپ ﷺ نے پچاس نمازیں جو آپ پر فرض تھیں ان کو پانچ کرایا، اور شریعت کے بہت سے احکام کی پابندی صرف اس لئے نہیں کی کہ وہ کہیں آپ پر فرض نہ ہو جائیں، تراویح کا معاملہ یہی ہے کہ آپ نے صرف تین دن تراویح کی نماز باجماعت پڑھی، تاکہ یہ آپ پر فرض نہ ہو جائے، بخاری و مسلم میں حضرت عروہ حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ مسجد نبوی تشریف لائے اور جماعت کے ساتھ تراویح پڑھی، صبح ہوئی تو لوگوں کو معلوم ہوا، دوسری رات زیادہ لوگ اکٹھا ہو گئے، اور باجماعت نماز ادا کی، تیسری رات تعداد اور زیادہ ہو گئی، اور سب نے باجماعت نماز پڑھی، چوتھی رات پوری مسجد مصلیوں سے بھر گئی، لیکن آپ تشریف نہیں لائے، اور لوگوں نے تنہا تنہا تراویح کی نماز پڑھی، فجر کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری موجودگی کا مجھے خوب علم تھا، لیکن اس وجہ سے نہیں آیا کہ کہیں وہ فرض نہ ہو جائے، پھر اس کے بعد لوگ تنہا تنہا نماز پڑھنے لگے، سنہ ۱۴ھ میں حضرت عمرؓ نے ایک قاری کے پیچھے سب کو جمع کر دیا (صحیح بخاری)۔

مسواک کے سلسلہ میں فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا: لَوْ لَا أَن أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ (بخاری ومسلم، بروایت ابوہریرۃ)

۲۔ قیدیوں پر رحمت غزوۂ بدر کے واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا، جب کہ اس زمانہ میں قیدیوں کو تہہ تیغ کیا جاتا تھا، آپ ﷺ نے اپنی رحمت کا سایہ ان پر رکھا، اور ان کو بالکل آزاد کر دیا۔

۳۔ بچوں پر آپ ﷺ کی رحمت کا حال یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ بڑی محبت فرماتے تھے، ان کے قریب سے گذرتے، تو خود سلام کرتے، اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، حدیث میں ہے: مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيرِنَا فَلَيْسَ مِنَّا (سنن ابوداؤد: ۴۹۴۵) (جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں)

۴۔ عورتوں کے ساتھ عرب کے لوگ بے دھڑک ظلم کرتے تھے، یونانی ان کو برائی کا دروازہ تصور کرتے تھے، بعض مذاہب میں ان کو نحوست کی علامت سمجھا جاتا تھا، آپ کی رحمۃ للعالمینی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ آپ نے عورتوں کے حقوق قائم فرمائے، اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، اور ایک حدیث میں فرمایا: لوگو! عورتوں کے بارے میں نیکی کی وصیت سنو، اپنی بیویوں کے ساتھ رحم وکرم کا ایسا معاملہ تھا کہ ایک سفر میں حضرت صفیہؓ آپ کے ساتھ تھیں، جب وہ سوار ہونے لگتیں تو آپ اپنا گھٹنا آگے بڑھا دیتے، وہ اس پر پاؤں رکھ کر سوار ہو جاتیں۔

جاہلیت کے زمانے میں بیواؤں سے شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، آپ ﷺ نے جس خاتون سے سب سے پہلے نکاح کیا، وہ بیوہ تھیں اور وہ حضرت خدیجہؓ ہیں، اور کئی بیوائیں اور مطلقہ خواتین آپ کی زوجیت میں تھیں، جن کے ساتھ آپ ﷺ کا معاملہ بڑی نرم دلی کا تھا۔

۵۔ یتیموں پر آپ ﷺ بڑے مہربان تھے، آپ کے لطف وکرم کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ بھی یتیموں کی سرپرستی فرماتے، ہر صحابی کا گھر یتیم خانہ بن گیا تھا، اور ارشاد فرمایا: میں

اور یتیم کی کفالت کرنے والے جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے۔ (مسلم کتاب الزہد، بروایت سہل بن سعد)

۶۔ مزدوروں پر آپ کی رحمت اس حدیث سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کو اس کی اجرت دے دی جائے (أَعْطُوا الأَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ (ابن ماجہ بروایت عبداللہ بن عمر)

۷۔ پوری انسانی برادری پر آپ کی رحمت کا اثر یہ ہے کہ طائف والوں نے جب آپ کے ساتھ غلط سلوک کیا، قدموں کو لہولہان کر دیا، تو آپ نے ان کے ساتھ اچھا معاملہ کیا اور رحمت کی دعاء کی۔ فتح مکہ کے موقع پر تمام مکہ والوں کی عام معافی کا اعلان کر دیا، حضرت عثمانؓ بن طلحہ ایک غیر مسلم ہیں، مکہ کے رہنے والے ہیں، خانہ کعبہ کی چابی ان کے پاس ہے، مکی دور میں آپ ﷺ نے ان سے مانگا تو انہوں نے انکار کر دیا، فتح مکہ کے موقع پر وہ خوف وہراس میں مبتلا تھے، اور سوچ رہے تھے کہ آج میرے ساتھ بہت سخت معاملہ کیا جائے گا، لیکن قربان جایئے آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی پر، آپ نے نہ صرف ان کو معاف کیا، بلکہ قیامت تک کے لئے کعبہ کی چابی ان کے حوالہ کی (زاد المعاد مؤلفہ ابن قیم) سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اس حسن اخلاق اور بہترین برتاؤ کی وجہ سے حضرت عثمان بن ابی طلحہ نے فوراً اسلام قبول کر لیا: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ.“

آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
کوئی آیا نہ مگر، رحمت عالم بن کر

آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ایک روز ایک درخت پر تلوار لٹکا کر اس کے سایہ میں آپ سو رہے تھے کہ غورث بن حارث اُدھر سے گذرا، اس نے چپکے سے آپ ﷺ کی تلوار اتار لی، اور اسے کھینچ کر آپ کو جگایا، اور بولا: اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا: اللہ! غورث پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی، آپ ﷺ نے وہ تلوار لے لی اور ارشاد فرمایا: اب تم کو کون بچا

سکتا ہے؟ غورث سے کچھ نہ بن پڑا، آپ ﷺ نے اسے معاف کردیا (سنن بیہقی بروایت حضرت جابر، بخاری ومسلم)

۸۔ جانوروں پر آپ ﷺ بڑے رحیم تھے، عرب کی جاہل اور ان پڑھ قوم جانوروں کے حق میں بڑی بے دردتھی، عرب زندہ اونٹ کی پیٹھ سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیا کرتے تھے، جانوروں کو کھڑا کر کے تیز اندازی کی مشق کرتے تھے، جانوروں کا خون بھی پیا جاتا تھا، آپ ﷺ نے ان تمام باتوں کو حرام کردیا۔

آپ ﷺ کی رحمت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ایک مسافر کو شدید پیاس محسوس ہوئی، پانی کا کہیں وجود نہ تھا، بڑی مشکل سے ایک کنواں ملا، اس میں اترا اور پانی پی لیا، پھر کنویں سے نکل آیا، جب وہ باہر آیا تو اس کی نظر ایک کتے پر پڑی جو پیاس سے مر رہا تھا، وہ دوبارہ کنویں میں اترا، اور اپنے موزے میں پانی بھر کر لایا اور اس کتے کو پلا دیا، یہ بات اللہ کو اتنی پسند آئی کہ اس مسافر کو بخش دیا، صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ کیا کتوں کے ساتھ ہمدردی کرنے پر بھی اجر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، ہر جاندار کے ساتھ حسن سلوک میں اجر ہے۔ (بروایت حضرت ابوھریرۃ، بخاری ومسلم)

۹۔ شجرکاری کرنا کتنا اچھا کام ہے، آج کل حکومتیں اس پر زور دے رہی ہیں، آپ ﷺ نے چودہ سو سال پہلے درخت لگانے کو پسند کیا، اور اسے ثواب کا کام بتایا، ایک حدیث میں ہے کہ جس مسلمان نے کوئی درخت لگایا، اور اس کے پھل سے کسی جانور یا انسان نے کھایا تو یہ لگانے والے کے لئے صدقہ ہے (مسلم بروایت جابر)

یہ چند نمونے تھے، جو رسول اللہ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کے پیش کئے گئے۔ ضرورت ہے کہ اس صفت کو اپنے اندر منتقل کیا جائے، آپ ﷺ کو ربیع الاول کے مہینہ میں صحیح خراج عقیدت اسی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ ہر انسان خواہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا نوجوان اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لے، اور اسی کے مطابق اپنی زندگی گذارے۔ وصلی الله تعالی علی خیر خلقه محمد وعلی آله و صحبه و سلم.

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمین

خیر البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

انسانیت نوازی کے چند نمونے

الحمد للّٰه ربّ العالمین، والصّلاة والسّلام علی سیّد الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد: فأعوذ بالله من الشیطان الرجیم، بسم الله الرحمن الرحیم. قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَّاحِدٌ، فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَداً (الکهف: ۱۱۰)

(آپ کہہ دیجئے کہ میں تو بس تمہارے ہی جیسا بشر ہوں، میرے پاس تو بس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا ایک ہی معبود ہے، سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ نیک کام کرتا رہے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے)

محترم حضرات! آٹھویں صدی کے ایک بزرگ ہیں، جن کا نام جلال الدین رومیؒ ہے، ان کا بیان ہے کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ایک دن لالٹین لے کر دن کی روشنی میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے، لوگوں نے پوچھا: حضرت! دن کے اجالے میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ کہنے لگے: میں جانوروں اور چوپاؤں کی درمیان رہتے رہتے اکتا گیا ہوں، اب میں مکمل انسان کی تلاش میں نکلا ہوں، لوگوں نے کہا: جس انسان کو آپ تلاش کر رہے ہیں، اس کا ملنا محال ہے، بزرگ نے فرمایا: جو چیز ناممکن ہوتی ہے اسی کی تلاش میں میں زیادہ رہتا ہوں۔

اس روئے زمین پر مکمل اور کامل انسان اگر کسی کو کہا جاسکتا ہے، تو وہ انبیاء کرام

ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے بگڑی دنیا کو بنانے کے لئے بھیجا، اخیر میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اس لئے آپ کو صرف کامل ہی نہیں، بلکہ اکمل بنایا گیا، اور جو خصوصیات انبیاء کرام کی الگ الگ تھیں وہ آپ کی ذات گرامی میں جمع کردی گئی، یہی وجہ ہے کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہا:

حسن یوسف ، دم عیسی ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ، ہمہ دارند تو تنہا داری

حضرات! انبیاء کا کام صرف پیغام پہونچانا نہیں، جس طرح ڈاکیہ خط پہونچا دیتا ہے، اور فارغ ہوجاتا ہے، بلکہ انبیاء کا کام ہر چھوٹی بڑی چیز میں نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جہاں ایک طرف اللہ کی تعلیمات لوگوں کو بتائیں ، وہیں دوسری طرف اس کو عملی شکل میں پیش کر کے دکھایا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے فرشتوں کو نبی یا رسول بنا کر نہیں بھیجا، کیونکہ فرشتوں کا کام صرف عبادت کرنا ہے، دنیا کے کاموں سے ان کا کوئی سروکار نہیں، لیکن نبی انسانوں کی طرح رہتا ہے، کھاتا، پیتا ہے، شادی بیاہ میں شریک ہوتا ہے، اور ایک دوسرے سے ملتا ہے اور ان کی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے۔

لیکن تمام انبیاء میں نمونہ کے لائق اور قابل تقلید کوئی سیرت ہے تو وہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے، کیونکہ یہی آخری بھی ہے، محفوظ بھی ہے اور زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ بھی کرتی ہے، آپ کے ذریعہ ظاہر ہونے والے معجزات کی ایک لمبی فہرست ہے، اور یہ معجزات آپ کی نبوت کی دلیل ہیں، لیکن معجزات کی ضرورت ان کے لئے ہے جو رسول اللہ کی رسالت کے ثبوت کے لئے ہیں، معجزہ اس عجیب وغریب عمل کو کہا جاتا ہے، جو اللہ تعالی انبیاء کو عطا فرماتے ہیں، اگر انبیاء سے کوئی عجیب وغریب چیز ظاہر ہو تو وہ معجزہ ہے، اور اگر کسی ولی یا بزرگ سے ظاہر ہو تو وہ کرامت ہے، تو قرآن میں بہت سے پیغمبروں کے معجزات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

معجزات تو آپ ﷺ کی خصوصیات میں ہیں، لیکن دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے انسان کی حیثیت سے ہمارے لئے بہترین نمونہ چھوڑا، نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی، حلف الفضول نامی معاہدہ میں شرکت اور کعبہ کی تعمیر کے وقت اس کے مسئلہ حجر اسود کو حل کرنا، لوگوں کے درمیان ایسی شفاف زندگی گذارنا کہ کوئی آپ کی عزت وآبرو پر انگلی نہ اٹھا سکے، مدنی زندگی میں پہونچ کر آپ نے سب سے پہلے معاہدہ کیا کہ مدینہ کے آس پاس رہنے والے تمام قبائل ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اور کسی پر ظلم نہ ہونے دیں گے، اور فتح مکہ کے موقع پر اعلی انسانی قدروں کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کردیا۔

انسانیت نوازی: چند مثالیں

انسانی عزت وشرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن پہلا فیصلہ خون کے سلسلہ میں ہوگا (بخاری) اور صحیح بخاری ہی کی روایت ہے کہ جس نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکتا، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جائے گی، بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گذرا، آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے، فورا کھڑے ہوگئے، آپ ﷺ سے کہا گیا: یہ تو یہودی کا جنازہ تھا، فرمایا: کیا اس میں جان نہیں تھی؟

انسان جس طرح زندگی میں محترم رہتا ہے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی محترم رہتا ہے، مُردوں کی خوبیوں کو بیان کرنا اور ان کی خامیوں سے صرف نظر کرنا یہ اسلام کا حصہ ہے، بخاری شریف کی روایت ہے: مردوں کی خوبیوں کو بیان کرو، اور ان کی خامیوں سے چشم پوشی کرو۔ ترمذی شریف میں ہے کہ پوری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے خون کے مقابلہ میں ارزاں ہے۔

آج کل ایسا بہت ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی ٹینشن تھا، کسی پریشانی میں وہ مبتلا ہوا، طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی، پھر اس نے خودکشی کرلی، بخاری میں ہے کہ جس نے

پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی وہ جہنم کی آگ میں چلا جائے گا، اور ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم میں چھلانگ لگاتا رہے گا، جس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی، قیامت کے دن اس کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ ہوگا، اور جس نے چھرا گھونپ کر خودکشی کر لی اس کا چاقو اس کے ہاتھ میں رہے گا اور جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیش وہ اپنا پیٹ چاک کرتا رہے گا۔

آج کل بدگمانی ایک عام چیز ہوگئی ہے، اس میں بڑے بڑے لوگ مبتلا ہیں، جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بدگمانی سے روکا، اور فرمایا: اچھا گمان رکھنا بھی اچھی عبادت ہے (سنن ابوداود) اور یہ بھی فرمایا: تین چیزیں ہر انسان میں پائی جاتی ہیں: بدگمانی، حسد اور براشگون۔ یہ تینوں چیزیں انسان میں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے ان تینوں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

انسان اس وقت تک مکمل انسان ہو ہی نہیں سکتا، جب تک وہ اپنی انسانیت پر قائم نہ رہے۔

انسانیت میں سب سے پہلی چیز رحم وکرم ہے، سنن ابوداؤد کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، اللہ تمہارے اوپر رحم کرے گا۔

رشتوں کو جوڑنا عبادت ہے، صلہ رحمی اس کا نام نہیں کہ بدلہ میں انسان رحم کرے، بلکہ حقیقی صلہ رحمی یہی ہے کہ آپ اس سے تعلق جوڑتے رہیں، جو اسے توڑتا رہتا ہے۔ (بخاری) عمر میں اضافہ اور رزق میں برکت صلہ رحمی ہی سے آتی ہے۔

اچھی انسانی صفات میں کسی کی مدد کرنا، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا بیماروں کی عیادت کرنا وغیرہ وغیرہ امور ہیں۔

انسانی سلوک کا معاملہ میدان جنگ میں بھی تھا، میدان جنگ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ اسی سے لڑنے کا حکم فرماتے تھے جو لڑنے کی ابتدا کرے، بوڑھوں، بچوں اور

عورتوں پر ہاتھ اٹھانے سے منع فرماتے، دشمن کے لئے بددعا کرنے کا معمول نہیں تھا، طائف کے موقع پر بددعا کے بدلہ دعا نکلی: اے اللہ! طائف والوں کو ہدایت دے، اور ان کو اسلام کے آستانہ پر جھکا دے (سیرت ابن ہشام)

عکرمہ ابوجہل کے بیٹے ہیں، اسلام، مسلمانوں اور خود رسول اللہ ﷺ کے سب سے بڑے دشمن، مکہ فتح ہوا تو ان کو اپنا جرم یاد آیا، وہ یمن بھاگ کر چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں، وہ حضرت رسول اللہ ﷺ کی انسانیت نوازی پہچان چکی تھیں، وہ خود یمن جاتی ہیں اور عکرمہ کو تسکین دے کر مدینہ لاتی ہیں، حضور ﷺ کو ان کی آمد کی خبر ہوتی ہے تو ان کے استقبال کے لئے آگے اس تیزی سے بڑھتے ہیں کہ جسم مبارک پر چادر تک نہیں ہوتی، پھر جوش مسرت میں فرماتے ہیں: اے مہاجر سوار! تمہارا آنا مبارک ہو۔

ثمامہ بن اثال رسول اللہ ﷺ کے بڑے دشمن، بنوحنیفہ کے سردار قیدی بنا کر مدینہ لائے جاتے ہیں، تین دن مسجد نبوی کے ستون سے بندھے رہتے ہیں، مدینہ کا ماحول دیکھتے ہیں، اخلاق رسول ﷺ سے متأثر ہوتے ہیں، تین دن کے بعد خود ہی قریب کے ایک کھجور کے باغ میں جا کر غسل کرتے ہیں، اور آ کر اسلام کا کلمہ پڑھ لیتے ہیں (سنن ابوداود)۔

یہ رسول اللہ ﷺ کی انسانیت نوازی کے نمونے ہیں، جن کا سرسری تذکرہ کیا گیا۔ ضرورت ہے کہ ان اوصاف وخصوصیات کو اپنے اندر منتقل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ توفیقات سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلم وداعی

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين أما بعد : فقد قال الله تعالى : أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِىْ الْاُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ. (الجمعة : ٢)

(وہی تو ہے جس نے امی لوگوں میں انھیں میں سے ایک پیمبر بھیجا، جوان کو آیتیں پڑھ کرسناتا ہے،اورانھیں پاک کرتا ہے،اورانھیں کتاب اورحکمت کی باتیں سکھاتا ہے، جب کہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے)

محترم حضرات ! پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں ہیں،لیکن دوحیثیتیں ایسی ہیں جن کا قرآن پاک میں بار بار ذکر آیا ہے،ایک آپؐ کے داعی ہونے کی ، دوسرے آپؐ کے معلم ہونے کی، آپؐ کی داعیانہ حیثیت کو اللہ نے داعی، بشیر ونذیر، شاہد وغیرہ الفاظ سے ذکر کیا ہے،اسی طرح آپؐ کے معلم ہونے کے پہلو کو بھی بار بار واضح فرمایا گیا ہے،آپ امت پر آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے ہیں، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں،اوراُن کا تزکیہ فرماتے ہیں،آپ کی ذمہ داریوں میں کتاب اللہ کی تفسیر وتوضیح ہے. یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معلمانہ صفات ہیں:

سننِ ابنِ ماجہ کی روایت ہے: حضرت عبداللہ عمرو بن العاصؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجدِ نبوی میں آئے تو وہاں حلقے لگے ہوئے تھے، ایک حلقہ قرآن کی تلاوت اور دعا میں مشغول تھا، دوسرا حلقہ تعلیم وتعلم میں، آپؐ نے فرمایا: تم سب

اچھے کام میں ہو، یہ لوگ قرآن کی تلاوت اوراللہ تعالیٰ سے دعا کررہے ہیں، اللہ چاہیں گے تو انھیں عطا فرمادیں گے، اور دوسرا گروہ سیکھنے اورسکھانے میں مشغول ہے، میں تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مُعنِّت اور مُتعنِّت یعنی مشقت میں ڈالنے والا اور دوسروں کو تکلیف پہونچانے کا خواہشمند بنا کرنہیں بھیجا گیا، آپؐ کا سلوک اپنے رفقاء کے ساتھ شفقت ومحبت کا تھا، ہمدردی اور خیر خواہی اورنرم خوئی کا تھا، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ شمع رسالت کے پروانے کی طرح آپ پر گرتے تھے، اور آپ کی آتش محبت میں جلنے سے اُن کو ایسا لطف آتا تھا کہ اُن کے نزدیک تمام لذتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔

حضرات! تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں دوواقعات سماعت فرمائیں:

۱۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت معاویہ بن حکمؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، اسی درمیان ایک شخص کو چھینک آئی، میں نے نماز ہی میں کہا: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، لوگ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگے، میں نے کہا: کیا بات ہے؟ سب مجھے چپ کرانے لگے، میں خاموش ہوگیا، میرے ماں باپ قربان ہوں، میں نے آپ نے جیسا معلم اورمربی نہیں دیکھا، خدا کی قسم! نہ آپ نے مجھے جھڑکا اور نہ مارا اور نہ ملامت کی، اور فرمایا کہ نماز میں عام انسانی کلام نہیں کیا جاسکتا، اس میں تو اللہ کی تسبیح کرنی ہے، اللہ کی کبریائی بیان کرنی ہے اورقرآن مجید کی تلاوت کرنی ہے۔

۲۔ بخاری کی روایت ہے، حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، ایک شخص کھڑا پیشاب کرنے لگا، صحابہؓ اُس کو روکنے کے لئے آگے بڑھے، آپ نے کہا: اُس کو چھوڑ دو، کچھ مت کہو، اور پیشاب کرلینے دو، جب وہ پیشاب کرچکا تو آپ نے اس کو بلایا اوراس سے محبت ونرمی سے کہا: یہ مسجد ہے اوراس میں پیشاب کرنا منع ہے۔

مسندِ احمد کی روایت ہے کہ ایک نوجوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اجازت دے دیجئے، لوگوں کو اس کی بات پر بہت غصہ آیا، لیکن آپؐ نے اس سے فرمایا: میرے قریب آؤ، جب وہ آیا، تو آپ نے اس سے کہا: کیا تم اپنی ماں کے ساتھ یہ حرکت کرنا پسند کروگے؟ اس نے کہا: خدا کی قسم! بالکل نہیں، آپ نے فرمایا: دوسرے لوگ بھی اپنی ماں کے ساتھ یہ پسند نہیں کریں گے۔ پھر فرمایا کہ کیا اپنی بیٹی کے ساتھ یہ حرکت کرنا پسند کروگے؟ اس نے کہا: نہیں۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے نفسیات کا لحاظ فرماتے ہوئے نصیحت فرمائی۔

حضرات! آپؐ بحیثیت داعی قوم کے لئے بھیجے گئے تھے، آپ نے اپنی عمر کے چالیسویں سال دعوت کا آغاز کیا، خود بھی عمل کیا، اہل خانہ کو سب سے پہلے دعوت دی، اہل محلّہ کو دعوت دی، اور پورے شہر کو دعوت کا موضوع بنایا، قریب کے شہر طائف بھی گئے، ۴۵۰ رکیلومیٹر مدینہ منورہ کا سفر بھی کیا، اس سے پہلے مکہ کے دعوتی مراکز، خانہ کعبہ، دارِارقم بن ارقم، اسواقِ مکہ منیٰ وغیرہ بھی جا کر دعوت کا کام کرتے تھے، دعوت کا اثر ظاہر ہوا، شروع میں پانچ افراد تھے، بدر میں تین سو تیرہ ہوئے، احد میں سات سو نے شرکت کی، خندق میں تین ہزار، فتح مکہ میں دس ہزار، حنین میں بارہ ہزار اور تبوک میں تیس ہزار اور حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چوبیس ہزار لوگوں نے شرکت کی اور آپ کے سامنے حق کی گواہی دی۔

اس طرح آپ نے دعوت کے ذریعہ دلوں کو فتح کیا، قرآن کریم نے کہا ہے: "فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ." (سورۂ ق:۴۵) (سو آپ قرآن کے ذریعہ نصیحت کرتے رہئے اسے جو میری وعید سے ڈرتا ہو) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ." (النحل: ۱۲۵) (آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلایئے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے، اور ان کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقے سے۔)

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

اسوۂ حسنہ اور پیغامِ عمل

(مکی دور)

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيّد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد: فقد قال الله تعالى: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (الأحزاب: ۲۱) حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ (موجود) ہے۔

حضرات! قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے، یعنی یہ انسانی زندگی کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے، گویا آپ کی زندگی ایک آئینہ ہے، جس میں ہر انسان اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے، وہ ایک مشعلِ راہ ہے جس سے زندگی کی تیرہ وتاریک رہگذر میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، انسان اپنی شخصی زندگی اور معاشرتی زندگی میں آپؐ کو نمونہ بنا کر دشواریوں کو آسان بنا سکتا ہے۔

مکی دور کے چند واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کا ذکر کیا جارہا ہے:

☆ یمن کے قبیلہ بنو زبید کا ایک شخص تجارت کے ارادہ سے مکہ آیا، مکہ کے ایک شخص عاص بن وائل نے اس شخص سے ایک سامان خریدا اور سامان کی قیمت ادا کرنے سے انکار کیا، زبیدی نے بارہا کوشش کی اور مکہ کی بااثر شخصیتوں سے ربط کیا، لیکن کسی نے کان نہیں دھرا، آخر کار اس شخص نے عربوں کے قدیم طریقہ کے مطابق ٹھیک طلوع آفتاب کے وقت بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد کی، اس فریاد نے عربوں کو چونکا دیا، زبیر بن عبد المطلب اٹھے، اور مکہ کے شریف لوگوں کو عبداللہ بن جدعان کے گھر میں

جمع کیا، اور طے کیا کہ ہم کسی شخص پر ظلم نہیں ہونے دیں گے، چنانچہ عاص بن وائل سے اس کا سامان واپس لیا گیا، اور زبیدی کے حوالہ کیا گیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر بیس سال تھی ۔ قدرتی بات یہ کہ اس معاہدہ میں تین آدمی شریک ہوئے تھے: جن کا نام فضل تھا، اس لئے اس کو حلف الفضول کہا گیا، (تین فضل نام کے افراد کا معاہدہ) نبوت کے بعد آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا (البدایۃ والنھایۃ :۲/۹۱۔۲۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ سماج سے ظلم وستم کو دور کرنا، مظلوموں کی دادرسی کرنا، اور کمزوروں کو انصاف دلانا رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اور مؤمن کا فریضہ ہے، مسلمانوں کے لئے یہ بات صرف کافی نہیں کہ وہ خود اپنی حفاظت کرلیں، اور سماج میں دوسرے طبقات پر جو بھی ظلم وزیادتی ہو، اس پر خاموش تماشائی بنے رہیں۔

☆ جب آپ ﷺ کی عمر پچیس سال کی ہوئی تو مکہ کی ایک شریف اور سرمایہ دار خاتون حضرت خدیجہؓ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ ان کا مال لے کر شام جائیں، اور تجارت کریں، نفع ونقصان میں دونوں شریک ہوں گے، حضرت خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو بھی ساتھ کردیا، آپ نے شام کا سفر فرمایا، اور یہ تجارت اتنی نفع بخش ثابت ہوئی کہ سرمایہ دوگنا ہوگیا، دوسری طرف میسرہ نے حضرت خدیجہ سے آپ ﷺ کی سچائی، امانت ودیانت اور پاکیزہ کردار کا بھی تذکرہ کیا، اس سے متأثر ہوکر حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کو نکاح کا پیغام دے دیا۔

اس واقعہ سے تجارت میں اور کاروبار میں امانت ودیانت کا سبق ملتا ہے، خیانت انسان کو وقتی فائدہ پہونچاتی ہے، لیکن زیادہ نقصان اور آخرت کی پکڑ اس کے سوا ہے، حضرت خدیجہؓ عرب کی ایسی سرمایہ دار خاتون تھیں کہ عرب کے رؤساء ان سے شادی کے خواہشمند تھے، لیکن یہ آپ ﷺ کی دیانت ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ

کے قدموں میں ڈال دیا۔

☆ کعبہ کی عمارت نشیبی زمین میں تھی، جب بارش ہوتی تو چاروں طرف پانی ہوتا، اس کی وجہ سے اس کی دیواریں منہدم ہوگئی تھیں، اہل مکہ نے اس کی تعمیر کا ارادہ کیا، اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۳۵/سال تھی، کعبہ کی تعمیر ہوگئی، لیکن حجر اسود رکھنے کی بات اختلاف کا باعث ہوئی، قریش کے ایک بزرگ شخص امیہ بن مغیرہ نے اس کو اس طرح حل کیا کہ کل سب سے پہلے جو کعبہ میں داخل ہو وہ فیصلہ کرے، صبح سویرے سب سے پہلے پہونچنے والی شخصیت آپ ﷺ کی تھی، لوگ آئے اور کہنے لگے: هٰذَا الْأَمِيْنُ رَضِيْنَا (المستدرک علی الصحیحین، کتاب المناسک: ۱۷۲۶) (اس امانتدار آدمی کے فیصلہ سے ہم خوش ہیں)، پھر آپ نے ایک چادر منگوائی، اور اپنے ہاتھ سے اس میں حجر اسود رکھا، اور مختلف قبائل کے نمائندوں کو طلب فرمایا اور چاروں طرف اس چادر کو تھامنے کے لئے کہا، اس طرح وہ بیت اللہ کے قریب لے گئے، پھر آپ ﷺ نے اس کو اپنے ہاتھ سے صحیح جگہ پر نصب فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر سماج میں اختلاف ہوجائے تو کس طرح خوش تدبیری سے اس کو رفع کرنا چاہئے، اور یہ کوشش کرنی چاہئے کہ مختلف طبقات کی دلجوئی ہو۔

☆ ابوطالب آپ ﷺ کے چچا تھے، بڑے محسن اور مددگار تھے، لیکن معاشی اعتبار سے ان کی حالت بہتر نہیں تھی، اولادیں کئی تھیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے چچاؤں سے مشورہ کیا، حضرت عباس اس کے لئے تیار ہوگئے۔ ابوطالب کے تین لڑکے تھے: عقیل، جعفر، علی، عقیل کے بارے ابوطالب نے کہا کہ وہ تو ہمارے پاس رہیں گے، جعفر کو حضرت عباس نے لے لیا، اور علی کو حضرت رسول اللہ ﷺ نے، اس طرح ابوطالب کا بوجھ کم ہوگیا۔

معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے رشتہ داروں اور قرابت داروں کی فکر کرنی چاہئے اور تعاون کرنا چاہئے، ان کے کسی بچے کی تعلیم کا انتظام نہ ہو رہا ہو تو اس میں دلچسپی لینی چاہئے۔

☆ جب آپ ﷺ نبوت سے سرفراز کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ گھر

والوں سے دعوت دین کا آغاز کریں، (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ) تو آپ نے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو کھانے پر مدعو کیا، لوگ جمع ہوئے، سب نے کھانا کھایا، پھر آپ نے ان کے سامنے دعوت اسلام پیش کی، ابولہب نے سختی سے انکار کیا، دوسرے لوگ خاموش رہے، ایک کم سن نوجوان نے ساتھ دینے کا اعلان کیا، یہ حضرت علیؓ تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعوت وتبلیغ اور اصلاح کا کام اپنے قریبی لوگوں سے شروع کرنا چاہئے، دوسری بات یہ کہ تبلیغی اور اصلاحی مقاصد کے لئے کھانے وغیرہ کا انتظام کوئی برا نہیں ہے، بلکہ بہتر ہے، اس سے طبیعتیں مانوس ہوتی ہیں، پھر حق بات ان کے سامنے رکھنا آسان ہوتا ہے۔

مکہ مکرمہ میں ایمان لانے والے ایمان لا رہے ہیں تو ان کو زدوکوب کیا جا رہا ہے، حضرت بلالؓ کو رسیوں میں باندھ کر گھسیٹا جا رہا ہے، حضرت خبابؓ کو سلگتے کوئلوں پر لٹایا جا رہا ہے، حضرت سمیہؓ کو شہید کیا جا رہا ہے، حضرت ابوبکرؓ کو بری طرح سزا دی جا رہی ہے، خود آپ ﷺ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈالی جا رہی ہے، ایسے موقع پر صبر کی تلقین کی جا رہی ہے۔

اس معلوم ہوا کہ ہر کام کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہئے، وقت سے پہلے کوئی کام کرنا نفع پہونچانے کے بجائے مضر ہو جاتا ہے، جذباتیت اور اشتعال سے بھی بچنا چاہئے، اس سے انسان اپنے پورے وجود کو نقصان پہونچاتا ہے۔

☆ مکی دور کا سب سے صبر آزما واقعہ طائف والوں کا سلوک ہے، طائف والوں نے جسمانی تکلیفوں کے ساتھ ذہنی تکلیفیں پہونچائیں، اس موقع پر آپ نے رقت آمیز دعا کی، جس کے لفظ لفظ میں اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کرنے کا جذبہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ داعی کو کتنے ہی ہمت شکن حالات پیش آئیں، ہمت نہیں ہارنی چاہئے، اور نہ مایوس ہونا چاہئے، بلکہ اللہ سے لو لگانا چاہئے اور تعلق مضبوط کرنا چاہئے۔

نبوت کے تیرہویں سال جب آپ کی عمر ۵۳ سال تھی، آپ نے ہجرت فرمائی،

ہجرت سیرت نبوی کا اہم تاریخی موڑ ہے، چونکہ آپ ﷺ سچے اور امانت دار تھے، اس لئے مشرکین مکہ نے اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوائیں تھیں، ہجرت کے موقع پر یہ ساری امانتیں حق داروں کے پاس پہونچانے کا اہتمام کیا، معمول کا راستہ چھوڑ کر سفر کیا، نشانات قدم مٹاتے گئے، اور غار ثور میں تین روز قیام کرنے کے بعد مدینہ کے لئے روانہ ہوئے، اور اونٹنی کے بارے میں کہا کہ یہ جہاں رکے گی، وہیں قیام ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑے تو کوئی تکلف نہیں ہونا چاہئے، ایک علاقہ کو چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں جانا جہاں دین کے پھیلنے اور اس پر عمل کرنے کے زیادہ مواقع ہوں ایک داعی قوم کا مزاج ہونا چاہئے، دوسری بات یہ کہ حالات نرم ہوں یا گرم امانت ان کے حقداروں تک ضرور پہونچانی چاہئے، تیسری بات یہ کہ راستہ غیر مشہور اختیار کیا جائے، تا کہ دشمن پکڑ نہ سکیں، اس سے معلوم ہوا کہ حکمت عملی حالات کے لحاظ سے بدلنی چاہئے، اور آپ ﷺ نے سواری کو با اختیار بنایا، تا کہ سارے ساتھیوں کی دلداری ہو سکے۔

حضرات! رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اسوہ حسنہ کہنا کسی عقیدت اور خوش عقیدگی کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور ثابت شدہ واقعہ ہے، آج کے ماحول میں جبکہ مسیحی ماڈل کا نعرہ لگایا جا رہا ہے، اسوۂ حسنہ کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ حسنہ ہے، کاملہ نہیں ہے، ایسے موقع پر ضرورت ہے کہ ہم اسوۂ حسنہ کی عصری معنویت اور افادیت کو سمجھیں اور اس کو قابل عمل بنائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

اسوۂ حسنہ اور پیغام عمل

(مدنی دور)

الحمد لله رب العالمین ، والصلاة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آله و صحبه ومن تبعهم باحسان الی یوم الدین، أما بعد : فقد قال الله تعالی : "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ." (الأحزاب : ۲۱)

حضرات! اسوۂ حسنہ کا ایک اہم دور مدنی زندگی ہے، یہ پورے دس سال پر مشتمل ہے، اس وقت اختصار کے ساتھ انہی دس برسوں کے اہم واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج و پیغامات کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

☆ مدینہ والوں کو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کی اطلاع مل چکی تھی ، چنانچہ وہ روزانہ آپ کے استقبال کے لئے مدینہ کی سرحد پر صبح سویرے آجاتے اور چاشت کے وقت انتظار کرکے واپس چلے جاتے ، ایک دن ایسے ہی انتظار کرکے جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے (جو اپنے باغ میں کام کررہا تھا) رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، اور آواز دی کہ اے مدینہ والو! جس کا تمہیں انتظار تھا وہ آگئے ، مدینہ والے پانچ سو افراد کے ساتھ آپ کے استقبال کے لئے نکلے، نعرۂ تکبیر سے پورا مدینہ گونج اٹھا: اللّٰہ أکبَرُ ، جاء رَسُولُ اللّٰہ، اللّٰہ أکبرُ جاء مُحَمَّدٌ (اللہ بہت بڑا ہے، اللہ کے رسول تشریف لائے ، محمد ﷺ آئے ہیں) مدینہ کی بچیاں یہ قصیدہ گنگنا رہی تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا   مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا   مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ
أَیُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِیْنَا   جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

(پہاڑی کے اس موڑ سے جہاں سے قافلے رخصت ہوتے ہیں ، چودھویں رات کا چاند طلوع ہوا، جب تک اللہ کا نام لینے والے افراد موجود ہیں ہم پر شکر گذاری ضروری ہے، اے وہ ذات پاک جس کو ہمارے درمیان بھیجا گیا ہے آپ ایسا حکم لے کر آئے جو قابل اطاعت ہے)

مدینہ منورہ پہونچ کر سب سے پہلے آپ نے مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں بات کی، آپ کا قیام ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں تھا، گھر کے سامنے خالی جگہ تھی، معلوم ہوا کہ یہ دو یتیموں کی ہے، ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول مسجد کے لئے اس جگہ کے خواہاں ہیں، تو ان لوگوں نے راہ خدا میں بلا قیمت دینا چاہا، لیکن آپ ﷺ نے اس زمین کو قیمت سے حاصل کی اور مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہوئی، جس میں آپ نے خود صحابہ کرامؓ کے ساتھ کام کیا۔

مدینہ کو یثرب کہا جاتا تھا ، یثرب ارم بن سام بن نوح کی اولاد میں تھے، اور یہاں آکر آباد ہوئے تھے، اس لئے یثرب کے نام سے جانا جاتا تھا، آپ ﷺ نے اس کا نام مدینہ رکھا، اور یثرب کے نام سے پکارنے سے منع فرمایا، نام بدلنے کی ایک وجہ یہ بھی ذکر کی جاتی ہے کہ یثرب کے معنی مذموم ہیں ، جس سے خوف اور ہلاکت کے معنی نکلتے ہیں، اس لئے اس لفظ کے استعمال سے روکا گیا۔

اس تفصیل سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ مہمان کا استقبال کرنا اچھا عمل ہے، اور جتنا بڑا مہمان ہو، اس کا استقبال اسی شان سے ہونا چاہئے۔

۲۔ کسی نئی جگہ پر پہنچ کر اپنا گھر بنانے سے پہلے مسجد کی فکر کرنا چاہئے، اور اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔

۳۔ معاشرہ میں کوئی نام ایسا ہو جس سے خراب معنی نکلتے ہوں تو اس کو بدل دینا چاہئے۔

☆ ہجرت کے دوسرے سال بدر کی لڑائی پیش آئی، اس میں ستر دشمن مارے گئے

اور ستر قید کئے گئے، قیدیوں کے ساتھ یہ نظام بنا کہ جو مالدار ہیں وہ فدیہ دے کر آزاد ہوسکتے ہیں، اور جو علم والے ہیں ہو وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر علم کی بڑی اہمیت ہے، سکھانے والے کافر تھے، ظاہر ہے کہ انہوں نے دین کا علم نہیں سکھایا، پس جو بھی علم ہو، اگر وہ نافع ہے تو غنیمت سمجھنا چاہئے، اور دشمنوں سے بھی حاصل کرنا چاہئے، اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے کہا: انگریزی پڑھئے، لیکن انگریزیت سے دور رہئے۔

☆ تیسرے سال احد کی لڑائی پیش آئی، اس میں مسلمانوں کی تعداد سات سو اور دشمنوں کی تعداد ۳۰۰۰ رتھی، اس میں رسول اللہ ﷺ کی بعض باتوں کی غیر شعوری طور پر خلاف ورزی کی وجہ سے مسلمان جیتی ہوئی جنگ ہار گئے، آپ ﷺ کے مبارک دانتوں کو شہید کیا گیا، حضرت حمزہؓ کو شہید کیا گیا، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو شہید کیا گیا، بلکہ ستر صحابہ شہید ہوئے، ایسے سخت حالات میں آپ ﷺ صبر، نماز اور دعاء میں مشغول رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حالات خواہ کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں، مایوسی نہیں ہونی چاہئے، امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، یہ ہے وہ نبوی تعلیم جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

☆ غزوۂ خندق سنہ ۵ ہجری میں پیش آیا، اس میں دشمنوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے تمام عرب کے قبائل کو جمع کر لیا، اور مدینہ پر چڑھائی کرنے کا منصوبہ بنایا، اس موقع سے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کے مطابق ایک خندق کھودی گئی، جو پانچ ہزار ہاتھ لمبی تھی، اور ہر مسلمان کے حصہ میں چالیس ہاتھ خندق کھودنا لازمی تھا، خندق کھودی گئی، تقریباً ایک مہینہ تک دشمن مقابلہ پر رہے، بالآخر انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔

معلوم ہوا کہ اسلام کے غلبہ کے لئے جائز تدبیر اختیار کرنا اچھا عمل ہے، جس طرح خندق کھود کر آپ ﷺ نے ایک نئی حکمت اپنائی، اس طرح ممکنہ جائز وسائل کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہونی چاہئے۔

☆ صلح حدیبیہ سنہ ۶ ہجری میں پیش آئی، ۱۵؍سو صحابہ کرامؓ عمرہ کے ارادہ سے نکلے، لیکن حدیبیہ کے مقام پر مشرکین نے روک لیا، اور عمرہ کرنے سے منع کر دیا، اور آپ ﷺ سے چند باتوں پر صلح کی، صلح کی دفعات یک طرفہ اور جانبدارانہ تھیں، لیکن آپ ﷺ اور صحابہ کرام (جب کہ وہ احرام میں تھے) نے بادل ناخواستہ ان کو قبول کیا، لیکن یہ قبول کر لینا اسلام اور مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہوا۔

معلوم ہوا کہ بعض دفعہ ناگوار چیزوں کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی لینا چاہئے، اگر چہ اس کی حکمت فوری طور پر سمجھ میں نہ آئے، جوش پر ہوش کو ترجیح دینا چاہئے، اور مخلص اور باشعور قیادت کے سامنے سر جھکا دینا چاہئے۔

☆ ہجرت کے آٹھویں سال فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا، اس میں مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی، مسلمان مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہے ہیں، اور تواضع اور خاکساری کا پیکر بنے ہوئے ہیں، رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے، بتوں کو صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی، اور دشمنوں کی عام معافی کا اعلان کیا۔

معلوم ہوا کہ خوشی کے موقع پر انسان کے وجود سے تواضع و خاکساری ظاہر ہونی چاہئے، دوسری بات یہ کہ کوئی قوم خواہ کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو، اگر وہ سر جھکا دے، تو پچھلے زخموں کو کریدنا مناسب نہیں۔

☆ اسی سفر میں آپ ﷺ نے حنین کی جنگ کی، اس میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی، ایسے موقع پر احساس ہوا، اور یہ احساس فطری تھا کہ جب ہم بدر میں تین سو تیرہ تھے تو دشمن ہمارا کچھ نقصان نہیں کر سکے، اور آج تو ہماری تعداد بارہ ہزار ہے، آج ہم ان کو چند لمحوں میں شکست دے دیں گے، یہ احساس اللہ تعالیٰ کو ناگوار معلوم ہوا، چنانچہ حنین پہونچتے ہی مسلمانوں پر دشمنوں نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ مسلمان تتر بتر ہوگئے، اور سخت آزمائش میں پڑ گئے، اور زخمی ہوئے، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کے قدم جمائے اور وہ دشمنوں پر غالب ہوئے۔

معلوم ہوا کہ اسباب ووسائل اختیار کرنا چاہئے ،لیکن ان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے ،اگر بھروسہ کیا جائے گا تو شکست اور رسوائی کے حالات سامنے آئیں گے۔ بیماری سے شفا کے لئے دوا استعمال کریں گے،لیکن بھروسہ اللہ تعالی کی ذات پر کریں گے۔

☆ سنہ ۱۰ ہجری میں آپ ﷺ نے آخری حج کیا،اس میں جو خطبہ دیا، وہ خطبہ ہی نہیں، بلکہ انسانی حقوق کا چارٹر اور منشور ہے،اس میں تمام باتوں میں دو باتیں اس وقت پیش کی جارہی ہیں: اللہ ایک ہے،اور ہمارے باپ ایک ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک اللہ کے سامنے جھک جانے سے انسان تین سو ساٹھ خداؤں سے آزاد ہوجاتا ہے،اور ایک باپ کی اولاد کا تصور رکھ کر انسان ہزاروں قسم کے اختلافات سے محفوظ رہتا ہے،رنگ ونسل کی بنیاد پر تفریق کرنا اور اختلافات کو بڑھاوا دینا، یہ اسلامی قانون کے خلاف ہے اور باغیانہ عمل ہے۔

☆ انتقال سے کچھ پہلے آپ ﷺ نے نماز پڑھنے اور ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی وصیت کی۔

معلوم ہوا کہ نماز تو کسی حال میں نہیں چھوڑنا چاہئے ، بلکہ فرائض کے علاوہ نفلیں بھی پڑھنی چاہئے ، دوسرے یہ کہ ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے ، ماتحت میں بیوی ہے، بچے ہیں، عمر میں چھوٹے اعزہ ہیں، ان کے حقوق کا خیال رکھنا اور ان کے ساتھ بہتر معاملہ کرنا ضروری ہے۔

یہ ہے اسوۂ حسنہ کی ایک جھلک، سیرت رسول ﷺ پڑھنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ اس کے ایک ایک واقعہ میں جو پیغام چھپا ہے اس کو جاننے کی کوشش کریں،اور اس کے مطابق عمل کریں۔اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

سیرت نبوی میں قول وعمل کی یکسانیت

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد، فقد قال الله تعالى : يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ، وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ، وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ(الأنفال : ٢٤)

(اے ایمان والو! اللہ اور رسول کے حکموں کو مانو جب کہ وہ تم کو ایسی چیز کی طرف بلائیں، جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہو یعنی جہاد اور احکامِ شرعیہ وغیرہ، اور جان رکھو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان آڑ بن جایا کرتا ہے، (اس طرح کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو بجالائے تو اس کو گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے، یا گناہ ہوجائے تو توبہ کی توفیق دیتا ہے، اور اگر وہ جانتے بوجھتے بے رخی وروگردانی کرتا ہے تو اسے نیکی کی توفیق نہیں دیتا) اور یہ (بھی یاد رہے) کہ تم سب کو بالآخر اسی کے پاس جمع ہونا ہے)

حضرات! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال وحالات جن سے امت کو تا قیامت استفادہ کرنا ہے دو پہلو رکھتے ہیں: ایک وہ جو آپ کی تعلیمات اور ہدایات سے متعلق ہیں، ان کو حدیث نبوی کہا جاتا ہے اور دوسرے وہ جو آپ کے حالات زندگی سے متعلق ہیں، ان کو سیرت نبوی کہا جاتا ہے، حدیث اور سیرت میں خاص تعلق ہے، دونوں کا ایک دوسرے سے ربط ہے، ایک کا تعلق قول سے ہے، دوسرے کا تعلق عمل سے ہے، گویا قول اور عمل یہ دونوں بنیادیں ہیں، جن پر ہماری زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر صرف زبانی دعویٰ ہو اور انسان عمل سے خالی ہو تو اس کی بات کا ذرہ برابر بھی اثر

نہیں پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں یہودیوں کو خطاب کر کے کہا گیا: اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (البقرة: ٤٤) (کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور اپنے کو بھول جاتے ہو، جب کہ تم کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہو) اور ایمان والوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا: "یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ، كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ." (الصف: ٢-٣) (اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، اللہ کے نزدیک بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو، جو کرتے نہیں ہو) اور قول کے ساتھ ذاتی عمل پر ابھارتے ہوئے کہا گیا: "یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ." (المائدة: ١٠٥) (اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو، تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچے گا اگر کوئی گمراہ رہا، بشرطیکہ تم راہِ راست پر رہو)

حضرات! جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات قول وعمل کی جامع تھی، اس سلسلہ میں قرآن کی چند آیتیں بطور شہادت کافی ہیں: "وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم: ٥)، فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلٰی آثَارِهِمْ اِنْ لَمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفاً" (الكهف: ٦) (سو شاید آپ ان کے (اعراض کے) پیچھے اپنی جان دیدیں گے، اگر یہ لوگ اس مضمون قرآنی پر ایمان نہ لائے) ویسے تو پورا قرآن اس جامعیت کی گواہی دے رہا ہے، آپ کی عملی زندگی کی گواہی آپ کے اہل خانہ سے دی جارہی ہے:

حضرت عائشہ اور حضرت خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کی شب و روز سے واقف ہیں، حضرت خدیجہؓ نے ۱۵ رسال آپ کے ساتھ گذارنے کے بعد گواہی دی کہ كَلَّا! وَاللّٰهِ لَا یُخْزِیْكَ اللّٰهُ أَبَداً، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ (صحیح مسلم، کتاب الإیمان: ۴۲۲) (اللہ آپ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، فقیر کے کام آتے ہیں، دوسروں کے بوجھ کو اٹھاتے ہیں، اور حق کے ستم رسیدہ کی مدد کرتے

ہیں) حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تقریباً نو سال گذارے، ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ قرآن میں الفاظ کی شکل میں موجود ہے اس کی عملی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے (صحیح بخاری)

حضرات! اب آئیے عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس عملیت کے نمونے دیکھتے ہیں:

چالیس سال کی عمر میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو جب نبوت ملی تو آپ کو اللہ نے توحید کی دعوت کا حکم دیا، آپ کا عمومی اعلان تھا: أَیُّهَا النَّاسُ! وَحِّدُوا اللّٰهَ، فَإِنَّ التَّوْحِیْدَ رَأْسُ الطَّاعَاتِ (اے لوگو! اللہ کو ایک مانو، کیونکہ توحید تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے)، اور فرمایا: قُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا (مسند احمد: ۱۸۶۱۰) اور عملی طور پر آپ ﷺ پوری زندگی توحید پر قائم رہے، ایک دن کے لئے بھی آپ سے بت پرستی کا صدور نہیں ہوا، زمانہ جاہلیت میں توحید کے تعلق سے آپ کی بےچینی کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم گویا ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰی (اللہ نے آپ کو حیران وپریشان پایا تو سیدھا راستہ دکھایا)، اور نبوت کے بعد بھی ایک سکنڈ کے لئے بھی شرک کی طرف مائل نہیں ہوئے، اگر ایسا ہوتا تو قرآن خود کہتا ہے: "اِذاً لَاَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَیَاةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ، ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْراً." (الإسراء: ٧٥) (اس حالت میں ہم آپ کو دوگنا عذاب چکھاتے، زندگی میں بھی اور (بعد) موت بھی، پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو مددگار نہ پاتے)

عبادات کو دیکھئے: نماز مؤمن کے لئے جائے پناہ ہے، اس کی روح کی سب سے بڑی غذا اور اللہ تعالیٰ سے مناجات کا ذریعہ ہے، نماز کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: بَیْنَ الرَّجُلِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ (صحیح مسلم: ۲۵۷) اور فرمایا: "الأمرُ الذي بَیْنَنَا وبینهُمُ الصلاةُ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ" (ابن ماجہ: ۱۱۳۲) (ہمارے اور ان کے درمیان وجہ امتیاز نماز ہے، جس نے اس کو چھوڑا اس نے کفر کیا) اور فرمایا: "اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ، فَمَنْ اَقَامَهَا اَقَامَ الدِّیْنَ، وَمَنْ هَدَمَهَا هَدَمَ الدِّیْنَ." (نماز ایمان والوں کی

معراج ہے، جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا، اور جس نے اس کو گرا دیا اس نے دین کو گرا دیا) یہ تو احادیث ہیں۔ نماز کے سلسلہ میں عمل یہ ہے کہ آپ ﷺ نماز کے خود امام ہوتے تھے، آخری عمر میں شدید بیماری اور بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر ہی حضرت ابو بکرؓ نے نماز پڑھائی، آپ کا حال یہ تھا کہ خانہ کعبہ میں آپ نماز پڑھتے، اور مشرکین اونٹ کی اوجھ کو آپ کے جسم پاک پر لا کر ڈال دیتے، یہ تو فرائض کا حال ہے، نوافل کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کوئی اہم واقعہ پیش آتا، آندھی چلتی، چاند گرہن اور سورج گرہن ہوتا تو آپ نماز ہی کا رخ فرماتے تھے، ایک حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ آپ راتوں میں اس قدر نماز پڑھتے کہ قدم مبارک پر ورم آجاتے، آپ نے تو لوگوں کو پانچ وقت کی نماز کا حکم دیا، لیکن خود آپ نے آٹھ وقت کی نمازیں اپنے لئے خاص کر لیں: فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اشراق، چاشت، تہجد۔

روزہ کے سلسلہ میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے عام مسلمانوں کو تو صرف رمضان کے روزے کی فرضیت بتائی، لیکن خود آپ کا کوئی ہفتہ اور مہینہ روزہ سے خالی نہیں رہتا تھا، آپ نے لوگوں کو زکاۃ و صدقات کا حکم دیا، لیکن آپ کے خرچ کی عملی شہادت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی وہ حدیث دیتی ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ آپ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، اور رمضان میں آپ کی سخاوت آخری درجہ کو پہونچ جاتی تھی، غزوات اور فتوحات میں جو مال اور سرمایہ آتا اس کو غیروں کو دے دیتے تھے۔

حضرات! معاشرتی زندگی میں سب زیادہ اخلاق کی اہمیت ہے، جس کے اخلاق اچھے ہیں وہ مقبول، محبوب اور پسندیدہ ہے، اور جس کے اخلاق خراب ہیں، وہ ناپسندیدہ اور نامقبول ہے: چند حدیثیں پیش خدمت ہیں: ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز زیادہ وزنی نہیں، ترمذی شریف کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کامل ایمان والا وہ ہے، جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

عملی مثال یہ ہے کہ حضرت انسؓ دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہے، ان کا بیان ہے کہ کبھی بھی رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے اف نہیں کہا، اور کسی کام کے متعلق جس کو میں نے کیا تھا یہ نہیں کہا کہ کیوں کیا، اور کسی کام کے متعلق جس کو نہیں کیا تھا یہ نہیں کہا کیوں نہیں کیا (صحیح مسلم، کتاب الفضائل: ۲۳۰۹)

ابو سفیان جو برابر آپ کے خلاف محاذ آرائی کرتے رہے، بدر، احد، خندق وغیرہ میں قریش کے کمانڈر تھے، لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب ایمان لاتے ہیں، تو آپ ان کو صرف معاف ہی نہیں کرتے، بلکہ ان کے گھر کو امن کا گہوارہ بنا دیتے ہیں، ان کی بیوی ہند جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا وہ نقاب پوش آتی ہے، اس سے بھی تعرض نہیں کرتے، بلکہ اس کو بھی معاف کر دیتے ہیں۔ ہبار بن الاسود جس نے حضرت زینبؓ کو قتل کیا تھا، اور کئی شرارتوں کا مرتکب ہو چکا تھا، فتح مکہ کے موقع پر اس کا خون آپ ﷺ نے جائز قرار دے دیا تھا، وہ چاہتا ہے کہ وہ ایران بھاگ کر جائے، لیکن سیدھے دربار رسالت میں حاضر ہوتا ہے، آپ ﷺ نے ان کی بات سنی اور معافی کا اعلان کر دیا۔

حضرات! معاملات زندگی میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، معاملات میں شفافیت سے قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، اور تعلقات میں بہتری آتی ہے، قرآن کریم میں سب سے بڑی آیت معاملات کی ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ." (البقرة: ۲۸۲) (اے ایمان والو! اگر کسی کو قرض دو تو لکھ لیا کرو)

معاملات میں اگر کوئی بات ہو جائے تو اس کو صبر و ضبط سے برداشت کرنا چاہئے، اس کا حکم قرآن کریم میں ہے: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ" (الأحقاف: ۳۵) جب آپ نے جاہل اور علم و معرفت سے ناآشنا قوم میں حق کا علم بلند کیا تو آپ کو ستایا گیا، آپ پر نجاست ڈالی گئی، راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گلے میں پھندہ ڈال کر پھانسی دینے کی کوشش کی گئی، تین سال شعب ابی طالب میں

گذارا، لیکن ان تمام حالات کو صبر وضبط سے جھیلتے رہے، معاملات کو حل کرنے کے لئے تاجروں کو نصیحت کی: اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ يُبْعَثُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ (جامع ترمذی: ۹۶۶) (سچا امانت دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ قیامت کے دن ہوگا) اور عملی طور پر حضرت خدیجہؓ کی تجارت بھی کی اور اس کو خوب بڑھایا، یہاں تک کہ انہوں نے نکاح کا پیغام دے دیا۔

ازدواجی زندگی میں اگر کوئی مسئلہ پیش آئے تو پہلے آپ ﷺ نے سمجھانے، دوسرے نمبر بستر الگ کرنے، تیسرے نمبر ہلکی مار مارنے کی تاکید کی، اور اگر اب بھی بات نہ بنے تو ایک حَکَم مرد کی طرف سے اور ایک عورت کی طرف سے متعین کرنے کی بات کہی، اور اگر اب بات نہ بنے تو شرعی طریقے پر جدائی کا نظام بنایا، عورتوں کے سلسلہ میں فرمایا: اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْراً (بخاری ومسلم) (عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت قبول کرو) ایک موقع پر فرمایا: لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقاً رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ (صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب وصیۃ النساء، حدیث: ۲۷۶۴) (کوئی ایمان والا کسی ایمان والی کو الگ نہ کرے، اگر اس کی کوئی بات بری لگے تو دوسری تو اچھی ہوگی) اور پوری ایک سورت قرآن کریم میں عورتوں سے متعلق اتاری گئی، وہ سورۂ نساء ہے۔

خود آپ کی زوجیت میں گیارہ امہات المؤمنین تھیں، ان میں صرف ایک غیر شادی شدہ تھیں، بقیہ یا تو بیوہ تھیں یا مطلقہ تھیں، دینی مصلحت کی خاطر آپ نے ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا، اور ان کے ساتھ حسن سلوک فرمایا، مزاجوں کی رعایت کی، ان کے لئے باریاں طے فرمادیں، اور برابر اس کا احساس رہا کہ اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے، جس پر میں قادر ہوں، تو آپ میرا مؤاخذہ نہ کیجئے، اس پر جس پر میں قادر نہیں ہوں۔

یہ ہے قول وعمل کی وہ یکسانیت جو ہمیں سیرت طیبہ میں ملتی ہے، آج گفتار کے غازی تو بہت ہیں، لیکن سیرت وکردار کے پیکر ڈھونڈنے سے ملتے ہیں، ربیع الأول کے اس

مہینے میں ہمیں جہاں ایک طرف سیرت کا مطالعہ کرنا چاہئے، وہیں دوسری طرف قول وعمل کی جامعیت کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل بھی کرنا چاہئے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ایک مناجات ہے، اس میں انہوں نے قول وعمل کی جامعیت کی دعاء مانگی ہے:

صدق احساس کی دولت مرے مولی دے دے
غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دے دے
قول میں رنگ عمل بھر کے بنادے رنگیں
لبِ خاموش بناکر، دلِ گویا دے دے

غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے قول وعمل کی جامعیت کی اچھی مثال اپنی حیات طیبہ کے ذریعہ پیش کی، اگر ہم ان مثالوں کو اپنے سامنے رکھیں تو ہمارے لئے شریعت اور سنت کے مطابق زندگی گذارنا آسان ہوجائے گا۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

اسوۂ نبوی

عام انسانی برادری اور خواتین کے سلسلہ میں

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ." (الأحزاب : ٢١)

حضرات! انسان کی دوحیثیتیں ہیں: ایک عام انسان کی، دوسرے صاحب پیغام قوم کی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی دوحیثیتیں ہیں: ایک عام انسان کی، دوسرے رسول اور اللہ تعالی کے فرستادہ کی۔ عام انسان کی حیثیت سے آپ کی ولادت ہوئی، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے، تجارت کی، شادی ہوئی، اولادہوئی، زندگی میں موت وحیات کے واقعات پیش آئے، لیکن ایک دوسری حیثیت آپ کی رسول اور پیغمبر کی ہے، خاتم النبیین کی ہے، بشیرونذیر کی ہے، یٰسین وطٰہ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی سیرت اسوۂ اورنمونہ قرار پائی، اورقابلِ تقلید قراردی گئی: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوْا اللّٰهَ، وَالْيَوْمَ الآخِرَ، وذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً." (الأحزاب : ٢١) (رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے، یعنی اس کے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اورروز آخرت سے، اورذکر الٰہی کثرت سے کرتا ہو)

حضرات! سیرت نبوی ایک حسین گلدستہ ہے، جس میں نوع بنوع کے پھول کھلے ہوئے ہیں، زندگی کے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، خواہ وہ سیاسی ہوں یا اقتصادی، فکری ہوں یا ثقافتی، تجارتی ہوں یا خاندانی، اجتماعی ہوں یا انفرادی، سیرت نبوی میں اس طرح کے حالات کے لیے مکمل ہدایات موجود ہیں۔

حضرات! رسول پاک ﷺ کی سیرت کا اہم پہلو خدمت خلق ہے، آپ نے پوری انسانیت کو اللہ کا کنبہ قرار دیا، سب کو ایک نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ ﷺ نے مذہبی مساوات قائم کی، سماجی مساوات قائم کی، قانونی مساوات قائم کی، اورسیاسی مساوات قائم کی، ہجرت سے پہلے اورہجرت کے بعد ہمیشہ اپنوں اور پرایوں کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ رکھا، غیر مسلموں کے ساتھ بھی ہمدردی کا معاملہ کیا:

(۱) آپ نے کبھی زبردستی کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، حضرت عمرؓ کا واقعہ اس پر گواہ ہے (سیرۃ ابن ہشام)

(۲) کبھی کسی غیر مسلم کو قولی یا عملی تکلیف نہیں دی، فرمایا: جو کسی غیر مسلم سے چھیڑ چھاڑ کرے گا، وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا (صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب اثم من قتل ذمیا بغیر جرم)

(۳) غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کیا، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جب حالت شرک میں تھے، ایک مرتبہ اپنی صاحبزادی ام حبیبہ سے ملاقات کے لئے آئے اور رسول اکرم ﷺ کے بستر پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے منع کردیا، اس عمل سے ابوسفیان ناراض ہوئے، اوررسول اللہ ﷺ سے تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ ان کے ساتھ اچھا معاملہ کریں، اگرچہ وہ مشرک ہیں (سبل الھدی والرشاد ج۲۰۶/۵)

ایک مرتبہ حضرت اسماء بنت ابی بکر نے رسول اکرم ﷺ سے اپنی والدہ جو حالت شرک میں ان سے حسنِ سلوک کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں (صحیح بخاری، ۲۶۲۰)

بدر کے قیدیوں کے ساتھ آپ ﷺ کا معاملہ تو بہت عجیب وغریب تھا، ان کو اچھا کھانا کھلایا، آزاد کیا اورجوڑے بھی عطا کئے۔

حضرات! رسول اکرم ﷺ کا احسان صرف غیر مسلموں ہی کے ساتھ نہیں، بلکہ خواتین کے ساتھ بھی ہے، خواتین انسانی زندگی کی گاڑی کا مضبوط پہیہ ہیں، قرآن نے

مرد وعورت کو سورج اور چاند سے تشبیہ دی ہے، اور حدیث میں ان کو کائنات کی اہم پونجی اور سرمایہ بتایا گیا ہے، جن کے وجود سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہے، زینت ہے، آہنگ ہے، جمال وخوبصورتی ہے، نسلوں کا امتداد وتسلسل ہے، رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے یہ طبقہ مظلوم اور ستم رسیدہ تھا، لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا، میراث میں حصّہ نہیں دیا جاتا تھا، طلاق کے بعد عورت، مرد کی میراث قرار پاتی تھی، عورتوں کو بیچا جاتا تھا، گناہ کا دروازہ شمار کیا جاتا تھا، اسلام نے ان کو ایسا بلند مرتبہ عطا کیا کہ ان کے نام سے باقاعدہ قرآن میں ایک سورت نازل کی: ’’سورۃ النساء‘‘، اور حضرت مریم علیہ السلام جو ایک نیک سیرت خاتون تھیں کے نام سے بھی ایک دوسری سورت نازل کی۔

حضرات! قرآن نے عورتوں کے مقام بلند کو بیان کرتے ہوئے کہا: ’’اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ‘‘ (النساء:۳۴) (مرد عورتوں پر نگراں ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں)

اسلام نے مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات وبرابری کا حکم نہیں دیا، بلکہ عدل کا حکم دیا ہے اور عدل کے معنی انصاف کے ہیں، یعنی جس کے لیے جو موزوں ہو اور جتنا موزوں ہو وہ دینا، مساوات (یعنی مرد وعورت میں یکساں برابری) کے فلسفہ پر عمل کرنے سے ہر چیز خراب ہوجائے گی۔

حضرات! علم انسانیت کا زیور ہے، یہی وجہ ہے کہ خواتین پر علم حاصل کرنا واجب ہے۔ تاریخ اسلام میں خواتینِ اسلام نے بے مثال کارنامے انجام دیئے۔ حضرت عائشہؓ ان سات محدثات میں ہیں جن سے ایک ہزار سے زیادہ روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ حضرت عائشہؓ کا علمی پایہ بہت بلند تھا، وہ اکابر صحابہ کا مؤاخذہ کیا کرتی تھیں، ان کو خبر پہنچی کہ بعض لوگ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث نقل کررہے ہیں کہ تین چیزوں میں نحوست ہے: عورت،

گھر اور سواری، تو حضرت عائشہؓ نے لوگوں کی غلط فہمی کا پردہ چاک کیا اور کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ بیان فرما رہے تھے کہ بنی اسرائیل تین چیزوں کو منحوس سمجھا کرتے تھے، ابھی یہ بات فرما رہے تھے کہ ایک راوی آئے اور انھوں نے اگلی بات راویت کی کہ نحوست تین چیزوں میں ہے: عورت، گھر اور گھوڑا، لیکن وہ یہ جملہ فراموش کر دیا: (بنی اسرائیل منحوس سمجھا کرتے تھے)، اور اگلی بات نقل کردی۔

حضرات! گھریلو صنعت دستکاری کو تو آپ ﷺ نے عورتوں کے لیے پسند فرمایا، حضرت رفیدہؓ کی کلینک مسجد نبوی کے پاس تھی جس میں وہ علاج کیا کرتی تھیں، پردہ کو آج کل بوجھ سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ عورت کے تحفظ کا ذریعہ ہے، یہ حقیقت ہے کہ جو چیز جتنی قابل قدر ہوتی ہے وہ اسی قدر حفاظت سے رکھی جاتی ہے، دل کتنا اہم ہے، اللہ نے اس کو بہت محفوظ جگہ میں رکھا، آنکھ کتنی اہم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو پپوٹوں اور پلکوں کے تحفظ میں رکھا ہے، اسی طرح عورت کو بھی پردہ اور خاص تحفظ میں رکھا ہے، عورت سے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أنا خيرُكم لأهلي (جامع ترمذی، کتاب المناقب: ۴۲۶۹) (میں تم میں اہل خانہ کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے والوں ہوں)، عورت کی تین حیثیتیں ہیں: بیٹی، بیوی اور ماں۔ ان تینوں حیثیتوں سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے مقام کا لحاظ رکھا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیقات سے نوازے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

سیرت کے بعض واقعات

اوران کا پیغام

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء ،وامام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد :

ربیع الأول کا مہینہ ہے،اس مہینہ کی کئی دن گذر چکے ہیں،اس سے پہلے آپ نے سیرت کے متعدد گوشوں پر رسول اللہ ﷺ کی پاک زندگی کے واقعات وحالات کو سنا،آج کی گفتگو میں سیرت طیبہ کے چار نمایاں پہلوؤں اوران کے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا جائے گا:(۱) سیرت کا عبادتی پہلو (۲) سیرت مصالحتی پہلو (۳) سیرت کا دعوتی پہلو (۴) سیرت اورافرادسازی۔

سب سے پہلے سیرت کے عبادتی پہلو کو لیتے ہیں: رسول اکرم ﷺ کے بارے میں یہ آتا ہے کہ آپ ہمیشہ فکر آخرت میں رہتے تھے اوراسی کے بارے میں سوچتے رہتے تھے کہ کسی وقت آپ کو چین وسکون نہیں ہوتا تھا، زمانہ جاہلیت میں برائیوں کو دیکھ کر کڑھتے تھے،اور پریشان ہوتے تھے،اورآپ اللہ کی عبادت کے لئے تنہائی کی خاطر غار حراء تشریف لے جاتے تھے،اورکئی کئی دنوں قیام رہتا تھا،نبوت کے بعد آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ اللہ کی عبادت میں سب سے زیادہ کوشاں رہتے تھے،اوراس کے سب سے زیادہ شائق اورمشتاق رہتے تھے،امام بخاری نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ اتنی دیر نماز نفل میں کھڑے رہے کہ آپ کے قدم مبارک میں ورم آگئے،عرض کیا گیا تو فرمایا کہ کیا

میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔ترمذی کی ایک دوسری روایت میں ہے،حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ونے ایک مرتبہ قرآن کی ایک آیت میں پوری رات گذار دی: إن تعذبهم فانهم عبادك ، وإن تغفر لهم فانك أنت العزيز الحكيم (المائدة:۱۱۸)۔آپ ﷺ کی عبادت کا حال یہ تھا کہ روزہ رکھتے تھے تو مسلسل روزہ رکھتے تھے،آپ ﷺ نماز میں اس طرح مشغول ہوتے تھے کہ سینہ مبارک سے دیگچی کی آواز نکلتی تھی،اورخود فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے اورتیز ہوائیں چلتی تو آپ مسجد کا رخ کر لیتے،سورج گرہن اور چاند گرہن میں یہی حالت ہوتی تھی۔اور جب تک نماز نہ پڑھ لیتے سکون نہیں ملتا،حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے : يا بلال! أقم الصلاة، أرحنا بها ۔(اے بلال!نماز قائم کرواورہمیں آرام پہونچاؤ)(سنن ابو داود)

حضرات! سیرت کا مصالحتی پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاملہ فہم،سمجھدار انسان تھے،معاملہ کی تہ تک جا کر اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے،اوراسی کی تاکید بھی فرماتے تھے،یہی وجہ ہے کہ آپ نے جذباتی ہونے اورغصہ کرنے سے منع فرمایا،اس وقت تین واقعات سامنے رکھئے:ایک حلف الفضول کا واقعہ ہے،یہ مکہ کا شریفانہ اورکریمانہ معاہدہ تھا،اور کہا کرتے تھے کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں ایک معاہدہ میں شرکت کی تھی،نبوت کے بعد بھی مجھے اگراس جیسے معاہدہ کے لئے بلایا جائے تو میں ضرور حاضر ہوں گا،تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود رکھنے کا معاملہ تھا،قریب تھا کہ خون کی ندیاں بہیں،اورلوگ ایک دوسرے کو قتل کریں،لیکن آپ ﷺ نے اپنے حسن تدبیر سے اور حکمت سے اس کو معاملہ کو حل کرایا،اورتیسرا خود صلح حدیبیہ کا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسی شرطوں پر صلح کی جن سے مسلمان خوش نہیں تھے،لیکن اللہ تعالی نے بعد میں اس کے نتائج کے ذریعہ سے اس کی معنویت ظاہر فرمادی۔

حضرات! رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا ایک پہلو دعوتی استقامت ہے،نبوت کا

ابتدائی دور ہے، اسلام کی تبلیغ کا عمل جاری ہے، رسول اللہ ﷺ کو ابو طالب کی حمایت بھی جاری ہے، ایسے موقع پر قریش کا پورا وفد ابو طالب کے پاس آیا، اور اس نے ابو طالب سے کہا کہ آپ سن رسیدہ ہیں، آپ کی خاص قدر و منزلت ہے، آپ اپنے بھتیجے کو منع کر دیں، ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو بلایا، اور کہا کہ بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال، جس کو میں نہ اٹھا سکوں، ایسے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے دعوتی استقامت کا مظاہرہ کیا کہ خدا کہ قسم! اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھیں یعنی مجھے انعامات اور عذاب دونوں سے دوچار کریں، تب بھی میں اپنے اس عمل سے باز آنے والا نہیں ہوں، ابو طالب نے جب یہ استقامت دیکھی تو کہا کہ جاؤ، تمہارا جو جی چاہے کرو، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

مکی دور کا واقعہ ہے کہ عتبہ بن ربیعہ آیا، اور اس نے کہا کہ محمد! اگر تم اپنی اس دعوت سے ہمارا سردار بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں، اگر تم مال چاہتے ہو تو ہم تم کو اتنا مال دیں گے کہ تم مالدار ہو جاؤ گے، اگر تم کسی پر آسیبی اثرات ہیں تو ہم تمہارا علاج کرا دیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے کہا : ابو الولید! تم اپنی بات کہہ چکے؟ پھر آپ ﷺ نے سورہ فصلت کی ابتدائی آیتیں تلاوت کیں، جس سے وہ غیر معمولی طور پر متأثر ہوا۔

حضرات! سیرت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے افراد تیار کئے اور ان کو ملت کے کاموں میں استعمال کیا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہیں، یہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو جہاد و قتال کے لئے متعین فرمایا، اور فوجوں کی سپہ سالاری حوالہ کی، اور سیف من سیوف اللہ (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) قرار دیا، اور غزوۂ موتہ میں ان کے کردار کی ہمت افزائی فرمائی۔ دوسری طرف حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں، ان کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، آپ نے ان کو عبرانی زبان کے سیکھنے پر ان کو آمادہ کیا، اور جب یہود سے خطوط کا سلسلہ ہوتا تھا تو انہیں مدد لیتے تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ خوش آواز تھے اور بلند آواز تھے، چنانچہ انہوں نے ان کو اذان کے کلمات سکھائے

اور انہوں نے اذان کو رسول اللہ ﷺ کے کہنے کے مطابق دیئے، اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف تین سال رہے، خیبر کے موقع پر آئے، اور پانچ ہزار حدیثیں آپ سے روایت کی۔ اسی طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے شعر کہنے کی ترغیب دی اوران کے لئے دعائیں کی۔

غرض یہ کہ سیرت رسول اکرم ﷺ میں متعدد پہلو ہیں، ہمیں سیرت کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس سے ہمیں شریعت کا بھی علم ہوگا، محبت میں اضافہ ہوگا، قرآن اور حدیث کے سمجھنے میں مدد ملے گی، اور زندگی کے نشیب و فراز میں کیا ہمارا طرز عمل ہونا چاہئے اس کی طرف بھی رہنمائی ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

رسول اللہ ﷺ کے جامع کلمات

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء، وإمام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد : عن جابر بن عبد الله رضى الله عنه قال : قال النبى ﷺ : تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما إن تمسكتم بهما ، كتاب الله و سنتى (رواه مالك فى الموطا) امام مالک نے موطا میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کے جارہا ہوں، اگر تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری سنت (مؤطا امام مالک)

حضرات! قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، اور دین کا اولین سرچشمہ ہے، جس سے ہم دین کو سیکھتے اور سمجھتے ہیں، وہ آخری آسمانی کتاب بھی ہے، جو محمد رسول اللہ ﷺ پر اتاری گئی ہے، اس کتاب کی تشریح وتفسیر جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے، خود اللہ تعالی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے : وأنزلنا اليك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم و لعلهم يتفكرون (النحل:۴۴) (اور ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ لوگوں پر ان ہدایات وتعلیمات کو اچھی طرح واضح کردیں جو ان کی طرف بھیجی گئی ہیں، تاکہ وہ غور کریں، اور سورۂ حشر میں ہے: وما آتاكم الرسول فخذوه ، وما نهاكم عنه فاتهوا (الحشر : ۷) (رسول تم کو جو دیں اسے لے لو، اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جایا کرو)، اس طرح قرآن اصل ہے، اورحدیث اس کوتشریح وتفسیر ہے۔

حضرات! حدیث کی قسموں میں ایک حدیث وہ ہے جس کو ہم جوامع الکلم کہتے ہیں، یعنی وہ حدیثیں جن کے الفاظ کم اور معانی بہت زیادہ ہیں، یہ حدیثیں عملی زندگی سے براہ وابستہ ہیں، اس سلسلہ کی پہلی حدیث ہے: سنن ترمذی میں ہے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کون ہے جو ان کلمات کو مجھ سے لے لے اور ان پر عمل کرے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں یارسول اللہ! آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ باتیں بتائیں: اتق المحارم تكن أعبد الناس ، حرام سے سے بچو لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار ہوجاؤگے، وارض بما قسم الله تكن أغنى الناس اللہ نے تمارے لئے جو مقرر کیا ہے، اس پر راضی رہو، تم لوگوں میں سب سے غنی ہوجاؤگے، وأحسن الى جارك تكن مؤمنا اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو تم کامل درجے کے ایمان والے ہوجاؤگے، و أحب للناس ما تحب لنفسك تكن مسلما اور لوگوں کے لئے وہی پسند کرو، جو اپنے لئے پسند کرتے ہو تم اچھے مسلمان ہوجاؤگے، ولا تكثر الضحك ، فإن كثرة الضحك تميت القلب اور زیادہ ہنسنے سے بچو، اس لئے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کردیتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حرام چیزوں سے بچو، تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤگے، الحمد اللہ ہم عبادتوں کا خوب اہتمام کرتے ہیں، نماز، روزہ زکاۃ حج، اور صدقہ وخیرات خوب کرتے ہیں، لیکن گناہوں سے نہیں بچتے، نعوذ باللہ گالی بکتے ہیں، غیبت کرتے ہیں، رشوت لیتے ہیں، وراثت میں بہنوں کا حق نہیں ادا کرتے ہیں، یہ عام طور پر صورت حال ہے، آپ ﷺ نے نفس کے اس دھوکہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ گناہ سے بچنا بھی عبادت ہے، طبیعت گناہ کی طرف مائل ہے، لیکن انسان اللہ کے خوف سے گناہ سے بچ رہا ہے تو یہ بڑی عبادت کررہا ہے، بالکل ایسا ہی جیسے مریض کے لئے دوا کھانے سے زیادہ پرہیز کرنا ہے، اسی طرح عبادت دوا ہے، اور گناہ سے بچنا پرہیز ہے، ان دونوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ اللہ نے تمہارے لئے دنیا کی جو چیز جتنی مقدر کی ہے، اس پر راضی رہو، تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے، انسان کی فطرت میں حرص اور لالچ رکھی گئی ہے، اور یہ ہزاروں گناہ کراتی ہے، اور غصہ اور دشمنی تک پہونچاتی ہے، اور نوبت قتل وقتال تک پہونچ جاتی ہے، اس حدیث میں اللہ کی تقسیم پر راضی رہنے اور حرص سے بچنے کی بات کہی گئی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اس سے انسان کامل درجہ کا ایمان والا ہو جاتا ہے، ایمان امن سے نکلا ہے، اور حقیقی مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنے کو پرامن محسوس کریں، عام طور پر پڑوسیوں کے ساتھ انسانوں کے مفادات ٹکراتے ہیں، کبھی زمین دبالی، کبھی گھر اکا کوڑا اس کے دروازہ پر پھینک دیا، کبھی گندہ پانی بہادیا، پڑوس کی کی عورتیں گذری تو بدنگاہی کی، لڑکی اور لڑکے کے رشتے کے بارے میں لوگوں نے معلوم کیا تو انسان نے غلط رپورٹ دے دی، بلا اجازت کھڑکی کھولی دی، زور زور سے ٹیپ ریکارڈ بجایا جاتا ہے، یہ اور اس طرح کی بہت سی شکلیں ہیں، جن کے متعلق آیا ہے کہ انسان کا ایمان متأثر ہوتا ہے، اور انسان مکمل ایمان والا نہیں ہوسکتا، حدیث میں صاف آیا ہے کہ انسان پیٹ بھر کھا کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے تو وہ مؤمن نہیں ہوسکتا۔

چوتھی چیز دوسرے لوگوں کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو سچے مسلمان ہو جاؤ گے، اپنا ساتھی بیمار ہے، کمزور ہے، مشکل سے چل رہا ہے، اگر وہ خود اس حالت میں ہوتا تو چاہتا کہ کوئی دوسرا سہارا دے، بھوکا ہے تو اس کے کھانے کی فکر کرے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو ایسا کرے گا وہ سچا مسلمان ہوگا۔

اور پانچویں بات یہ کہ زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو، ہلکا پھلکا مزاح اور مذاق کرنا جائز ہے، صحابہ نے کیا، خود رسول اللہ ﷺ نے کیا، لیکن ایسا مذاق جس میں توہین ہو، جس میں جھوٹ کی آمیزش ہو، جس میں انسان حد اعتدال سے آگے نکل جائے، اس کی بالکل اجازت

نہیں، آج کل شب قہقہہ منائی جاتی ہے اور کامیڈی شو کیا جاتا ہے، یہ یہ سب دلوں کو مردہ کرنے والوں چیزیں ہیں۔

دوسری حدیث سنن ترمذی کی ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اتق الله حيثما كنت ، أتبع السيئة الحسنة تمحها ، و خالق الناس بخلق حسن (جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو، اور برائی کے پیچھے بھلائی کیا کرو، تاکہ یہ بھلائی اس برائی کو مٹادے، اور لوگوں کے ساتھ بہترین اخلاق سے پیش آؤ، اس حدیث کا خلاصہ ہے، اللہ کے ساتھ اخلاص، اور مخلوق کے ساتھ اخلاق یہ دونوں چیزیں اگر جمع ہو جائیں تو انسان کی کامیابی یقینی ہے۔

تیسری حدیث مسند احمد کی ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اضمنوا لی ستا من أنفسكم ، أضمن لكم الجنة ، اصدقوا إذا حدثتم ، وأوفوا إذا وعدتم ، وأدوا إذا اؤتمنتم ، واحفظوا فروجكم ، وغضوا أبصاركم ، وكفوا أيديكم (حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میرے لئے اپنی طرف سے چھ چیزوں کی ضمانت لو، تو میں تمہارے لئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں: (١) جب بات کرو تو سچ کہا کرو (٢) جب وعدہ کرو اسے پورا کرو (٣) جب بھی تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو امانت ادا کرو (٤) اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو (٥) اپنی نگاہوں کو پست رکھو (٦) اپنے ہاتھوں کو حرام سے روکو۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

درود وسلام کی کثرت
مسائل کے حل کرنے کا نسخۂ کیمیا

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد، فقد قال الله تعالى : "اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰۤئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً (الأحزاب : ٥٦)

اللّٰهم صلِّ على محمد وعلى آل محمد كما صليتَ على إبراهيم وعلى آل إبراهيم، إنّك حميد مجيد، اللّٰهم بارك على محمد وعلى آل محمد كما باركتَ على إبراهيم و على آل إبراهيم، إنّك حميد مجيد.

حضرات ! جمعہ کے دوسرے خطبہ میں یہ آیت ہم سنتے ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک اللہ اپنے نبی پر رحمت اتارتے ہیں، فرشتے بھی رحمت کی دعا کرتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود وسلام بھیجا کرو۔

صلاۃ وسلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کی جانے والی اعلیٰ درجہ کی ایک دعا ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت کی علامت ہے، شریعت کا کوئی بڑا سے بڑا حکم ایسا نہیں ہے، جس میں کہا گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے ایسا کرتے ہیں، تم بھی ایسا کرو، صرف درود شریف بھیجنے میں اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ رحمت اتارتا ہے، فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی درود وسلام بھیجو، اسی وجہ سے فقہاء کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۂ احزاب کی رو سے رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام بھیجنا ہر امتی پر فرض ہے، پوری زندگی میں ایک بار فرض، اور ہر مجلس میں ایک بار درود پڑھنا واجب، اور جب جب نام آئے تو درود

بھیجنا مستحب، جامع ترمذی میں ہے کہ سب سے بڑا بخیل اور کنجوس وہ ہے جس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہو اور وہ ذرا سی زبان کو بھی ہلا کر درود نہ بھیجے، اور ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف لے جا رہے تھے کہ جبریل آئے اور انہوں نے کہا کہ وہ شخص ہلاک ہو جس کے سامنے آپ کا ذکر ہو اور درود نہ بھیجے، آپ ﷺ نے آمین کہا، اور قیامت میں اللہ کے رسول ﷺ کا سب سے زیادہ قریبی اور ان کا حق رکھنے والا وہ ہوگا جو درود کی کثرت رکھے گا، اور درود پڑھنے والے کو آپ ﷺ کی شفاعت حاصل ہوگی (سنن ترمذی: ۴۸۴)

حضرات! اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں پھلوں اور پھولوں کو الگ الگ رنگیں دی ہیں، اور ان میں مختلف قسم کی خوشبوئیں رکھی ہیں (ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است) اسی طرح مختلف عبادات اور اذکار و دعوات کے الگ الگ خواص و برکات ہیں، درود شریف کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ خلوص دل سے اس کی کثرت اور زیادتی، اللہ کی خاص نظر رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ، رسول اللہ ﷺ سے روحانی قرب کا وسیلہ ہے، ذرا غور کیجئے کہ اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ ایک شخص ہے جو آپ کے لئے اور آپ کے خاندان والوں کے لئے اچھی سے اچھی دعائیں کرتا ہے، اور اپنے لئے اُتنا نہیں مانگتا جتنا وہ آپ کے لئے مانگتا اور یہ اس کا محبوب مشغلہ ہے، تو آپ کے دل میں محبت و خیر خواہی کا کیسا جذبہ پیدا ہوگا، اسی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ کا جو بندہ ایمان واخلاص کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پر کثرت سے درود وسلام بھیجے، اس پر آپ کی کیسی نظر عنایت ہوگی، اور قیامت وآخرت میں اس کے ساتھ آپ کا معاملہ کیا ہوگا، اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ سے محبوبیت کا جو مقام حاصل ہے اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اس بندہ سے اللہ کتنا خوش ہوگا اور کیسا اکرام کرے گا۔

حضرات! درود وسلام اگر چہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں ایک دعا ہے، لیکن جس طرح کسی دوسرے کے لئے دعا کرنے کا اصلی مقصد اس کو نفع پہونچانا ہوتا ہے، اسی طرح درود وسلام بھیجنے کا مقصد آپ کی ذات کو نفع پہونچانا نہیں ہوتا، بادشاہوں کو فقیروں، مسکینوں کے تحفوں کی کیا ضرورت، بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ہم پر حق ہے کہ ہم اس کی

بندگی کریں اور اس سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا ، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے احسانات اور کمالات کا یہ حق ہے کہ ہر امتی آپ کے حضور میں درود وسلام پیش کرے ،اس کا مقصد آپ ﷺ کو فائدہ پہونچانا نہیں ہوتا ، بلکہ اپنا فائدہ ہوتا ہے ۔ درود پیش کرنے سے اللہ کا قرب بڑھتا ہے،اور اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

ایک دوسرا نکتہ درود وسلام پیش کرنے کا یہ بھی ہے کہ اس سے شرک کی جڑ کٹتی ہے، یہ حقیقت ہے کہ انبیاء اللہ کے بعد محترم ہستیاں ہیں ، اور محمد رسول اللہ ﷺ ان میں سب سے افضل ہیں، جب آپ پر درود وسلام بھیجنے کی بات کہی جا رہی ہے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی رحمت الٰہی کے محتاج ہیں، پھر انسان کے سامنے ان کو خدائی میں شریک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

حضرات ! درود وسلام کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے، صحیح مسلم کی روایت ہے، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بندہ مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس بار رحمتیں بھیجتا ہے (حدیث:۹۳۹) سنن نسائی میں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بندہ مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اللہ اس پر دس رحمتیں بھیجتے ہیں اور دس خطائیں معاف فرماتے ہیں اور دس درجے بلند کرتے ہیں۔

درود وسلام سے متعلق بے شمار حدیثیں موجود ہیں، لیکن ان میں درود ابراہیمی کو اولیت حاصل ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، مشہور تابعی عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی حضرت کعب بن عجرہ سے ملاقات ہوئی، حضرت کعب نے کہا کہ کیا میں تم کو تحفہ نہ پیش کروں؟ عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ نے کہا: ضرور، انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم نماز میں التحیات میں السلامُ علیك أیها النبیُّ پڑھتے ہیں، اس میں سلام کا طریقہ آ گیا، لیکن ہم درود کیسے پڑھیں؟ آپ نے فرمایا: پڑھو: "اللّٰهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على إبراهيم وعلى آل إبراهيم، إنك حميد مجيد، اللّٰهم بارك على محمد كما باركتَ على

إبراهيم و على آل إبراهيم إنّك حميد مجيد (سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ:۹۷۸)

حضرات! آج دنیا میں ہر شخص پریشان ہے، نوع بنوع کے مسائل میں گھرا ہوا ہے، جس سے پوچھئے وہ دسیوں مسائل کا شکوہ کرتا ہے، ایسے وقت میں اگر حصول مقصد کے لئے دعاؤں کی جگہ درود وسلام پڑھا جائے اور کثرت سے پڑھا جائے تو یہ مسائل دور ہو جائیں گے، حضرت ابی بن کعب جلیل القدر صحابی ہیں، بہت زیادہ دعا کرنے والے ہیں، انہوں نے اپنی عبادت میں ایک حصہ دعا کے لئے خاص کر لیا تھا، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے کہنے لگے یا رسول اللہ! ہم دعاؤں میں مشغول رہتے ہیں، کتنا حصہ درود وسلام کے لئے نکالیں، آپ نے فرمایا: جتنا چاہو، انہوں نے کہا: کیا چوتھائی؟ آپ نے فرمایا: جتنا چاہو، اگر زیادہ کرو تو بہتر ہے، انہوں نے کہا: آدھا؟ آپ نے فرمایا: جتنا چاہو، اگر زیادہ کرو تو بہتر ہے، انہوں نے کہا: دو تہائی؟ آپ نے فرمایا: جتنا چاہو، اگر زیادہ کرو تو بہتر ہے، انہوں نے کہا: تب تو میں دعا کا پورا حصہ درود وسلام کے لئے خاص کرتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: درود وسلام کی برکت سے سارے معاملات غیب سے درست ہو جائیں گے، اور گناہ معاف ہو جائیں گے (إذاً يُكفى همُّك و يُغفر ذنبُك) (جامع ترمذی:۲۴۵۷)

حضرات! درود وسلام دعا کی قبولیت کا بھی ذریعہ ہے، دعا کے آداب میں ہے کہ انسان اللہ کی حمد وثنا کرے، اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے، پھر اپنی غرض رکھے، حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ دعا آسمان وزمین کے درمیان لٹکی رہتی ہے، جب تک رسول اللہ ﷺ پر درود نہ پڑھی جائے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اخیر میں درود پڑھنا چاہئے، تاکہ دعا قبول ہو، یہ اللہ کی غیرت کے خلاف ہے کہ اول وآخر میں درود ہو، اور وہ قبول کی جائے اور دعا قبول نہ کی جائے۔

دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو درود وسلام کو کثرت سے پڑھنے اور اس کی برکتوں سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اوران کی عظمت شان

الحمد للّٰه ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! فأعوذ باللّٰه من الشّيطٰن الرجيم، بسم اللّٰه الرحمن الرحيم: "وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ، وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ." (التوبة: ١٠٠)

(مہاجرینؔ وانصار میں سے جوسابق ومقدم ہیں اور جتنے لوگوں نے نیک کرداری میں ان کی پیروی کی ہے، ان سب سے اللہ راضی ہوا، اوروہ سب اس سے راضی ہوئے)

حضرات! دنیا میں بے شمار انبیاء اور رسول آئے، اس کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں، سپہ سالار ہیں، ملکوں کو فتح کرنے والے ہیں، حکماء اور فلاسفر ہیں، مصلحین اور ریفارمرس ہیں اوران کے ماننے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ۲۳/سالہ عرصہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جونسل تیار کی ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل تقلید، قابلِ فخر، قابل تعظیم اور قابل نمونہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ کی توصیف میں فرمایا: أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ، خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، أَبَرُّ النَّاسِ قُلُوْباً، وَأَعْمَقُهُمْ عِلْماً، وَأَقَلُّهُمْ تَكَلُّفاً (وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں، اس امت کے بہترین افراد، دلوں کے اعتبار سے نیک، علم کے اعتبار سے گہرے، اور تکلف کے اعتبار سے کم) اور دوسری جگہ ان کی توصیف ہی میں یہ اثر موجود ہے کہ: إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ إِلَى قُلُوْبِ الْعِبَادِ، فَاخْتَارَ مُحَمَّداً لِدِيْنِهِ، فانْتَخَبَهُ بِرِسَالَتِهِ، وَانْتَخَبَهُ بِعِلْمِهِ، ثُمَّ نَظَرَ إِلَى قُلُوْبِ النَّاسِ بَعْدَهُ، اخْتَارَ لَهُ أَصْحَاباً، فَجَعَلَهُمْ أَنْصَارَ دِيْنِهِ وَرِسَالَتِهِ (اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں کو دیکھا تو محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنے دین کے

لئے، اوراپنی رسالت کے لئے منتخب کیا، پھر لوگوں کے دلوں کو دیکھا تو صحابہ کرام کو ان کے رفقاء کے طور پر منتخب کیا، اوران کو دین کا حامی ومددگار بنایا)

حضرات: صحابیت نام ہے اس صحبتِ رسول کا، جو ایمان کی حالت میں حاصل ہوئی ہو، اوراسی پر اس کے حامل کا انتقال ہوا ہو۔

جس طرح نبوت کا دروازہ بند ہوگیا ہے، اورکوئی نبی نہیں آئے گا، اسی طرح صحابیت کا دروازہ بھی بند ہوگیا ہے، اور یہ ایسا عظیم شرف وامتیاز ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِيْ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَوْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباً مَا أَدْرَكَ مُدَّ أَحَدٍ وَلَا نَصِيْفَه. (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ: ٦٦٥٢) (میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہو، کیونکہ تم میں سے کوئی شخص اگر احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کردے تو ان کے مرتبہ کی ایک مد یا اس کے آدھے کو بھی نہیں پہونچ سکتا)

حضرات! قرآن نے صحابہ کو خیر امت کہا، قرآن نے صحابہ کو "اُمۃً وسطاً" کہا، قرآن نے صحابہ کو "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کا پروانہ دیا، صحابہ دین کی آن ہیں، صحابہ اسلام کی شان ہیں، صحابہ آبروئے دین وایمان ہیں، صحابہ مقربین بارگاہ رحمٰن ہیں، یہ وہ جماعت ہے جس کے بغیر اسلام کی عمارت نامکمل ہے، اللہ تعالیٰ محدث جلیل حضرت ابوزرعہ رازیؒ کی تربت ٹھنڈی رکھے، جنہوں نے کہا: جب کسی کو دیکھو کہ وہ کسی صحابی رسول ﷺ کی تنقیص کررہا ہو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے، اس لئے کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے، اوران کے پہونچانے والے صحابہ ہیں، علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ جس نے صحابہؓ کو مطعون کیا، وہ دینِ اسلام سے نکل گیا

حضرات! صحابہ کرامؓ کا ایمان اعلیٰ درجہ کا ایمان ہے، قرآن کریم کہتا ہے کہ "فَاِنْ آمَنُوْا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا." (البقرة: ١٣٧) (اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان رکھتے ہو تو بے شک وہ راہ پا گئے)۔

صحابۂ کرامؓ کی فضیلت سورۂ فتح کی آخری آیت سے معلوم ہوتی ہے: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ مَعَهُ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ، تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً، يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَّ اللّٰهِ وَرِضْوَاناً." (سورۂ فتح: ۲۹) (محمد اللہ کے رسول

ہیں، اور جوان کے ساتھ ہیں، کافروں پر سخت، باہم مومنوں پر مہربان، رکوع وسجدہ کے
پابند، اللہ کے اوراس کے فضل کے متلاشی، اوران کی روحانی علامات ان کے روحانی چہروں
سے نمایاں ہیں، توراۃ وانجیل میں ان کی مثال ہے، وہ ایک پودے کی طرح ہیں، جو فطری
مراحل طے کرتا ہے، اللہ اور رسول ان کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، کفار ان کو دیکھ کر جلتے
ہیں۔ اللہ نے ان سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے)

حضرات! سارے صحابہ کرامؓ انصاف پرور ہیں، سارے صحابہ قابل تعظیم ہیں،
لیکن ان کے آپس میں فرق مراتب ہیں، خلفاء راشدین کے فضائل احادیث میں موجود
ہیں، سب سے پہلے خلفائے راشدین ہیں، اس کے بعد عشرۂ مبشرہ وغیرہ، خلفائے
راشدین کی ترتیب ترتیبِ الٰہی ہے، قرآن کریم میں آیا ہے: "وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ
لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا، ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ" (سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جارہا
ہے، یہ اندازہ ہے ایک زبردست اور علم والے اللہ کا)

حضرات! جس طرح آسمان کا سورج ہے، اسی طرح اس زمین کے سورج جناب محمد
رسول اللہ ﷺ ہیں، انہوں نے اپنے بعد ایسی نسل تیار کی جو دینِ اسلام کی حفاظت اور تبلیغ میں
منشأ الٰہی کے مطابق کام کرتی رہی، نبی پاک ﷺ کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت
تھی وہ حفاظتِ دین ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھیجا، دوسری چیز کہ
حاملین دین کا مزاج نہ بدلنے پائے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بھیجا، تیسری چیز باکمال
افراد کی فکر، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان غنیؓ کو بھیجا، چوتھی چیز سیاسی اقتدار، اس کے
لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو بھیجا۔ یہ پوری ترتیب ربانی نظام کا حصہ ہے، انھیں کی اتباع
میں ساری بھلائی مضمر ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئی، اور میری امت
۷۳ فرقوں میں بٹے گی، پوچھا گیا کہ کون راہِ راست پر ہے؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے
صحابہ گامزن ہوں وہ جنتیوں کا راستہ ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

شہادت ہے مطلوب ومقصودِ مؤمن

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء
والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم
الدين، أما بعد: فقد قال الله تعالىٰ: "وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَاءٌ، وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُوْنَ." (البقرة: ١٥٤) (اور جو لوگ اللہ
کی راہ میں قتل ہوجائیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، البتہ تم ادراک نہیں کرسکتے)

حضرات! ہر مسلمان نماز میں یہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے سیدھا راستہ دکھا
دے، سیدھا راستہ یعنی صراط مستقیم، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا: وہ راستہ نہ
یہودیوں کا ہے نہ عیسائیوں کا، وہ راستہ اللہ کی اطاعت کرنے والے نیک بندوں کا ہے،
نیک بندے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں: "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ
وَالصَّالِحِيْنَ، وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقاً." (النساء: ٦٩)

حضرات! اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں میں شہداء بھی ہیں، شہید کہتے ہیں اس کو جو
راہ خدا میں اخلاص کے ساتھ اپنی جان نچھاور کردے، شہادت موت کا اعلی درجہ ہے،
شہادت دلیلِ ایمان ہے، شہادت محبوبیت کا مظہر ہے، شہادت استقامت وعزم کی علامت
ہے، شہادت سندِ مظلومیت ہے، شہادت مطلوب ومقصود مؤمن ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ
تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ، وَعْداً عَلَيْهِ
حَقًّا فِی التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ." (التوبة: ١١١) (بلاشبہ اللہ نے مومنوں
سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس کے عوض میں کہ انھیں جنت ملے گی،

یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، سو کبھی مار ڈالتے ہیں، اور کبھی مار ڈالے جاتے ہیں، اسی پر ہماری طرف سے سچا وعدہ ہے، توریت اور انجیل اور قرآن میں)

حضرات ! احادیث مبارکہ میں شہادت کی فضیلت متعدد الفاظ میں آئی ہے، بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں داخل ہونے کے بعد کوئی انسان یہ نہیں چاہے گا کہ وہ دنیا میں واپس آئے یا دنیا کی کوئی چیز اس کو دی جائے، البتہ شہید ضرور تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں دس مرتبہ لوٹایا جائے، اور دس مرتبہ شہید کیا جائے، ان انعامات کو دیکھ کر جو شہادت پر اس کو ملے ہیں۔

بخاری کی ایک دوسری روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان اور رسولوں کی تصدیق کی بنا پر اللہ کی راہ میں جہاد کے واسطے نکلنے والے کے لئے یہ بات اللہ تعالی نے لکھ دی ہے کہ یا تو وہ ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ فتح یاب لوٹائے گا، یا اگر وہ شہید ہو گیا تو اس کو جنت میں داخل کرے گا، اور آپ ﷺ نے مزید فرمایا: اگر مجھے امت کے مشقت میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں جہاد کے کسی سفر سے پیچھے نہ رہتا، بلکہ ہر چھوٹے بڑے موقع پر صحابہ کے ساتھ نکلتا، اور میری تمنا ہے کہ میں اللہ کے راستہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں۔

مسند احمد کی روایت ہے کہ حضرت عبادہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہید کے لئے اللہ تعالی کی طرف سے سات انعامات ہوتے ہیں:

۱۔ خون کا فوارا نکلتے ہی اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

۲۔ جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھا دیا جاتا ہے۔

۳۔ اس کو ایمانی جوڑا پہنایا جاتا ہے۔

۴۔ عذاب قبر سے پناہ دی جاتی ہے۔

۵۔ اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا۔

۶۔ اس کی ۷۲؍حوروں سے شادی کرائی جائے گی۔

۷۔ اس کے اہل خانہ کے بارے میں اس کی سفارش قبول کی جائے گی۔

حضرات! ان انعامات اور نوازشوں کی وجہ سے خود رسول اللہ ﷺ نے شہادت کی تمنا کی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا مانگا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيْلِكَ، وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بِلَادِ رَسُوْلِكَ." (بخاری: ۸۹۰) (اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما، اور میری موت شہر مدینہ میں ہو) شہادت کی تمنا کرنا ایمان کی علامت ہے، صحیح مسلم کی روایت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِالْغَزْوِ مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ" (جس مسلمان نے نہ کبھی جہاد کی، اور نہ اس کے دل کبھی اس کا خیال آیا اور وہ مر گیا تو وہ ایک طرح سے نفاق پر مرا)

لیکن جو شخص شہادت کی تمنا رکھے، اور بستر ہی پر اس کی موت ہو تو اللہ تعالی اس کو شہادت کا درجہ عطا فرمائیں گے۔

حضرات ! اسلام کی تاریخ شہدائے اسلام کے زریں تذکرہ سے معمور ہے، حضرت سمیہؓ سے لے کر سیدنا حسینؓ تک شہدائے اسلام کی لمبی تاریخ ہے، جو ہر ایمان والوں کے لئے باعث زینت ہے، خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، عاشورا کے دن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل خانہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، دونوں بھائیوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے قابل تعریف، قابل تحسین اور قابل فخر کارنامہ انجام دیا، ایک نے اختلاف کو دور کرنے کے لئے عہدہ اور منصب کی قربانی دی، اور دوسرے نے دین کی شان کو باقی رکھنے کے لئے اپنی گردن کٹا دی، بلاشبہ وہ راہِ حق کے شہید ہیں، اور ان کا کردار قیامت تک کے لئے لاثانی اور لافانی ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمين

شہدائے اسلام اور ان کی راہِ عزیمت

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد ، فقد قال الله تعالى :ولا تقولوا لمن يقتل فى سبيل الله أموات ، بل أحياء ولكن لا تشعرون (البقرة ١٥٤۔)(جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہو جائیں ان کو مردہ نہ کہو ،وہ زندہ ہیں، البتہ تم سمجھتے نہیں ہو)۔

محترم حضرات! اللہ تعالی نے قرآن کریم میں چار مقبول بندوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن پر اللہ کا خصوصی انعام و اکرام ہوتا ہے، اور ان کو پوری کائنات کے لئے نمونہ اور آئیڈیل بنایا گیا ہے: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، انبیاء وہ ہوتے ہیں جو اللہ کا پیغام بندوں تک پہونچانے کے لئے ہر زمانہ میں بھیجے جاتے رہے ہیں، وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد میں آتے رہے، سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ ہیں، اللہ کے مقبول بندوں میں دوسرے نمبر پر صدیقین ہیں، جو پورے کے پورے دین کو بغیر کسی شک و شبہ اور خلجان کے مان لے، قرآن کے مطابق حضرت مریم کو صدیقہ کہا گیا ہے، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی تصدیق و تائید کی وجہ سے صدیق اکبر کہلائے، صالحین وہ ہیں جن کی نیکیاں برائیوں پر غالب ہوں، اور اپنی زبان اور نفس کی صفائی کر چکے ہیں، اللہ کے نیک بندوں کی چوتھی قسم شہداء کی ہے، شہداء وہ ہیں جو اپنی جان کو اللہ کے دین کے قربان کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالی فرماتا ہے: ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين ، وحسن أولئك رفيقا (النساء:٦٩)(اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول ﷺ کا، سو وہ ان کے ساتھ

ہیں، جن پر اللہ تعالی نے انعام کیا ہے، وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، اور اچھی ہے ان کی رفاقت)۔

حضرات! اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی کوشش میں اپنی جان کو قربان کر دینے کا نام شہادت ہے، شہادت موت کا اعلی درجہ ہے، شہادت ایمان پر استقامت کی علامت ہے، شہادت مظلومیت کی دلیل ہے، اور علامہ اقبال کی زبان میں شہادت مقصود و مطلوب مؤمن ہے، قرآن کریم کے مطابق شہداء زندہ جاوید ہوتے ہیں، اللہ تعالی کی طرف سے ان کو رزق دیا جاتا ہے، ابدی اور دائمی اطمینان میں ہوتے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالی نے سورۂ توبہ میں فرمایا ہے: إن الله اشترى من المؤمنين أنفسهم و أموالهم بأن لهم الجنة (بے شک اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان اور مال کو خرید لیا ہے کہ ان کے لئے جنت ہے، (التوبہ:۱۱۱) صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ وہ دنیا میں واپس آئے، یا دنیا کی کوئی چیز اس کو دی جائے سوائے شہید کے، وہ تمنا کرے گا کہ دس مرتبہ اسے دنیا میں لوٹایا جائے، اور دس مرتبہ شہید کیا جائے ان انعامات کو دیکھ کر جو اس کو شہادت پر ملے ہیں۔ شہادت ایسی عظیم نعمت ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی تمنا کی ہے، صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میری دلی خواہش ہے کہ مجھے شہید کیا جائے، پھر زندہ کیا جائے، پھر شہید کیا جائے اور پھر زندہ کیا جائے۔

حضرات! اسلامی تاریخ شہداء کے تاریخی اور سنہرے تذکرہ سے بھری ہوئی ہے، قرآن کریم میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، سورۂ بروج میں اللہ تعالی نے اصحاب الأخدود کا تذکرہ فرمایا ہے، دہکتی ہوئی آگ میں جن کو ڈالا گیا اور وہ اپنے اسلام اور ایمان سے نہیں پھرے وہ صاحب ایمان افراد تھے، حضرت زکریا اور حضرت یحیی علیہ السلام کو ان کی قوم نے شہید کیا، سیرت طیبہ میں متعدد صحابہ کرام ہیں، جن کو اللہ تعالی نے شوق شہادت سے سرفراز

فرمایا،مکی دور میں حضرت سمیہ بن خباط تھی،ان کے شوہر یاسر تھے، بیٹے عمار تھے،حضرت سمیہ کے ایمان لانے کے نتیجہ میں ابوجہل بد بخت نے ان کو نیزہ مارا اور وہ شہید ہوئیں،اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ صبرا یا آل یاسر فإن موعدكم الجنة (اے آل یاسر! صبر کرو، کیونکہ تمہارا ٹھکانہ جنت ہے) غزوۂ بدر میں چودہ افراد شہید ہوئے،جن میں آٹھ انصار اور چھ مہاجرین تھے،اس موقع پر بعض لوگوں نے کہا کہ فلان مرگیا، فلاں مرگیا،اللہ تعالی نے سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل فرمائی: ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله أموات، بل أحياء ولكن لا تشعرون (جولوگ اللہ کے راستہ میں شہید کردیئے جائیں ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں،لیکن تمہیں احساس نہیں)۔

حضرات! اسلام کی دوسری بڑی جنگ احد ہے،اس میں تقریبا ستر صحابہ شہید ہوئے،جن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے،جو سید الشھداء یعنی شہیدوں کے سردار کے نام سے مشہور ہوئے،انہوں نے ستاون سال کی عمر پائی،حضرت حمزہ کون ہیں، یہ رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں،ان کے اسلام لانے کا واقعہ بھی عجیب ہے کہ ابوجہل نے حضرت محمد ﷺ کو کچھ کہا،ایک باندی نے حضرت حمزہ کو خبر دی،اور اس سے اتنا زیادہ متأثر ہوئے کہ ابوجہل کی خبر لی اور اس کے بعد اسلام قبول کرلیا، یہ سنہ ۶ نبوی کی بات ہے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب دار ارقم میں تشریف لائے تو حضرت حمزہ وہاں تھے،آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی،اور وہاں تمام غزوات میں پیش پیش رہے،غزوہ بدر میں عتبہ،شیبہ اور ولید سامنے آئے تو عتبہ کو ایک ہی وار میں واصل جہنم کردیا،لیکن غزوۂ احد میں وحشی کے نیزہ سے شہید ہوئے۔غزوۂ احد کے شہداء میں داعی اسلام مصعب بن عمیر بھی تھے،اسلام سے پہلے بڑے نستعلیق نوجوان تھے ،رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا: عمیر سے زیادہ حسین وخوبصورت،خوش پاشاک اور ناز ونعمت میں پلا ہوا کسی کو نہیں دیکھا،لیکن جب اسلام قبول کیا تو ساری چیزوں سے دستبردار ہوگئے،اسلام لانے کے بعد جب انہیں زیادہ ستایا گیا تو حبشہ کی طرف ہجرت

کی، کچھ سالوں کے بعد وہاں سے مکہ آئے اور ان کو مدینہ منورہ سب سے پہلے داعی کی حیثیت سے بھیجا گیا،اور جاکر انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی،اور پورا مدینہ اسلام کا ہمنوا ہوگیا، غزوۂ احد میں اسلام پرچم حضرت مصعبؓ کے ہاتھ میں تھا،اور ابن قمئہ کی تلوار سے آپ شہید ہوئے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ احد میں جو تمہارے بھائی شہید ہوئے ان کی ارواح کو اللہ نے سبز پرندوں کے جسم میں رکھ کر آزاد کردیا ہے،وہ جنت کے باغوں اور نہروں میں اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔

حضرات! شہدائے اسلام میں بئر معونہ میں شہید کئے جانے والے ستر قرائے صحابہ ہیں،شہدائے اسلام سریہ رجیع کے شہداء ہیں،جن میں حضرت خبیب بن عدی اور زید بن دثنہ کو سولی پر چڑھایا گیا، زید بن دثنہ سے اور بعض روایات کے مطابق حضرت خبیب سے ایک مشرک نے سولی دیئے جانے سے پہلے سوال کیا کہا کہ کیا تم یہ پسند کرتے وہ کہ تمہاری جگہ پر محمد ہوں اور تم چھوٹ جاؤ،انہوں نے بروقت جواب دیا تھا کہ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ محمد کے تلووں میں ایک کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے گھر میں چین سے بیٹھا رہا،شہدائے اسلام میں غزوۂ موتہ کے شہداء بھی ہیں،جن میں حضرت زید بن حارثہ،حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے اور اور خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ تین شہیدان راہ وفا ہیں،چاہے حضرت عمر فاروق ہوں،یا سیدنا عثمان ہوں یا سیدنا علی ہوں رضی اللہ عنہم وأرضاھم

کیا لوگ تھے جو راہ وفا سے گذر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

حضرات! محرم الحرام کی دسویں تاریخ جہاں ایک حضرت موسی اوران کی قوم کے فرعون کے ظلم وستم سے آزادی پانے کا دن ہے،اسی طرح سے یہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا دن ہے، دیکھا جائے تو تاریخی لحاظ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی شہید ہیں،انہیں زہر دیا

گیا، انہوں نے اپنی زندگی میں ایسا عظیم کارنامہ انجام دیا، جو رہتی دنیا تک کے لئے صلح و مصالحت کے باب میں یادگار رہے، جب معاشرہ کے کچھ لوگ آپس میں لوگوں کو لڑانا چاہتے تھے تو انہوں نے خلافت سے دستبرداری اختیار کی، اور اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ کی اور بلاشبہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إن ابنی هذا سید سیصلح الله به بین فئتین من المسلمین (میرا یہ نواسہ سردار ہے، عنقریب اللہ تعالی اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا)، اور جہاں تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے انہوں نے یزید کے مقابلہ میں بیعت نہ کر کے رہتی دنیا کے لئے عزیمت کا ایک قابل فخر نمونہ چھوڑ دیا کہ حق پر قائم رہنا اور باطل سے مقابلہ کرنا ہی اصلی ایمان ہے، بڑی مکاری، عیاری اور دھوکہ دہی سے ان کو کربلا بلایا گیا، اور دس محرم کی تاریخ ۶۱ھ میں ان کو ان کے بہتر افراد خاندان کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے کہ:

جان داد ، نہ داد ، در دست یزید
حقا کہ بنائے لا إلہ است حسین

یعنی جان دیدی لیکن یزید کے ہاتھ ہر بیعت نہیں کی، سچ ہے کہ لا إلہ إلا اللہ کی بنیاد تھے حضرت حسین رضی اللہ عنہ۔

معراج، شعبان ورمضان

واقعۂ معراج اور اس کے نتائج

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصّلاۃ والسّلام علی سیّد الأنبیاء وإمام ا لمرسلین محمد وعلی آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد! فقد قال اللّٰہ تعالی: "وَاِذْ قُلْنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ، وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنَاکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِلنَّاسِ، وَالشَّجَرَۃَ الْمَلْعُوْنَۃَ فِیْ الْقُرْآنِ، وَنُخَوِّفُھُمْ، فَمَا یَزِیْدُھُمْ اِلَّا طُغْیَاناً کَبِیْراً." (الإسراء: ٦٠)

(اس وقت کو یاد کیجئے جب ہم نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کے پروردگار نے ان لوگوں کو گھیر رکھا ہے (لہٰذا ڈرنے کی ضرورت نہیں) اور ہم نے جو مناظر آپ کو دکھائے ہیں، اور جس درخت پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے، ان کو ہم نے اِن لوگوں کے لیے آزمائش بنادیا ہے، اور ہم ان کو ڈراتے جارہے ہیں، پھر بھی ان کی سرکشی بڑھتی ہی جارہی ہے)

حضرات! یہ رجب کا مہینہ ہے، رجب کے مہینہ سے تین حیثیتوں سے ہمارا تعلق ہے، ایک تو یہ کہ یہ رمضان سے پہلے کا مہینہ ہے، اور اس کا مقدمہ ہے، معجم اوسط، طبرانی، مسند بزار، بیہقی وغیرہ میں ہے کہ جب یہ مہینہ شروع ہوجاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے: "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْ رَجَبٍ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ." (بیہقی، الجامع فی شعب الایمان: ۳۵۳۴)

اے اللہ! رجب اور شعبان میں ہمارے لئے برکت مقدر فرما اور رمضان تک ہم کو پہونچادے)، دوسرے یہ کہ سال کے بارہ مہینوں میں چار مہینے اسی وقت سے محترم قرار دیئے گئے ہیں، جب سے دنیا کی تخلیق ہوئی۔ ان میں رجب کا مہینہ بھی ہے، جو ثواب میں اضافہ اور گناہ میں زیادتی کا باعث ہے، تیسرے یہ کہ اسی مہینہ کی ایک تاریخ کو اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آیا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رَفرَف (براق) کے ذریعہ آسمانی سفر کرایا گیا، اور یہ عمل راتوں رات مکمل ہوا، قرآن کی سورۂ اسراء اور نجم میں اس کا تذکرہ ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ

الْاَقْصٰی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ، لِنُرِیَہٗ مِنْ آیَاتِنَا ، اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ.“ (الاسراء:۱)(پاک ہے وہ جو اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے اردگرد کو ہم نے بابرکت بنا رکھا ہے، تاکہ اس بندہ کو ہم اپنے بعض عجائب قدرت دکھائیں، بے شک سمیع وبصیر تو بس وہی اللہ ہے) اور سورۂ نجم میں ہے:”وَلَقَدْ رَآہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی، عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَأْوٰی“ (النجم:۱۲-۱۴)(اور انھوں نے اس فرشتے کو ایک بار اور بھی دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ کے قریب کہ اس کے قریب جنت الماوی ہے)

حضرات! معراج کے واقعہ میں بے شمار حیرت انگیز پہلو ہیں:

☆ سب سے پہلے یہ کہ رسول اللہ ﷺ حالتِ بیداری میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ گئے اور وہاں سے ساتوں آسمانوں کا سفر کیا اور واپس بھی آگئے، یہ تعجب کی بات نہیں ہے، کیوں کہ ہم مانتے ہیں کہ انسان کی بنائی ہوئی سواری ایک گھنٹہ میں تین سو میل کی رفتار سے آگے جاسکتی ہے اور تین ہزار میل بلندی پر جہاز اڑ سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو راتوں رات کیسے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جاسکتے، یہی وہ بات تھی جس کو مشرکین بھی نہیں تسلیم کررہے تھے، چنانچہ انھوں نے خوب تمسخر اڑایا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ راتوں رات بیت المقدس، بلکہ آسمان سے ہوکر آیا ہے، تو یہ کوئی قابل یقین بات ہوگی؟ انھوں نے کہا: ہرگز نہیں، کہنے والوں نے کہا کہ محمد ایسا دعویٰ کررہے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اگر وہ کہتے ہیں تو سچ کہتے ہیں، میں نے کبھی بھی اپنی آنکھوں سے فرشتے نہیں دیکھا، لیکن تصدیق کرتا ہوں، تو آخر اس بات کی تصدیق کیوں نہ کرو، جب فرشتہ ان کے پاس دن میں کئی کئی بار آتا ہے، تو یہ اگر ایک بار اوپر چلے جائیں تو کیا تعجب ہے؟ یہی شان صدیقیت ہے جس نے ابوبکر صدیقؓ کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور سمندر سے بھی زیادہ اتھاہ ایمان ویقین والی ہستی بنادیا۔

☆ رسول اللہ ﷺ عمر کے چالیسویں سال میں نبی بنائے گئے اور آپ نے دعوت کے کام کا آغاز کیا، اس راہ میں ان کو بے شمار تکلیفوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا،

آپ کی شریک حیات ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ سے آپ کو بڑا سہارا تھا، ابوطالب جو آپ کے چچا تھے ان کی وجہ سے بنو ہاشم کی پوری تائید حاصل ہے، نبوت کے دسویں سال ان دونوں حضرات کا انتقال ہوگیا، آپ نے اہلِ مکہ کی روش کو دیکھتے ہوئے طائف کا سفر کیا، لیکن وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا، ان تمام باتوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے آپ کی دل داری کے لیے معراج کا شرف بخشا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی اور فتح مندی اہلِ ایمان کا حصہ ہے، اگرچہ ان کو وقتی اور عارضی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

☆ سفر معراج میں جنت ودوزخ کے مشاہدہ کے دوران مختلف گناہ گاروں کے احوال بھی دکھائے گئے، سنن ابی داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس رات مجھے معراج کرائی گئی، میں ایسے لوگوں پر گذرا، جن کے ناخن تانبے کے تھے، وہ اپنے چہروں اور سینوں کو چھیل رہے تھے، میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ لوگ جو لوگوں کے گوشت کھاتے ہیں یعنی ان کی غیبت کرتے ہیں اور ان کی بے آبروئی میں پڑے رہتے ہیں، غور کرلیا جائے کہ ہمارا معاشرہ کس قدر اس مرض میں گلے گلے ڈوبا ہوا ہے، غیبت کرنا ایک فیشن بن گیا، ہمارا حال یہ ہوگیا کہ تین آدمی ایک ساتھ رہتے ہیں، ایک آدمی اگر اٹھ کر جاتا ہے تو غیبت اسی تیسرے شخص کی شروع ہوجاتی ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کی غیبت کی جائے اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کے گناہ معاف بھی نہیں ہوں گے۔

☆ معراج کے تحفوں میں یہ ہے کہ جو شخص بھی صدق دل سے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کہے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور اسے جنت میں داخل کریں گے، اس میں کلمہ طیبہ کی اہمیت اور ایمان کی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے، گویا ایمان بنیاد ہے، اسی پر سارے اعمال کا انحصار ہے۔

☆ دوسرا تحفہ یہ کہ سورۂ بقرہ کی آخری آیات (آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ سے آخر تک) دی گئی ہیں، اس میں بھی ایمان لانے والوں کا تذکرہ اور اللہ کے حضور میں حاضر ہوکر بندگی کیسے کی جائے، اس کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

☆ معراج کا عظیم تحفہ نماز ہے، یہ ایمان والوں کی معراج ہے، نماز پڑھئے اور اللہ کے قریب ہوجایئے، اس تحفہ کی عظمت میں یہ پہلو بھی اہم ہے کہ اسلام کے سارے احکامات زمین پر دیئے گئے، لیکن نماز ساتوں آسمان کے بعد سدرۃ المنتہیٰ سے آگے عطا کی گئی۔ شروع میں پچاس وقت کی نمازیں تھیں، لیکن پانچ وقت کی کردی گئی اور ثواب پچاس وقت کا ملے گا۔

حضرات! نماز کئی انبیاء کی شریعت کا جزء رہی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام وغیرہ کے یہاں بھی نماز رہی ہے، بنواسرائیل میں نماز کا نظام رہا، سابقہ امتوں میں دو وقت کی نمازوں (فجر اور عصر) کا تذکرہ آتا ہے، اور دو دو رکعت تھی، شب معراج میں پانچ وقت کی نمازیں عطا کی گئی ہیں، اور جبرئیل امین نے ان اوقات کی تعیین فرمائی، رسول اللہ ﷺ نماز کے بڑے پابند اور اس کی تاکید کرنے والے تھے، وہ فرماتے: "جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلاةِ" (سنن نسائی، کتاب عشرۃ النساء: ۳۹۵۷) (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) حضرت بلالؓ سے کہتے: "أَقِمِ الصَّلَاةَ أَرِحْنَا بِهَا" (سنن ابوداود، کتاب الأدب: ۴۹۸۷) (بلال! نماز قائم کرو، اس سے ہم کو آرام پہنچاؤ) بچوں پر نماز اگرچہ فرض نہیں ہے، لیکن بچپن ہی سے ان کو اس کی عادت ڈالنی چاہیے۔

حضرات! تمام عبادتوں میں نماز کو خاص خصوصیت حاصل ہے، روزہ صرف صحت مندوں پر ہے، بیماروں پر نہیں۔ زکاۃ صاحبِ نصاب پر ہے، غریب پر نہیں۔ حج صرف استطاعت رکھنے والے پر ہے، دوسرے پر نہیں۔ جہاد کا حکم مردوں پر اور جوانوں پر ہے، عورتوں پر نہیں۔ قربانی اہلِ ثروت پر ہے، غریبوں پر نہیں۔ لیکن نماز! صحت مند ہو یا بیمار، جوان ہو یا بوڑھا، طاقتور ہو یا کمزور، مال دار ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، مسافر ہو یا مقیم سب پر ہے۔

واقعہ معراج کا عظیم تحفہ نماز ہے، اس کی قدر کرنا ہی شب معراج کا حق ادا کرنا ہے، بقیہ فضولیات اور لایعنی باتوں میں مشغول ہونا شب معراج کی عظمت کے خلاف ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

شب برأت: فضائل اور آداب

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد، فقد قال رسول الله ﷺ: "اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي دَهْرِكُمْ هٰذَا نَفَحَاتٍ، اَلَا فَتَعَرَّضُوا لَهَا." (معجم کبیر، مرتبہ امام طبرانی) (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سال کے مختلف حصوں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جھونکے چلتے ہیں تو ان کو تم غنیمت سمجھو)

حضرات! اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے سال کے مختلف حصوں کو بابرکت بنایا ہے، سابقہ قوموں کی عمریں زیادہ ہوتی تھیں، چنانچہ وہ اس طویل عرصہ میں اللہ کی مرضیات والے کام کرتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت سے امت محمدیہ کے افراد کی عمریں کم رکھی ہیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اچھے مواقع فراہم کئے ہیں، رمضان، شب قدر، یوم عرفہ، عاشوراء، عشرۂ ذی الحجہ، جمعہ وغیرہ اسی ضمن میں آتے ہیں، سچ ہے کہ اللہ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

حضرات! شعبان کا مہینہ بڑا اہم اور مبارک مہینہ ہے، یہ رمضان سے پہلے اور رجب کے بعد آتا ہے، حضور اکرم ﷺ رجب اور شعبان کے تعلق سے ایک دعا کرتے تھے: اے اللہ! رجب اور شعبان میں ہمارے لئے خیر و برکت کو مقدر فرما، اور رمضان تک پہنچادے۔ شعبان کے مہینے میں حضور اکرم ﷺ کثرت سے روزے رکھتے تھے، ایک مرتبہ پوچھا گیا تو فرمایا کہ بندوں کے اعمال شعبان میں پیش کئے جاتے ہیں، میں پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال پیش ہوں اور میں روزے سے ہوں، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اس مہینے میں موت کے فرشتے کو اس سال دنیا سے رخصت ہونے

والوں کی لسٹ دی جاتی ہے، اس لئے بھی میری خواہش ہے کہ میں روزے سے ہوں۔

شعبان کے روزوں کی حیثیت فرض نمازوں سے پہلے پڑھی جانے والی سنتوں کی سی ہے، چونکہ اس کے بعد رمضان کے فرض روزے ہیں، اس لئے اس مہینے کے روزے سنت مؤکدہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مزید اس مہینے کی خوبی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس مہینے میں ایک رات ایسی ہے جس میں اللہ کی رحمت دھواں دھار برستی ہے، اس لئے اس مہینے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

شب برأت اس رات کو کہتے ہیں جس میں گناہوں سے چھٹکارا ملتا ہے، قرآن کریم میں اس رات کو لیلۃ مبارکۃ (مبارک رات) حضرت عکرمہؒ کی تفسیر کے مطابق کہا گیا ہے، لیکن جمہور مفسرین شب قدر کو مبارک رات کہتے ہیں، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مباک رات تو شب قدر ہے، لیکن اس کی ابتداء شب براءت سے ہو جاتی ہے، اس لئے اس رات کو اہمیت حاصل ہے (ما ثبت بالسنۃ)

اس رات میں توبہ کی نماز، دعا وذکر، تلاوت قرآن، اور قبرستان کی زیارت وغیرہ اعمال مسنون ہیں، قبرستان کی زیارت کے لئے جمگھٹے بنا کر جانا کسی طرح صحیح نہیں، حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ چپکے سے گھر سے نکلے اور جنۃ البقیع گئے، اور وہاں دعاء وغیرہ کی، اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ اور خاموشی کے ساتھ اس کام کو کرنا چاہئے، حضور ﷺ اس طرح نکلے کہ حضرت عائشہ کو بھی خبر نہیں ہوئی، جب قبرستان جانا اس خاموشی کے ساتھ ہے تو آتش بازی کرنا، چراغاں کرنا، اور دیگر بدعات کا ارتکاب کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

اس رات میں ان لوگوں کی بخشش نہیں ہوتی ہے جو شرک کرنے والے، والدین کی نافرمانی کرنے والے، رشتوں کو توڑنے والے ہیں۔

حضرات! پندرہویں شعبان کا روزہ ایک حدیث جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے سے ثابت ہے، اس میں آیا ہے کہ جب شعبان کی پندرہویں رات آئے تو اس

رات میں اللہ کے حضور میں نوافل پڑھو، اور اس دن کو روزہ رکھو، کیونکہ اس رات میں آفتاب غروب ہوتے ہی اللہ تعالی کی خاص تجلی اور رحمت پہلے آسمان پر اتر آتی ہے، اور وہ ارشاد فرماتا ہے کہ کوئی بندہ ہے جو مجھ سے مغفرت اور بخشش طلب کرے، اور میں اس کی مغفرت کا فیصلہ کردوں، کوئی بندہ ہے جو روزی مانگے، اور میں اس کو روزی دینے کا فیصلہ کروں، کوئی بیمار ہے جو مجھ سے صحت وعافیت کا سوال کرے، میں اس کو عافیت عطا کروں، اسی طرح مختلف قسم کے حاجت مندوں کو اللہ پکارتا ہے کہ وہ اس وقت مجھ سے اپنی حاجتیں مانگیں اور میں عطا کروں، غروب آفتاب سے لے کر صبح صادق تک اللہ تعالی کی رحمت اسی طرح اپنے بندوں کو اس رات میں پکارتی رہتی ہے۔

اس مہینے میں اگر کچھ اور روزے رکھ لئے جائیں تو سنت رسول پر عمل بھی ہوگا اور نصف شعبان کے روزے کی اہمیت بھی واضح ہوجائے گی۔

شب برأت کی ایک دعا جس کے الفاظ مسلم شریف میں بھی ہیں وہ یہ ہے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ وَبِكَ وَمِنْكَ، جَلَّ وَجْهُكَ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ (اے اللہ! آپ مجھ سے راضی ہوجائیے کہ کبھی مجھ سے ناراض نہ ہوئیے، اور آپ آج میری معافی کا ایسا اعلان کردیجئے کہ مجھے سزا مت دیجئے، آپ کی ذات عظیم ہے، میں آپ کی ایسی ہی تعریف کررہا ہوں جیسا آپ نے بتایا ہے)

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمين

مبارک رات اور مبارک دن

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد ! فقد قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلَى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعاً، اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ." (الزمر: ۵۳) (آپ میری طرف سے کہہ دیجئے اے میرے بندو! جو اپنی جانوں پر زیادتی کر چکے ہو، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، بے شک اللہ سارے گناہ معاف کر دے گا)

حضرات! یہ اسلامی کلینڈر کا آٹھواں مہینہ ہے، یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہر مہینہ کی کچھ نہ کچھ فضیلت واہمیت رکھی ہے، لیکن شعبان کا مہینہ دو اہم مہینوں کے درمیان ہے، ایک طرف رجب ہے، جو محترم مہینوں میں سے ایک ہے، دوسری طرف رمضان ہے، جس کی فضیلت کی کوئی حد نہیں، سنن ابو داود اور سنن نسائی میں حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رجب اور رمضان کے درمیان ایک ایسا مہینہ ہے، جس کو لوگ عام طور پر غفلت میں گذار دیتے ہیں، حالانکہ وہ مہینہ ایسا ہے کہ اس میں رب العالمین کے حضور بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جب میرے اعمال پیش کئے جائیں تو میں روزہ کی حالت میں رہوں۔

اس مہینہ کی اہم عبادت روزہ ہے، تمام احادیث وروایات کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ماہ شعبان میں نفلی روزے رکھتے ہیں، اتنی کثرت سے کسی اور مہینہ میں نہیں رکھتے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ

رسول اللہ ﷺ ماہ شعبان میں بہت زیادہ روزے اس لئے رکھتے تھے کہ پورے سال میں مرنے والوں کی فہرست اسی ماہ میں ملک الموت کے حوالہ کی جاتی ہے، اس لئے آپ چاہتے تھے کہ جب آپ کی وفات کے بارے میں ملک الموت کو احکامات دیئے جارہے ہوں تو اس وقت روزہ سے ہوں۔

اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ آنے والے رمضان کے سلسلہ میں ذوق وشوق پیدا کرنے کی خاطر شعبان میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھا کرتے تھے، تاکہ دل میں نور اور رمضان کے حوالے سے شوق پیدا ہو، اور اس کے استقبال کا جذبہ ظاہر ہو۔

حضرات! اس مہینہ کی ایک خوبی اور برتری شب براءت ہے، پندرہویں شعبان کے روزہ کی وجہ سے بھی ہے، شب برأت کے معنی ہیں نجات کی رات، چھٹکارے کی رات، عذاب الٰہی سے نجات کی رات، ویسے تو ہر آن اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی رحمت برستی رہتی ہے، اور مغفرت کے لئے بہانہ ڈھونڈتی ہے، لیکن رات کے آخری پہر میں روزانہ اللہ کا خاص کرم ہوتا ہے اس کی عبادت کرنے والوں اور تہجد پڑھنے والوں پر، تہجد پڑھنے والوں پر اللہ کا کیسا انعام ہوتا ہے، اس کو الم السجدہ کی اس آیت سے سمجھے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ، جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الم السجدۃ: ۱۷) (تو کسی نفس کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آنکھوں کی کیسی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے، یہ بدلہ ہے اس عمل کا جو لوگ کرتے تھے) لیکن شعبان کی پندرہویں رات کی فضیلت کی وجہ سے اس رات کی عبادت غیر معمولی اہمیت و فضیلت رکھتی ہے، طبرانی، بیہقی اور ابن ماجہ میں ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب شعبان کی پندرہویں رات آتی ہے، تو اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور اپنی ساری مخلوق کی مغفرت فرمادیتے ہیں، سوائے شرک کرنے والے، اور کینہ رکھنے والے کے، ابن ماجہ میں ہے، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ

آپ نے فرمایا: جب شعبان کی پندرہویں رات آئے تو اس رات میں اللہ تعالیٰ کے حضور نوافل پڑھو، اور اس دن کو روزہ رکھو، کیونکہ غروب آفتاب سے ہی اللہ کی خاص تجلی ہوتی اور اللہ تعالیٰ پہلے آسمان پر اتر آتے ہیں۔

حضرات! اس رات میں کیا کرنا چاہئے: ظاہر کہ ہے اتنی برکت والی رات ہے، تو جس اچھے عمل میں بھی مشغول ہوں گے، باعث اجر وثواب ہے، انفرادی طور پر عبادت کریں، تلاوت کریں، نفلی پڑھیں، توبہ کی نماز پڑھیں، اللہ تعالیٰ سے خاتمہ بالخیر کی دعا مانگیں، نفلی نمازوں میں رکوع اور سجدے کریں، رسول اللہ ﷺ سے یہ اعمال ثابت ہیں۔

ایک بات اس رات میں قبرستان جانے کی ہے، تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ پوری زندگی میں حضرت عائشہؓ کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ قبرستان تشریف لے گئے، اور اکیلے گئے، اس لئے اس شب میں قبرستان جانے کا ثبوت ملتا ہے، پوری زندگی میں تو ایک بار ضرور جانا چاہئے لیکن ہر سال جانے کو ضروری سمجھنا اور جماعت کے ساتھ جانا شرعاً ناجائز ہے۔

وہاں جا کر کیا کرے؟ قبرستان میں داخل ہونے کی دعا پڑھے، اور اہل خانہ اور عام مسلمان مرد وعورت کے لئے مغفرت طلب کرے اور آجائے۔

حضرات! جیسا کہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے پندرہ شعبان کو روزہ رکھنے کے بارے میں آیا ہے، اور اس سلسلہ میں صرف ایک حدیث ہے، جو سند کے لحاظ سے کمزور ہے، محدثین نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شعبان کی پندرہویں تاریخ کا روزہ رکھے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک تو یہ حدیث روزہ سے متعلق مروی ہے، دوسرے یہ کہ یہ ایام بیض میں ہے یعنی ان دنوں میں ہے جن میں رسول اللہ ﷺ سے روزہ رکھنا مسنون ہے (ہر مہینے کی ۱۳-۱۴-۱۵ تاریخیں)، تیسرے یہ کہ اس روزہ میں رمضان کے استقبال کی بھی نیت کرلے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رات کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

شعبان اور اس کی عبادتیں

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد: فقد قال الله تعالى: "وَسَارِعُوٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ." (آل عمران: ۱۳۳)

(اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تیزی سے لپکو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین وآسمان ہے، اور وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے)

حضرات! یہ اسلامی کلینڈر کا آٹھواں مہینہ ہے، اس کو شعبان کے نام سے جانتے ہیں، یہ مہینہ دو مہینوں کے درمیان ہے، ایک طرف رجب ہے جو محترم مہینوں میں ہے، اور دوسری طرف رمضان ہے، جس کی بے شمار فضیلتیں ہیں، سنن ابوداود ونسائی میں حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رجب اور رمضان کے درمیان ایک ایسا مہینہ ہے جس کو لوگ غفلت میں گذار دیتے ہیں، حالانکہ اس میں بندوں کے اعمال رب کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال اس حال میں پیش کئے جائیں کہ میں روزہ سے ہوں۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ بندوں کے دن کے اعمال رات میں پیش کئے جاتے ہیں اور رات کے اعمال دن میں پیش کئے جاتے ہیں، ہفتہ کے اعمال دوشنبہ اور جمعرات کو پیش کئے جاتے ہیں، اور سال کے اعمال پندرہ شعبان کو پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے اس مہینہ میں آپ ﷺ کثرت سے روزہ رکھتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کو رمضان کے بعد شعبان کے مہینے میں روزہ

رکھنا اور مہینوں کے مقابلہ میں زیادہ پسندیدہ تھا، رسول اللہ ﷺ کے شعبان کے مہینہ میں کثرت سے روزہ رکھنے سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے سلسلہ میں ذوق وشوق پیدا کرنا چاہتے ہیں، تاکہ دل تقوی اور خوف خدا سے معمور ہوکر اس کے لئے تیار ہوجائے، اور پھر رمضان کے روزے جو کہ فرض ہیں بڑے اہتمام سے رکھے جائیں۔

حضرات! محدثینِ عظام رمضان سے پہلے شعبان کے روزہ اور رمضان کے بعد شوال کے چھ روزوں کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ جس طرح فرض نمازوں سے پہلے اور ان کے بعد سنتوں اور نفلوں کا نظام ہے، اسی طرح رمضان سے پہلے اور اس کے بعد نفل روزے ہیں، تاکہ رمضان کے فرض روزوں میں اگر کوتاہی ہو تو اس کو نفلی روزوں کے ذریعہ دور کیا جاسکے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رجب ہی سے رمضان کا اشتیاق ظاہر فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ رَجَبٍ وَشَعْبَانَ، وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ (بیہقی، الجامع فی شعب الایمان: ۳۵۳۴) اے اللہ! رجب اور شعبان میں ہمارے لئے برکت مقدر فرما اور رمضان تک ہم کو پہونچادے)

حضرات! اس مہینہ میں ایک رات شب براءت ہے، براءت کے معنی آزادی، چھٹکارا اور نجات کے ہیں، چونکہ اس رات میں اللہ تعالی کی مغفرت اتنی عام ہوتی ہے کہ اللہ ہر طلب گار کی مانگ پوری کرتے ہیں اور اللہ مغفرت فرماتے ہیں، اور بعض روایتوں کے مطابق قبیلۂ کلب کی بکریوں کے بال کے برابر بھی اگر گناہ ہوں تو اللہ تعالی معاف فرماتے ہیں، اس لئے اس کو شب برأت کہتے ہیں۔

پندرہویں رات کی فضیلت دس صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے، اس لئے یہ کہنا کہ اس رات کی فضیلت بالکل ثابت نہیں غلط ہے، اس رات میں کیا کرنا چاہئے؟ اس میں نفل نمازیں پڑھنی چاہئے، قرآن کی تلاوت کرنی چاہئے، اور رسول اکرم ﷺ سے پوری زندگی میں ایک مرتبہ قبرستان جانا بھی ثابت ہے، اس لئے قبرستان بھی جاسکتے ہیں، ایک مرتبہ

حضرت عائشہؓ رات میں اٹھیں، دیکھا تو آپ ﷺ بستر پر موجود نہیں ہیں، تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ آپ بقیع تشریف لے گئے ہیں، یہ دلیل ہے کہ قبرستان جاسکتے ہیں، لیکن ہر سال اسی رات معمول بنا کر جانا مسنون نہیں۔

حضرات! ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ پندرہویں شعبان کے روزے کے سلسلہ میں صرف ایک حدیث ہے، جو ابن ماجہ کی ہے، وہ حضرت علیؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب شعبان کی پندرہویں رات آئے تو اس رات میں اللہ کے حضور میں نوافل پڑھو، اور اس دن کو روزہ رکھو، کیونکہ اس رات میں آفتاب غروب ہوتے ہی اللہ تعالی کی خاص تجلی اور رحمت پہلے آسمان پر اتر آتی ہے، اور وہ ارشاد فرماتا ہے کہ کوئی بندہ ہے جو مجھ سے مغفرت اور بخشش طلب کرے، اور میں اس کی مغفرت کا فیصلہ کردوں، کوئی بندہ ہے جو روزی مانگے، اور میں اس کو روزی دینے کا فیصلہ کروں، کوئی بیمار ہے جو مجھ سے صحت وعافیت کا سوال کرے، میں اس کو عافیت عطا کروں، اسی طرح مختلف قسم کے حاجت مندوں کو اللہ پکارتا ہے کہ وہ اس وقت مجھ سے اپنی حاجتیں مانگیں اور میں عطا کروں، غروب آفتاب سے لے کر صبح صادق تک اللہ تعالی کی رحمت اسی طرح اپنے بندوں کو اس رات میں پکارتی رہتی ہے۔

اس حدیث سے روزہ کا ثبوت ہے، اور یہ ضعیف حدیث ہے، لیکن شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اس حدیث کی بنا پر روزہ رکھے، اور ذہن میں یہ رکھے کہ ہر مہینہ کے پندرہویں دن کا روزہ مسنون ہوتا ہے اور پھر شعبان میں آپ ﷺ روزہ رکھتے تھے، تو یہ تین خوبیوں کو جمع کرنے والا ہوگا۔

الغرض شعبان کا مہینہ رمضان کے قریب ہونے کی وجہ سے استقبال رمضان کے طور پر گذارے جانے کے لائق ہے، اس کی ہمیں کوشش کرنی چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

رمضان المبارک کا استقبال

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ." (البقرة :۸۳) (اے ایمان والو!تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم پرہیز گار بنو)

حضرات! رمضان کی آمد آمد ہے، یہ رحمت وبرکت کا مہینہ ہے، روزہ اور قرآن کا مہینہ ہے، گناہوں سے معافی اور جہنم سے آزادی کا مہینہ ہے، یہ ایسا مہینہ ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس میں شیطان قید کئے جاتے ہیں، جنت آراستہ کی جاتی ہے، مچھلیاں پانی میں استغفار کرتی ہیں، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے اور فرشتے اعلان کرتے ہیں کہ اے خیر اور بھلائی کے طلب گار! آگے آ، اور اے برائی کے طلب گار! پیچھے ہٹ۔

حضرات! جب رمضان اتنی خوبیوں اور خصوصیتوں کا مہینہ ہے تو پھر ہم نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ رمضان کے شروع ہونے کے بہت پہلے سے دعائیں کرتے تھے، شعب الایمان میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب رجب شروع ہوتا تو آپ ﷺ دعا فرماتے تھے، اے اللہ! رجب اور شعبان میں ہمارے لئے بھلائیاں اور نیکیاں طے فرمادیجئے اور رمضان تک پہونچا دیجئے، اور جب رمضان آتا تھا تو آپ سراپا دعا بن جاتے تھے، اور رمضان کو اپنے مالک سے تعلق کو مضبوط کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

صحیحین میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھی، لیکن رمضان میں آپ کی سخاوت زیادہ ہوجاتی، جب جبریل امین سے آپ کی ملاقات ہوتی، اور ان کے ساتھ قرآن کا مذاکرہ کرتے، اور تیز وتند ہوا سے بھی زیادہ آپ ﷺ سخاوت کرتے تھے۔

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت سلمان فارسیؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شعبان کے آخری جمعہ کو یا آخری دن ہم لوگوں کو نصیحت کی، اور فرمایا: تمہارے اوپر ایک مہینہ آرہا ہے، جو بہت بڑا مہینہ ہے، بہت مبارک ہے، اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے کو فرض قرار دیا ہے، اور اس کی رات کے قیام یعنی تراویح کو ثواب کی چیز بنایا ہے، جو شخص اس مہینہ میں کسی نیکی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے تو ایسا ہے کہ غیر رمضان میں اس نے فرض ادا کیا، جو شخص اس مہینہ میں کسی فرض کو ادا کرے تو وہ ایسا ہے کہ غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرے، یہ مہینہ صبر کا ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے، اور یہ مہینہ لوگوں سے غمخواری کا ہے، اس میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے، جو شخص کسی روزہ دار کو روزہ افطار کرائے تو وہ اس کے لئے گناہوں کے معاف ہونے اور آگ سے آزاد کئے جائے کا ذریعہ ہوگا، اور روزہ دار کے ثواب کے مانند اس کا ثواب ہوگا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر شخص اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ روزہ دار کو افطار کرائے تو فرمایا: یہ پیٹ بھر کھلانے پر موقوف نہیں، یہ ثواب اللہ تعالیٰ ایک کھجور افطار کرا دینے یا ایک گھونٹ پانی پلا دینے پر بھی عطا فرمادیتے ہیں، یہ ایسا مہینہ ہے جس کا اول حصہ رحمت کا، درمیانی حصہ مغفرت کا اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا، جو شخص اس مہینہ میں اپنے غلام یا مزدور کے بوجھ کو ہلکا کردے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرماتے ہیں، اس میں چار چیزوں کی کثرت رکھو:

۱۔کلمہ طیبہ ۲۔استغفار ۳۔جنت کی طلب ۴۔جہنم سے پناہ۔

حضرات! ہمارے اسلاف کا معمول استقبال رمضان کے تعلق سے تو عجیب و غریب ہے، ان کے دل رمضان کے مشتاق رہتے تھے، بعض بزرگوں کے بارے میں آتا ہے کہ چھ مہینے رمضان کے استقبال اور انتظار و دعا میں گذارتے اور چھ مہینے اس دعا میں کہ الٰہی! میں نے جو کام کیا ہے، اسے قبول فرمالیجئے۔

حضرات! موجودہ معاشرہ میں دو قسم کے لوگ ہیں: ایک وہ جو رمضان کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے کہ جب رمضان آتا ہے تو ان کو کراہت محسوس ہوتی ہے، ان کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے، اور بڑی بے شرمی، بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ سب کے سامنے کھاتے پیتے ہیں۔

حضرات! استقبال رمضان کی کئی صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ ہم رمضان کے لئے ایک نظام الأوقات بنالیں، خاص طور سے تلاوت قرآن کا، اگر دیگر مہینوں میں ایک پارہ پڑھتے تھے تو رمضان میں دو یا تین پارے کا معمول بنالیں، تاکہ آسانی سے دو یا تین قرآن مکمل ہو جائے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ تراویح کے لئے کسی ایسی مسجد کا انتخاب کریں، جہاں قرآن کریم ٹھہر ٹھہر کر اطمینان کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، پانچ، چھ دن میں قرآن مکمل کر کے بیٹھے رہنا یہ رمضان کی روح کے ساتھ کھلواڑ ہے، تراویح پڑھنا مستقل عبادت ہے، اور پورا قرآن سننا مستقل عبادت۔

تیسری شکل یہ ہے کہ جس طرح ہم رمضان کے لئے بہت سے سامان خریدتے ہیں، بلاشبہ یہ اچھی بات ہے کہ رمضان کے لمحات خریداری میں ضائع نہ ہوں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ رمضان کے مسائل اور احکام جاننے کی کوشش کریں۔

یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ سحری کھانا سنت ہے، اور گھر کے ہر فرد پر روزہ رکھنا ضروری ہے۔

زکاۃ سال میں ایک مرتبہ فرض ہے، لیکن چونکہ رمضان میں فرائض کا ثواب ستر گنا ہو جاتا ہے، اس لئے پہلے سے اس کا حساب لگالیں اور محصلین اور سفراء آئیں تو ان کو پریشان نہ کریں، ان کا احسان ہے کہ وہ آپ کے پاس آگئے، اگر وہ نہ آتے تو کیسے آپ اپنے مال کو پاک کرتے۔

میں نے شروع میں قرآن کریم کی آیت پڑھی، اس میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے، تاکہ تم تقوی شعار ہو جاؤ، صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے اس یقین کے ساتھ رکھے کہ اللہ کا حکم ہے، اور ثواب کی امید بھی رہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں اس مہینہ کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

رمضان کی آمد آمد ہے

الحمد للّٰہ ربّ العالمین ، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعہم بإحسان إلی یوم الدین ، أما بعد ! فقد قال اللّٰہ تعالیٰ: "وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ." (آل عمران: ١٣٣)

(اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سبقت کرو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس کی جنت کی طرف جس کی وسعت زمین وآسمان کے برابر ہے، اور وہ متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے)

حضرات! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ پہلے سے رمضان کے لئے دعائیں کرتے تھے، اور اُس کی آمد پر صحابہ کرامؓ کو مبارکباد دیتے تھے، اور رمضان میں تو سراپا دعا بن جاتے تھے، بلکہ رمضان کو ایسا روحانی مدرسہ بناتے تھے، جس میں آپؐ اپنے رب سے تجدید ملاقات کرتے تھے، صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، لیکن رمضان میں آپ کی سخاوت زیادہ ہوجاتی جب جبرئیل امینؑ سے آپؐ کی ملاقات ہوتی، اور قرآن کا مذاکرہ کرتے، اور تیز وتند ہوا سے بھی زیادہ آپؐ سخاوت کرتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رمضان آتا تو شب بیداری فرماتے، اور اہل خانہ کو بھی جگاتے، اور کمر کس لیتے، اور خود آپؐ نے فرمایا: "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ" (صحیح بخاری) (جو رمضان کے روزے رکھے اللہ کا حکم مانتے ہوئے اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے تو اللہ تعالی اس کے پچھلے گناہ معاف کردے گا)

حضرات! اسلاف کا معمول استقبال رمضان کے سلسلہ میں عجیب وغریب ہے، اُن کے دل رمضان کے مشتاق تھے، بعض مشائخ کے بارے میں آتا ہے کہ چھ مہینے رمضان کے استقبال میں گزارتے تھے، اور چھ مہینے اِس دعا میں کہ الٰہی! میں نے جو کام کیا ہے اُسے قبول فرمالیجئے، بعض مشائخ کا معمول تھا کہ وہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! مجھے رمضان تک صحیح وسالم پہونچادے اور رمضان کو صحیح وسالم بنائے رکھ، اور میری طرف سے اُسے قبول فرما. علمائے سلف میں بعض ایسے گزرے ہیں کہ جب رمضان شروع ہوتا تو کتابیں بند کردیتے اور قرآن کی تلاوت میں مشغول ہوجاتے۔

حضرات! استقبالِ رمضان کیسے کریں؟

پہلا کام یہ ہے کہ ہم رمضان کے لئے تیاری کریں، اور تلاوتِ قرآن کے لئے ایک نظام العمل بنالیں، دوسرا کام یہ ہے کہ تراویح کے لئے کسی مسجد کا انتخاب کریں، کیونکہ تراویح کے لئے روزانہ مسجد بدلنے سے قرآن کی ترتیب اور تسلسل میں محرومی ہوگی، اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ پانچ یا چھ دن میں قرآن ختم کرکے بقیہ دن تراویح کو چھوڑنا بڑے خسارے کی بات ہے۔

نمازِ تہجد سنن موکدہ کے بعد سب سے افضل عمل ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد بڑی طویل ہوا کرتی تھی، نیز صحابہ کرامؓ بھی اُس کا اہتمام فرماتے تھے، سحری کے لئے چونکہ اٹھنا ہے، اِس لئے اُس سے کچھ پہلے اٹھ کر تہجد میں مشغول ہونا بڑے خیر کی بات ہے، اسی طرح افطار اور تہجد کے وقت دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں لہٰذا اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

زکاۃ واجب ہوتی ہے سال پورے ہونے پر، عام طور پر لوگ رمضان میں زکاۃ کے نکالنے کو ترجیح اس لئے دیتے ہیں کہ اس فرض کا ثواب ستر گناہ کردیا جاتا ہے، اِس لئے اس عمل کو بھی رمضان کے شروع ہونے سے پہلے اس کا حساب لگالینا چاہیے۔

اسلام رمضان کے لئے مادّی تیاری سے منع نہیں کرتا، بلکہ اس کی اجازت دیتا ہے،اسی طرح افطاری کے سامان کی خریداری کے لئے رمضان کے قیمتی لمحات کو ضائع کرنا مناسب نہیں، رمضان شروع ہونے سے پہلے ہی اس کا اسٹاک کرلیا جائے، اِس طرح وقت بچے گا اور رمضان کو صحیح طور پر گزارنا ممکن ہوگا۔

رمضان کا استقبال یہ بھی ہے کہ اُس کے مسائل جانے جائیں،اوران کا علم حاصل کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ رمضان کی قدر کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ ربّ العالمين

روزہ کی فرضیت اوراس کے تقاضے

الحمد للہ ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ." (البقرة:۸۳)

شکر وامتنان کے جذبات کہ رمضان کا مہینہ ایک مرتبہ پھر نصیب ہوا

حضرات! اللہ کی فرمانبرداری والے جس طرزِ حیات کا نام اسلام ہے،اس کے بنیادی ارکان میں کلمہ شہادت، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج ہیں،ان ارکان میں روزہ ہر مسلمان عاقل وبالغ مرد وعورت پر فرض ہے، جو اُس کی فرضیت کا انکار کرے وہ مسلمان نہیں رہتا،اور جو بلا عذر اس فرض کو ادا نہ کرے وہ سخت گنہگار رہتا ہے،مشہور ہے: لِكُلِّ شَيۡءٍ زَكَاةٌ وَزَكَاةُ الۡجَسَدِ الصَّوۡمُ (ہر چیز کی زکاۃ ہوتی ہے،اور جسم کی زکاۃ روزہ ہے)

حضرات! روزے کے تین رکن ہیں: روزہ کی نیت کرنا، روزے رکھنے کا زمانہ ہونا یعنی رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنا،اور روزہ توڑنے والی چیزوں سے اجتناب کرنا۔

روزہ توڑنے والی چیزوں میں دو چیزیں ہیں: ایک تو یہ کہ جن سے منع کیا گیا ہے یعنی کھانا، پینا اور نفسانی خواہشات پوری کرنا، ان سے روزہ دار بچے، دوسرے روحانی طور پر جن گناہوں سے منع کیا گیا ہے جیسے لغویات، غیبت، جھوٹ، ان سے انسان دور رہے،اس سے معلوم ہوا کہ صرف کھانے پینے اور نفسانی خواہشات ہی سے نہیں رکنا چاہئے، بلکہ اعضاء وجوارح کا روزہ رکھنا چاہئے،ان کا روزہ یہی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے مطابق استعمال کیا جائے،اسی لئے بعض مفسرین نے كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ کی تفسیر میں

یہ نکتہ لکھا ہے: تمہارے جسم کے ایک ایک عضو اور ایک ایک اَنگ پر روزہ فرض کیا گیا ہے، اس لئے اس مہینے میں کوئی کام روزہ کی روح کے خلاف نہیں ہونا چاہئے۔

حضرات! سابقہ مذاہب میں بھی روزے کا تصور ملتا ہے، ہندو مذہب میں برت کے نام سے روزہ تھا، یہودی مذہب میں اگر کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو روزہ رکھا جاتا، نیز حوادث اور واقعات کے لحاظ سے روزہ یہودی شریعت میں بھی پایا جاتا ہے، محرم کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دی تھی، اس لئے یہودی اس دن روزہ رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جانے سے پہلے چالیس دن کا روزہ رکھا تھا، عیسائی مذہب میں بھی روزہ کا تصور ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کہا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، سابقہ مذاہب میں جو روزے تھے وہ وقفہ وقفہ سے تھے، مسلسل نہیں تھے، اسلام نے پورے ایک مہینہ کے مسلسل روزے فرض کئے، کیونکہ اس سے قوتِ بہیمیہ پر اثر پڑتا ہے اور انسان کے اندر ملکوتی صفات طاقت ور ہوتی ہیں۔

حضرات! روزہ اور قرآن کا ایک دوسرے سے گہرا ربط ہے، دونوں کو ایک دوسرے کا لازم ملزوم قرار دیا گیا ہے، جس طرح روزہ کو طلوع صبح صادق سے جوڑ دیا گیا، اسی طرح وہ مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا، اور وہ ساری انسانیت کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہوا، روزہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ رمضان میں تلاوت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے، یہ مہینہ ہر قسم کی برکتوں کا جامع ہے، انسان کو سال بھر میں جو برکتیں ملتی ہیں، وہ اس کے مقابلہ میں ایسی ہیں، جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ، اس مہینہ میں جمعیت باطنی پورے سال جمعیت باطنی کا ذریعہ ہے، اور اس میں پریشان خاطری پورے سال کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا مشہور جملہ ہے: انسان کو اس مہینہ میں اگر اعمال صالحہ کی توفیق مل جائے تو یہ توفیق سال بھر رہے گی، اور اگر یہ مہینہ بے دلی، فکر و تردد میں گذرا تو پورا سال اسی حال میں گذرنے کا اندیشہ ہے۔

حضرات! روزہ کی فرضیت سنہ ۲ ہجری میں ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو رمضان کے روزے رکھے، قرآن کریم میں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" سے خطاب کیا گیا ہے، تاکہ ذہن تیار ہو جائے، پھر بتایا گیا کہ کوئی نیا حکم نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ پرانا ہی حکم ہے، پھر بتایا گیا کہ گنتی کے چند دن ہیں، جو چند دنوں میں ختم ہو جائیں گے۔

حضرات! ہر چیز کی ایک خصوصیت ہوتی ہے، اور یہ خصوصیت کبھی اس کے نام سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ یہ مہینہ گناہوں کو جھلسا دیتا ہے، اور اس طرح جلا دیتا ہے، جس طرح لکڑی کو آگ جلا دیتی ہے، اسی وجہ سے اس کا نام رمضان پڑا، روزہ کو رمضان کے ساتھ اس وجہ سے خاص کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں ساری آسمانی کتابیں اتاری گئی ہیں، اور قرآن بھی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اسی ماہ میں اتارا گیا، اس لئے اس میں روزے فرض کئے گئے، اور رمضان اور قرآن دونوں قیامت کے دن روزہ دار کے لئے سفارش کریں گے۔

حضرات! روزہ کا مقصد تقویٰ پیدا کرنا ہے، اسلام میں ہر عبادت کا ایک مقصد ہے، نماز کا مقصد برائیوں اور بے حیائیوں سے روکنا ہے، زکاۃ کا مقصد دل کو مال کی محبت سے پاک کرنا اور مال کو بھی پاک کرنا ہے، حج کا مقصد گناہوں سے پاک وصاف کرنا ہے، اس طرح روزہ کا مقصد اللہ کا ڈر، لحاظ اور تقویٰ پیدا کرنا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے: لعلکم تتقون، امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعبؓ سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! کیا آپ کانٹے دار راستے سے کبھی گذرے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں، گذرا ہوں، پوچھا کہ اس وقت کیا کیا؟ کہا: اپنے دامن کو سمیٹ لیا اور گذر گئے، حضرت ابیؓ نے کہا: یہی تقویٰ ہے، دنیا میں انسان ایسی زندگی گذارے کہ حرام کے قریب بھی نہ ہو، اور گناہوں سے دور رہے تو یہی تقویٰ اور خوف خدا ہے۔

حضرات! روزہ ایک مخفی عبادت ہے، نماز ظاہری عبادت ہے، زکاۃ ظاہری عبادت

ہے، حج ظاہری عبادت ہے، لیکن روزہ ایک چھپی ہوئی عبادت ہے، اگر انسان کے اندر اللہ کا ڈر نہ ہو تو اس کا پتہ نہیں چل سکے گا، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے اس کے انعام کے متعلق فرمایا: اَلصَّوۡمُ لِیۡ وَ أَنَا أَجۡزِیۡ بِهِ (صحیح بخاری کتاب التوحید:۷۵۳۸) (روزہ میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا)

حضرات! بزرگوں سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے سوال کیا کہ کیا معلوم کہ ہماری عبادتیں قبول ہوتی ہیں یا نہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ جب ایک کام کے بعد دوسرے کام کی توفیق مل جائے تو پہلا عمل قبول ہوگیا، صحیح مسلم کی روایت بھی ہے: اَلصَّلَوَاتُ الۡخَمۡسُ وَالۡجُمُعَةُ إِلَى الۡجُمُعَةِ، وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِّمَا بَيۡنَهُنَّ مِنَ الۡخَطَايَا، إِذَا اجۡتُنِبَتِ الۡكَبَائِرُ (پانچوں نمازیں اور جمعہ اور رمضان گناہوں کو دور کرنے والے ہیں بشرطیکہ گناہ کبیرہ سے دور رہا جائے)

دوسری بات یہ ہے کہ روزہ رکھ کر انسان کے دل میں نرمی، اخلاق میں تبدیلی اور سرگرمیوں میں فرق آئے تو گویا وہ روزہ مقبول ہے، اور اگر اس کے برعکس مزاج میں کبر وغرور ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری عبادت قبول نہیں ہو رہی ہے۔

رمضان اور روزے کے فضائل ہم نے سنے، اب کچھ آداب اور احکام بھی یاد رکھیں، تاکہ رمضان کے روزے صحیح طور پر ادا ہوں، طبرانی کی روایت ہے: فَاتَّقُوۡا شَهۡرَ رَمَضَانَ، فَإِنَّ الۡحَسَنَاتِ تُضَاعَفُ فِيۡهِ مَا لَا تُضَاعَفُ فِيۡمَا سِوَاهُ، كَذَا السَّيِّئَاتُ (رمضان کا اہتمام کرو، کیونکہ اس میں نیکیاں اس قدر بڑھادی جاتی ہیں، جس قدر دوسرے مہینوں میں نہیں بڑھائی جاتی ہیں، اسی طرح برائیوں کی سزا دوچند کردی جاتی ہے)

حضرات! رمضان کا روزہ رکھنا ہر بالغ، مرد، عورت پر فرض ہے، بلا عذر شرعی اگر روزہ چھوڑ دے اور پوری زندگی بھی روزہ رکھے تو بھی اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

اس لئے گھر کا سربراہ نگرانی کرے کہ اُن کے متعلقین میں کوئی روزہ نہیں چھوڑ رہا

ہے، آج کل غریب طبقہ کے افراد روزہ نہیں رکھتے اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رکشا چلاتے ہیں، اس لئے مشکل ہوتا ہے، اس سلسلے میں ہم کو فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

پورے ماہ تراویح پڑھنا عبادت ہے، اور قرآن سننا مستقل عبادت ہے، آج کل ہوتا یہ ہے کہ پانچ دن میں قرآن سن لیا اور گھر بیٹھ گئے، یہ بہت خطرہ کی بات ہے۔

ہمارا مذہب باہمی ہمدردی کی تعلیم دیتا ہے، ایک دوسرے کا خیال رکھنا اس کی فطرت میں ہے، اس لئے ان کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہئے۔

ہمارے معاشرہ میں ہمارے ساتھ غیر مسلم بھی رہتے ہیں، اب ہم دو بجے سے لاؤڈ اسپیکر میں نعت، قوالی، نظمیں ترانے وغیرہ پڑھنا شروع کردیں تو اس سے خلل واقع ہوتا ہے، اور یہ ایذاء ہے، اور ایذاء پہونچانا حرام ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ انسان تہجد پڑھے اور زور زور سے تلاوت کرے تو یہ بھی ناجائز ہے، اور آج کل جتنے بھی جھگڑے ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

حضرات: سحری اور افطار بھی روزہ کے بنیادی تقاضوں میں ہے، سحری کھانا سنت ہے، اس میں تاخیر ہونی چاہئے، اہل کتاب اور ہمارے روزوں میں سحری کا فرق ہے، اور سحری کھانا باعث برکت وتقویت ہے، اور افطار میں جلدی کرنا بھی مسنون ہے، احتیاطاً تاخیر کی الگ بات ہے، لیکن حد سے زیادہ تاخیر کرنا یہ اللہ کے مقرر کردہ حکم کو نہ ماننا ہے، رمضان میں چار چیزوں کی کثرت ہونی چاہئے: (۱) جنت کی طلب (۱) جہنم سے پناہ (۳) لا الہ الا اللہ کی کثرت (۴) اور استغفار

رمضان کے روزوں کی کوتاہیوں کے ازالے اور عید کی خوشی میں غریبوں اور فقیروں کو شریک کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر مقرر فرمایا ہے، یہ مال کا نہیں، جسم وجان کا صدقہ ہے، اس لئے مسلمانوں کے ہر جسم پر فرض ہے، خواہ مرد

ہو یا عورت، چھوٹے بچے ہوں یا بڑے، امیر ہوں یا غریب، ہر ایک پر صدقۂ فطر واجب ہے، قرآن میں اس کا ثبوت ''قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسۡمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى'' سے ملتا ہے، خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آیت اسی موقع پر اتری ہے، جس طرح نماز میں غلطی ہو تو سجدہ سہو ہوتا ہے، اسی طرح صدقہ فطر روزہ کی غلطیوں کو دور کرنے کے لئے ہے: طُهۡرَةٌ لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغۡوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعۡمَةٌ لِلۡمَسَاكِيۡنِ (سنن ابوداود، کتاب الزکاۃ: ۱۶۱۱) صدقہ فطر واجب ہے اس پر جس پر زکوۃ واجب ہے صاحبِ نصاب پر، صدقہ فطر کی مقدار پونے دو کلو گیہوں ہے، نماز سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے، اگر نماز کے بعد ادا کیا تو عام صدقہ کا ثواب ملے گا۔

حضرات! سارے اعمال کرنے کے بعد یہ احساس تازہ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلیت اصل نہیں، قبولیت اصل ہے، اور قبولیت دعا، تقویٰ، اور اخلاص سے آتی ہے۔

اعمال کی قبولیت کے بنیادی شرائط یہ ہیں: جو عمل کیا جا رہا ہے وہ شریعت کے موافق ہو، انسان کو پاکیزہ غذا کا اہتمام ہو، اس کے اندر اخلاص ہو، ریاکاری نہ ہو، پابندی ہو، ترک عمل نہ ہو، حضرت ابراہیمؑ نے قبولیت کی دعا مانگی: رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا، اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ، حضرت عمرانؑ کی بیوی نے دعا مانگی: رَبِّ اِنِّيۡ نَذَرۡتُ لَكَ مَا فِيۡ بَطۡنِيۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّيۡ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سکھلایا: اَللّٰهُمَّ اِنِّيۡ اَسۡئَلُكَ عِلۡمًا نَافِعًا، وَرِزۡقًا وَاسِعًا، وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا۔"

اللہ تعالیٰ رمضان کی برکتوں اور سعادتوں سے ہم سب کو مالا مال فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمين

رمضان کی خصوصیات

الحمد للّٰه ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! فقد قال اللّٰه تعالى: "شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِيۡ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ، هُدًى لِّلنَّاسِ، وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَ الۡفُرۡقَانِ." (البقرة: ۱۸٤)

(ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے، وہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے، اور اس میں کھلے ہوئے دلائل ہیں ہدایت اور حق و باطل میں امتیاز کے)

حضرات! جس طرح رمضان کی فضیلتیں ہیں، خوبیاں ہیں، اسی طرح اس کے آداب ہیں، شرائط ہیں، طریقے ہیں، بالکل اسی طرح اس کی خصوصیات بھی ہیں، انھیں خصوصیات میں یہ ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ دنیا ظلم وجور کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی، کوئی ایسی برائی نہ تھی، جس سے انسانی سماج محفوظ ہو، پہاڑوں، دریاؤں، درختوں اور سیاروں، چاند، سورج اور ستاروں، یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں اور مورتیوں بلکہ کیڑے مکوڑوں کے سامنے بھی انسان اپنی جبین نیاز خاک آلود کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا۔

اس وقت سماج مختلف طبقات میں بٹا ہوا تھا، خود ہندوستان میں برہمن، چھتری، ویش اور شودر جیسے طبقات تھے، سب سے محروم طبقہ شودر تھا، اس پر تعلیم کا دروازہ بند تھا، ان کے لئے حکم تھا کہ اگر وہ وید کی عبارت بھی سن لیں، تو ان کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے، انسانی جان کا اتلاف ایسا تھا کہ جانوروں سے انسانوں کو لڑایا جاتا تھا، اور غلام کو باندھ کر نشانہ سادھا جاتا تھا، عورتوں کو گناہ کا دروازہ اور شوہر کے انتقال کے بعد اس کو

نذرِ آتش کیا جاتا تھا، نہ جائداد میں شرکت اور نہ میراث میں حق، جب تمدن خزاں رسیدہ ہوگیا، اور جہالت کی گھٹا ہر سو چھا چکی تو رمضان ہی کی ۲۷ رتاریخ کو ایک ابرِ کرم قرآن کی شکل میں اترا، جس نے دنیا کا نظام بدل دیا۔

حضرات! شریعت کا حکم ہے کہ روزہ کی حالت میں اگر خلافِ مزاج کوئی بات پیش آئے تو صبر کیا جائے، موسم کی سختی کی وجہ سے اگر دشواری ہو تو اس کو بھی برداشت کیا جائے، صبر کا لفظ جب بھی آتا ہے جو ہمارے سامنے اس کا ایک مفہوم ہوتا ہے، جب کہ صبر کے معنی جمنے اور ڈٹنے اور استقامت کے ہیں، اسی وجہ سے کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک صبر ہے کہ طاعتوں پر جما جائے، جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان پر ثابت قدم رہے ایمان پر، دین پر، عقائد پر، رمضان کا مہینہ تھا، چلچلاتی دھوپ تھی، لیکن صحابۂ کرامؓ سے پہلا عظیم الشان معرکۂ بدر لڑنے کے لیے کہا گیا تو صحابہؓ نے اس کو بسروچشم قبول کیا، فتحِ مکہ بھی اس میں آتا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں پر صبر کیا جائے، اس سلسلہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کی مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ انھوں نے ایسا صبر کیا کہ شکوہ کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا۔

صبر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ معصیتوں کے قریب نہ ہوا جائے، حضرت یوسف علیہ السلام کا نمونہ سامنے ہے کہ انھوں نے برائی کی دعوت پر اس سے اجتناب کیا، اور دور رہے، قرآن کہتا ہے: "اِنَّمَا یُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ." (صبر کرنے والوں کو بے حد وحساب اجر دیا جائے گا)، رمضان کا مہینہ صبر کی تربیت کے لئے آتا ہے، رمضان میں صبر کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ انسان نہ گالی گلوج کرے، نہ شور وشغب کرے، رمضان ہمدردی اور غم گساری کا مہینہ ہے، اگر دوسرا کوئی بات کہے تو کہہ دیں کہ میں روزے سے ہوں۔

حضرات! رمضان ہمدردی کا مہینہ ہے، ایثار کا مہینہ ہے، اس سلسلہ میں واقعہ

ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، وہ بھوکے تھے، آپ سے فاقہ کشی کا ذکر کیا اور کھانے کے خواستگار ہوئے، آپ نے ازواجِ مطہرات کے یہاں بھیجا کہ کچھ ہو تو حاضر کیا جائے۔ لیکن وہاں بھی پانی کے سوا کچھ نہ تھا، آپ نے صحابہؓ سے فرمایا: کون ان کی مہمان نوازی کرے گا؟ ایک صحابی تیار ہوئے، اور لے کر آئے، بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے، تو انھوں نے کہا کہ صرف بچوں کے کھانے کا سامان ہے، صحابی نے کہا کہ کوئی حرج نہیں، بچوں کو سلا دو، اور بچے جب سو جائیں تو کھانا ہمارے سامنے لاکر رکھ دو، اور چراغ کو درست کرنے کے بہانے اس کو بجھا دینا، چنانچہ ایسے ہی ہوا، یہ صحابی مہمان کے ساتھ ہاتھ اور منہ چلاتے رہے اور مہمان نے شکم سیر ہو کر کھایا، صبح کو جب یہ صحابی خدمتِ رسول ﷺ میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ آج شب تم پر ہنسے، تم سے خوش ہوئے، اور یہ آیت نازل فرمائی: "وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ، وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (الحشر:۹) (کچھ لوگ ہیں جو باوجود فاقہ مستی سے دوچار ہیں اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اور جو شخص بخل سے بچالیا جائے وہی کامیاب ہے)، یہ کوئی معمولی کردار نہیں ہے، اسلام کے عہدِ اوّل میں ہر جگہ اس طرح کے تابندہ نقوش ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید اور خدا کی بندگی کے بعد آپ ﷺ سب سے زیادہ اسی پر زور دیتے ہیں اور رمضان میں تو تیز وتند ہوا سے زیادہ آپ راہِ خدا میں خرچ کرنے والے تھے۔

حضرات! ہمدردی کیسے کی جائے؟ ہر شخص اپنی حیثیت کے لحاظ سے کرے، تاجر ہو تو گاہک کا خیر خواہ ہو، اسے دھوکہ نہ دے۔ ڈاکٹر ہو تو مریض کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے، پڑوسی ہو تو اس کا خیال رکھے، پڑوسی تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک قربت دار پڑوسی، دوسرے پاس میں رہنے والا پڑوسی، تیسرے ساتھ میں اٹھنے بیٹھنے والا۔

حضرات! اگر کسی نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ایک روزہ کا کفارہ ساٹھ دن کا روزہ رکھنا ہے، اور روزہ نہیں رکھ سکتا تو ساٹھ محتاج شخص کو کھانا کھلانا ہے۔

آج کل رمضان میں زکاۃ نکالنے کا بڑا اہتمام ہے، زکاۃ تو ایک لازمی فریضہ ہے، اس کو تو ادا ہی کرنا ہے، لیکن جیسے رمضان میں فرض نمازوں کے ساتھ تراویح اور نوافل کو رکھا گیا ہے، اسی طرح زکاۃ کے علاوہ دیگر مدات پر بھی عمومی توجہ ہونی چاہیے، کیونکہ بہت سے ایسے کام ہیں، جن میں زکاۃ کی رقم خرچ نہیں ہوتی۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ." (زکاۃ کے علاوہ بھی مال اللہ کے راستے میں خرچ کرنا چاہیئے) (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲/۴۱۱)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان کے مبارک دنوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

رمضان اور قرآن

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! فقد قال الله تعالى "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ، هُدًى لِلنَّاسِ، وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَ الْفُرْقَانِ." (البقرة: ١٨٤) (ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے وہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے، اور اس میں کھلے ہوئے دلائل ہیں ہدایت اور حق و باطل میں امتیاز کے)

حضرات! اللہ کا فضل اور اس کا اکرام وانعام ہے کہ اس نے پھر ایک مرتبہ ہمیں رمضان کی نعمتوں، برکتوں اور رحمتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، ویسے پورا رمضان بے شمار خوبیوں کا مہینہ ہے، لیکن بعض خصوصیات ایسی ہیں، جو اس کو دوسرے مہینوں سے ممتاز کرتی ہے، بلکہ پچھلی امتوں میں سے کسی کو بھی یہ نعمتیں نہیں ملی ہیں، مسند احمد، بزار، بیہقی اور ترغیب وترہیب کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کو رمضان شریف میں مخصوص طور پر پانچ چیزیں ایسی ملی ہیں کہ جو دوسروں کو نہیں ملی: (۱) اُن کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے (۲) اُن کے لئے دریا کی مچھلیاں افطار کے وقت دعا کرتی ہیں (۳) جنت ہر روز اُن کے لئے آراستہ کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قریب ہے کہ میرے بندے دنیا کی مشقتیں پھینک کر تیری طرف آئیں (۴) سرکش شیاطین اُس میں قید کر دیئے جاتے ہیں کہ رمضان میں ان برائیوں کی طرف نہیں پہنچ سکتے (۵) رمضان کی آخری رات میں اُن کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

حضرات! رمضان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس مہینہ میں قرآن اترا، اللہ کے قدرتی وتکوینی فیصلہ کی تمام کتابیں رمضان میں اتاری گئی ہیں، حضرت موسیٰ کو توراۃ ۶ ررمضان کو، حضرت داؤد کو زبور ۱۸ ررمضان کو اور حضرت عیسیٰ کو انجیل ۱۲ ررمضان کو ملی، اور خود قرآن اسی مہینہ کی ستائیسویں رات میں اترا، قرآن اور رمضان کے ایک دوسرے سے تعلق کی وجہ بھی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرئیل امین پورا قرآن سناتے تھے، اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ سنتے تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن اور رمضان دونوں قیامت کے دن سفارش کریں گے، رمضان کہے گا کہ وہ دن میں کھانے پینے سے رکا رہا، اور قرآن کہے گا کہ ''اس نے راتوں کو نیند قربان کر کے میرا حق ادا کیا، اس لئے میری سفارش ان کے حق میں قبول فرمایئے۔

حضرات! رمضان کے روزوں کی ایسی اہمیت ہے کہ اگر ایک روزہ بغیر عذر اور بیماری کے نہ رکھے، تو زندگی بھر روزہ رکھے تب بھی اس کا بدل نہیں سکتا، (ابن ماجہ) ابن ماجہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوامامہ باہلیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں سویا تھا، دوشخص آئے، انہوں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے بہت اونچے دشوار گزار پہاڑ کے پاس لائے اور اُس پر چڑھنے کے لئے کہا: میں نے کہا: میں اِس پر نہیں چڑھ سکتا، دوبارہ انہوں نے کہا، میں نے وہی جواب دیا، پھر انہوں نے کہا: آپ ﷺ چڑھیئے، ہم آپ ﷺ کی مدد کریں گے، چنانچہ میں چڑھا، تو وہاں پر کچھ آوازیں آرہی تھیں، میں نے پوچھا: یہ کیسی آوازیں ہیں؟ بتایا گیا کہ جہنمیوں کی چیخ وپکار ہے، پھر مجھے کچھ آگے لے کر بڑھے، تو دیکھا کہ کچھ لوگوں کے جبڑوں کو پھاڑا جارہا ہے، جس سے ہونٹوں سے خون بہہ رہا ہے، پوچھا کہ کون لوگ ہیں یہ؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو روزہ افطار سے پہلے ہی کھاتے پیتے تھے۔

اس لئے جو رمضان کے روزہ نہیں رکھے گا، تو رمضان کیسے اس کی سفارش کیسے

کرے گا، لیکن اگر روزہ رکھتے ہیں، لیکن بے نیت تو ان کا روزہ ہی نہیں ہوا، روزہ میں ارادہ ضروری ہے اور نیت کے ساتھ روزہ رکھنا ضروری ہے، لیکن اگر روزہ رکھا اور غیبت، چغلی، ناجائز باتوں سے نہیں بچے تو یہ روزہ بے کار ہو جائے گا۔ ابن ماجہ کی روایت ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ ان کو بھوکے رہنے کے سوا کچھ ملتا ہی نہیں، روزہ ڈھال ہے آدمی کے لئے جب تک اس کو پھاڑ نہ ڈالے، روزہ حفاظت ہے اللہ کے عذاب سے اور جہنم کے عذاب سے، اور روزہ پھٹ جاتا ہے جھوٹ اور غیبت سے۔

اسی طرح قرآن اس وقت سفارش کرے گا جب اس کے مطالبات پورے کئے جائیں، اور اس کے حقوق ادا کئے جائیں، کلام اللہ کوئی عام کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کی کتاب ہے، حضرت عکرمہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ کلام اللہ پڑھنے کے لئے کھولا کرتے تو بے ہوش کر گر جاتے تھے، اور کہتے تھے: یہ میرے رب کا کلام ہے، یہ میرے رب کا کلام ہے۔

حضرات! کلام اللہ کے آداب میں ہے: قبلہ رو ہو کر باوضو بیٹھے، پڑھنے میں جلدی نہ کرے، رونے کی سعی کرے خواہ بتکلف ہو، پڑھتے وقت احساس ہو کہ اللہ کا کلام پڑھا جارہا ہے، معانی پر غور کرے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری رات گذار دی اور یہ آیت دہراتے رہے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ، وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ .(المائدۃ:۱۱۸)(تو اگر انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو انھیں بخش دے تو تو ہی زبردست، حکمت والا ہے) قرآن مجید کا اتنا حفظ کرنا جس سے نماز ادا ہو جائے ہر شخص پر فرض ہے، اور تمام کلام اللہ کو حفظ کرنا فرض کفایہ ہے، اور اگر کسی بستی میں کوئی حافظ نہ ہو تو سب گنہگار رہوں گے، اس لئے قرآن کریم کے پڑھنے کا اہتمام کیا جائے، کیونکہ اس کے ہر ہر حرف پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس دس نیکیاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اور قرآن کریم، امانت، صلہ رحمی، یہ تینوں بندوں کے لئے اللہ

تعالیٰ سے جھگڑیں گے، اور قرآن کا ماہر فرشتوں کے ساتھ ہوگا، اور قرآن پڑھنے سے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے، اور قرآن پڑھنے والے اللہ تعالیٰ کے گھر والے ہیں۔

حضرات! ہمارے قرآن پڑھنے اور صحابہ کرامؓ کے قرآن میں کئی فرق ہیں:

۱۔ ہم پڑھتے ہیں......اور وہ اچھی طرح پڑھتے تھے۔

۲۔ ہم پڑھنے کو کافی سمجھتے ہیں......اور وہ عمل کے لئے پڑھتے تھے۔

۳۔ ہم جیسے تیسے پڑھ لیتے ہیں.....اور وہ سمجھ کر پڑھتے تھے۔

اگر ہم اِس کا اہتمام کریں گے تو رمضان اور قرآن کی بے شمار برکتیں حاصل ہوں گی، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیقات سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین

عشرۂ مغفرت

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد! فقد قال اللّٰہ تعالیٰ "قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. (الزمر: ۵۳) (کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو! جو اپنی جانوں پر زیادتی کر چکے ہو، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، بے شک اللہ سارے گناہ معاف کر دے گا، بے شک وہی تو غفور ہے، وہی رحیم ہے)

حضرات! اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، وہ نام اللہ کی صفات اور اس کی نوازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اِن ناموں میں کچھ نام وہ ہیں، جن سے اللہ کا غصہ، جلال اور قہر ظاہر ہوتا ہے، جیسے القھّار، الجبار، المھیمن، الخافض، المذل۔ اور اُن ناموں میں کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ کی رحمت اور مغفرت جھلکتی ہے، جیسے رحمان، رحیم، غفار، اِن ناموں کے بارے میں صحیح بخاری میں آیا ہے کہ انسان اگر اس کو یاد کرے، یا ان ناموں کا لحاظ رکھے تو اللہ اُسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔

حضرات! اِن ناموں کے مطالعہ سے ایک بات اور معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے غضب اور غصہ والے نام کم اور رحمت اور مغفرت والے نام زیادہ ہیں، اسی وجہ سے قرآن میں آیا ہے: رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ، اور حدیث میں آیا ہے: رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ (صحیح مسلم، کتاب التوبۃ: ۷۱۴۶)

اللہ کی رحمت کا مظہر اور جلوہ دیکھئے کہ وہ بندہ کی توبہ سے خوش ہوتے ہیں، اُس کی

رحمت کا یہ بھی مظہر ہے کہ وہ اِس امت کو یکبارگی ہلاک نہیں کریں گے۔ اور اُس کی رحمت کا یہ بھی مظہر ہے کہ انہوں نے ۹۹؍آدمیوں کے قاتل کو معاف کر دیا، اور اُس کی رحمت کا یہ بھی مظہر ہے کہ اُس نے ہمیں رمضان جیسا مبارک مہینہ عطا فرمایا، جس میں رحمت، مغفرت اور جہنم سے آزادی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، اِس وقت ہم مغفرت کے عشرہ میں ہے، رمضان میں مغفرت کے بے شمار اسباب ووسائل جمع ہیں:

۱۔ روزہ مغفرت کا ذریعہ

۲۔ تراویح مغفرت کا ذریعہ

۳۔ تلاوتِ قرآن مغفرت کا ذریعہ

۴۔ روزہ افطار کرانا مغفرت کا ذریعہ

۵۔ صدقہ دینا مغفرت کا ذریعہ

حضرات! توبہ واستغفار کے بے شمار فائدے ہیں، سنن ابوداؤد میں ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَن لَزِمَ الاستغفارَ جَعَلَ اللّٰہُ لَہُ من کُلّ ضِیقٍ مَخرَجاً، ومن کُلِّ ہَمّ فَرَجاً، ورزقه مِن حَیثُ لا یَحتَسِبُ" (ابوداؤد) (جو شخص استغفار کی پابندی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی ہر تنگی کو دور کر دے گا، اور ہر غم سے خلاصی دے گا، اور اس کو روزی ایسی جگہ سے دے گا جہاں سے اس کو خیال بھی نہ ہوگا) حضرت حسن بصریؒ کے پاس ایک صاحب آئے، تو انہوں نے مال کی کمی کی شکایت کی، تو انہوں نے جواب میں کہا: استغفار کرو، پھر اولاد کی کمی کی شکایت کی تو جواب دیا کہ استغفار کرو، بارش کی کمی کی شکایت کی تو جواب دیا کہ استغفار کرو، رزق میں کمی کی شکایت کی تو جواب دیا کہ استغفار کرو۔ غرض ہر سوال کے جواب میں استغفار کی کثرت کا حکم دیا، اور یہ حقیقت ہے کہ استغفار میں وہ طاقت ہے کہ جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَقُلتُ استَغفِرُوا رَبَّکُم،

اِنَّہُ کَانَ غَفَّاراً، یُرسِلِ السَّمَاءَ عَلَیکُم مِدرَاراً، وَیُمدِدکُم بِاَموَالٍ وَّبَنِینَ، وَیَجعَل لَکُم جَنّٰتٍ وَّ یَجعَل لَّکُم اَنہَاراً۔ (نوح: ۱۰-۱۲) (چنانچہ میں نے کہا: اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو، بے شک وہ ہے بھی بڑا مغفرت کرنے والا، وہ تم پر کثرت سے بارش بھیجے گا، اور ترقی دے گا تمہارے مال واولاد میں اور تمہارے لئے باغ لگا دے گا، اور تمہارے لئے ندیاں بہا دے گا)

حضرات! اِس وقت ہم آخری عشرہ کے آغاز میں ہیں، اور آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا ہے، جہنم اللہ کے غضب کا مظہر ہے، جہنم میں کانٹے ہوں گے کھانے کے لئے، پیپ ہوگا پینے کے لئے، اور جہنمیوں کے دانت بڑے بڑے ہوں گے، جہنم میں ستر ہزار وادیاں ہیں اور ہر وادی میں ستر ہزار اژدہے ہیں، جہنم میں ایک وادی ہے جس کا نام ھَبھَب ہے، وہ سرکشوں اور متکبروں کا ٹھکانہ ہے، اس جہنم سے چھٹکارا پانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس عشرہ میں دو عبادتیں جمع کر دی ہیں: ایک اعتکاف کی سنت، دوسرے شبِ قدر۔

اللہ ہمیں رمضان کی برکتیں نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین

احتساب کا مہینہ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد ! فقد قال الله تعالى : "يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ، وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ، واتقوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ." (الحشر:۱۸) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص غور کرلے کہ اس نے کل کے لئے کیا کیا ہے، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالی تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے)۔

و قال النبی ﷺ: الكَيِّسُ مَن دَانَ نفسَه ، وعَمِل لما بعدَ الموتِ، والعاجِزُ من أتبع نفسَه هَواها ، وتمنَّى عَلَى اللهِ الأمانِيَّ (سنن ترمذی، بروایت ابویعلی شداد بن اوسؓ) (عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو تابع کرلے، اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے، اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے تابع کردے، اور اللہ سے طرح طرح کی امیدیں باندھے)

حضرات! ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نے رمضان کی آمد پر مبارکباد دی تھی، اور خوشی کا اظہار کیا تھا کہ اللہ تعالی نے ہم کو اسلام کی حالت میں عقل وشعور کی حالت میں، امن و امان کی حالت میں اور ایمان وتوفیق کی حالت میں رمضان نصیب فرمایا، آج وہ دن ہے کہ ہم ایک دوسرے کو تسلی دے رہے ہیں، اور صبر کی تلقین کر رہے ہیں، اور رمضان کو گویا الوداع کہہ رہے ہیں، وہ جا رہا ہے، کس کو معلوم ہے کہ رمضان آئے گا، رمضان بار بار آئے گا، لیکن ہم رہیں گے یا نہیں، اس کی کسی کو خبر نہیں، رمضان کا حق یہ ہے کہ جتنا وقت باقی رہ گیا ہے اس کو دعا ومناجات اور رب کی چوکھٹ پر آنسوؤں کے بہانے میں صرف کیا جائے۔

میرے بزرگو! اصطلاحی طور پر عرف میں رمضان کے آخری جمعہ کو جمعۃ الوداع کا نام دیتے ہیں، اور معاشرہ میں اس کا بڑا اہتمام ہوتا ہے، اگر یہ جذبہ اس بنیاد پر ہے کہ اللہ تعالی نے ہمیں ایک بڑی نعمت دی تھی، ایک بڑا مہمان آیا تھا، ہم کما حقہ اس کی قدر نہیں کر سکے، جس پر ہمیں ملال ہے، افسوس ہے، جس طرح مہمانوں کو see off کرنے جاتے ہیں، اور کہتے ہیں: ضرور تشریف لائیں گے، اور نمناک آنکھوں، بھیگی پلکوں اور حسرت و یاس کے عالم میں اس کو الوداع کہہ رہے ہیں، تو یہ جذبہ قابل قدر اور قابل تحسین ہے، اور جن مشائخ نے اس کو جمعۃ الوداع کا نام دیا اُن کے نزدیک یہی معنی اور یہی مفہوم تھا۔ جمعۃ الوداع میں نہ نماز کی شکل مختلف ہے، اور نہ خطبہ کی، عام جمعوں کی طرح یہ نماز اور خطبہ ہوتا ہے، اور الوداع الوداع کہنا یہ بھی ضروری نہیں ہے، لیکن معاشرہ میں اس کو ایسا ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اگر الوداع الوداع یا شہر رمضان، الوداع الوداع یا شہر رمضان نہ کہا جائے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ خطبہ بھی نہیں ہوا، اور نماز ہی نامکمل ہوئی، یہ غلط نظریہ ہے، جو معاشرہ میں پنپ رہا ہے۔

یہ جمعۃ الوداع محاسبہ کا دن ہے، اعمال کے جائزہ کا دن ہے، محاسبہ سے انسان ترقی کرتا ہے، تاجر کی تجارت میں نفع ہوتا ہے، مزدور کی مزدوری بڑھتی ہے، رمضان بے شمار خوبیوں کا مہینہ تھا، کیا ہم نے اِن خوبیوں کو حاصل کیا، یہ تقویٰ کا مہینہ تھا، کیا تقویٰ کا زادِ راہ ہم نے لیا؟

حضرات! رمضان کے اختتام پر جشن منانا اس کے تقدس، اس کی عظمت شان کے بالکل خلاف ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ آپ کے یہاں آئے، اور آپ اس کی بہت خدمت کریں، پھر کہیں کہ حضور! ہم نے آپ کی خدمت کی، آج آپ کو تو مزہ آیا ہوگا، تو وہ اپنی توہین سمجھے گا، ہوسکتا ہے کہ آپ کی گردن ناپ لی جائے، لیکن اگر یہ کہیں کہ حضور! کہاں یہ جھونپڑا اور کہاں سرکار کے قدم مبارک، اور یہ کہیں کہ حضور آپ نے

ہمارے یہاں آکر ہمارا اعزاز اور بڑھادیا تو وہ خوش خوش ہوجائے گا، روزہ کی شکل میں ایک بادشاہ ہمارے گھر آیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ سب عبادتیں اپنے اپنے لئے بڑے فائدے کی ہیں، لیکن روزہ تو خاص میرا ہے، تو کیا ہم نے روزے اس کے لئے رکھے؟ تراویح اس کے لئے پڑھی؟ یہ موقع ہے کہ ہمیں اپنی کوتاہیوں پر ندامت ہو، کوئی کہتا ہے کہ ہم نے پانچ پارے سنائے، ہم نے اتنی نفلیں پڑھیں، ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ کیا ہم نمازوں میں اور تراویح میں پورے استحضارِ قلب کے ساتھ موجود تھے، کیا قرآن جب پڑھا جارہا تھا تو سکون اور کان لگا کر سن رہے تھے؟ ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک جو گناہ معاف ہونے کی بات کہی گئی ہے، وہ اس پر موقوف ہے۔

حضرات! یہ ایک مہینہ کا روزہ رخصت ہورہا ہے، چاند دیکھ کر شروع ہوا تھا، اور چاند دیکھ کر ختم ہوجائے گا، دوسرا روزہ وہ ہے جو بلوغِ عمر سے شروع ہوکر اختتامِ عمر پر مکمل ہوتا ہے، یہ روزہ ختم ہوگا جب اللہ تعالیٰ اپنے دیدار کا شربت پلائیں گے، اِس روزہ کا اصول ہے: "وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا." (الحشر: ۷) (تو رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لیا کرو، اور جس سے وہ تمہیں روک دیں رُک جایا کرو)

بھائیو! رمضان کا یہ جمعہ اس کے بعد کچھ دن ہیں، اگر اب تک ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی، تو ایک ایک گناہ اور ایک ایک کوتاہی کو یاد کرکے تنہائی میں آنسوؤں کی جھڑی لگادیں، کیونکہ اِس کا اعلان ہے:

مایوس مت ہو اے دل، دستِ دعا اٹھا کر
دے گا ضرور ایک دن، مانگو تو گڑگڑا کر

حضرات! یہ صبر کا مہینہ تھا، کیا ہم نے صبر وضبط کے مفہوم کو سیکھا؟ یہ غمخواری کا مہینہ تھا، کیا ہم نے غمخواری اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ کی؟ یہ قرآن کا مہینہ تھا، کیا ہم نے قرآن کا حق ادا کیا؟ یہ رحمت ومغفرت اور جہنم سے آزادی کا مہینہ تھا، لیکن کیا

ہم نے اپنے نامہ اعمال میں اِن خصوصیات کو جمع کیا؟ اگر جواب ہاں میں ہے، اور ان شاء اللہ ضرور ہاں میں تو ہوگا، تو خدا کے واسطے اس کو رمضان تک محدود نہ رکھیئے، بلکہ سال کے گیارہ مہینوں میں مزید اِس کو جاری رکھئے، ہفتہ کے سات دنوں میں اس کو عام کیجئے، مہینے کے تیس دنوں میں اس کو نافذ کیجئے، اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر جو لمحے اور ساعتیں باقی رہ گئیں ہیں، اُن میں اپنے مغفرت کرنے والے رب کے سامنے جھک جائیے۔

حضرات! قرآن میں روزے کے فائدے کو بتانے کے لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں: لعلکم تتقون، اور لعلکم تشکرون، یعنی روزہ بیک وقت دو چیزوں کی تربیت کرتا ہے: ایک تقویٰ، دوسرے شکر۔

تقویٰ یہ ہے کہ انسان دنیا میں اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے رکا رہے، اور وہی کرے جس کی اللہ نے اجازت دی ہے، روزہ میں صرف رات اور دن میں کھانا پینا چھوڑنا نہیں، بلکہ اللہ کو اپنے اوپر نگراں بنانے کی مشق ہے، مومن کی زندگی ایک قسم کی روزہ دارانہ زندگی ہے، رمضان کے مہینے میں وقتی طور پر جن چیزوں کو آدمی چھوڑ کر آدمی کو یہ تربیت دی جارہی ہے کہ وہ ساری عمر کے لئے اُن چیزوں کو چھوڑ دے جو اس کے رب کو ناپسند ہیں۔

حضرات! کھانا اور پانی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں، عام حالت میں اس کا احساس نہیں ہوتا، لیکن روزہ میں جب آدمی ان چیزوں سے دن بھر رکا رہتا ہے، اور روزہ رکھنے کے بعد جب شام کو وہ کھاتا پیتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہیں، اِس طرح اُس کے اندر شکر کا جذبہ بے پناہ پیدا ہوتا ہے۔

میرے بزرگو! بنیادی طور پر اس مہینہ کے دو حقوق تھے: ایک کا تعلق اللہ سے، اور دوسرے کا تعلق بندوں سے، انھیں دونوں میں پورے دین کا خلاصہ اور نچوڑ اور مغز آ گیا ہے، اللہ کے تعلق سے جو حق ہے، اُس میں پہلا درجہ قرآن کا ہے، ماشاء اللہ رمضان میں ہم نے قرآن کی تلاوت کی، کئی بار ختم کیا، اور تراویح میں بھی اس کو مکمل کیا، ماشاء اللہ اس کا

ایک عمل تو مکمل ہوا، اب اللہ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش بھی کرنی چاہئے، قرآن سمجھنے کے دو پہلو ہیں: یہ عوام کے لئے ہے، ایک تو یہ کہ جب کوئی قرآن پڑھے تو سمجھ میں آجائے کہ کیا پڑھا جارہا ہے، کس قوم کا تذکرہ ہے، جنت کا ذکر ہے، جہنم کا ذکر ہے، یہ فہم کی اول سطح ہے، دوسرے فہم کا اعلی معیار یہ ہے جو علماء کے لئے ہے کہ اس آیت سے کون سا مسئلہ نکالا گیا ہے، ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، تین چیزوں کو اللہ تعالی نے صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے عام کیا ہے: قرآن هدى للناس، محمد رسول الله رحمة للناس، یہ امت أخرجت للناس، لہذا یہ محدود نہیں رہنا چاہیے، اس کو دوسرے مہینوں میں عام ہونا چاہئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم کو تقوی اور شکر کے جذبات سے مالا مال فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

جمعۃ الوداع کا پیغام

الحمد للّٰه ربّ العالمين، والصلاة وا لسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! فقد قال اللّٰه تعالى: "فَأَمَّا مَنْ طَغَى وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى، وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى، فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى" (النازعات:۳۷-۴۱) (جس نے سرکشی کی اور دنیا کو ترجیح دی تو جہنم اس کا ٹھکانہ ہے، اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہشات سے دور رکھا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے)۔

حضرات! آج اس سال کے رمضان کا آخری جمعہ ہے، جمعہ تمام دنوں میں اہم مقام رکھتا ہے، وہ تمام دنوں کا سردار ہے، خاص طور سے رمضان کا آخری جمعہ وہ تو اپنی خاص معنویت اور اہمیت کا حامل ہے، جمعہ کے معنی ہوتے ہیں: بے شمار خوبیوں کو جمع کرنے والا، اور رمضان بھی تمام مہینوں کا سردار ہے، اور اس کے معنی ہیں: گناہوں کو جھلسا دینے والا، اسی طرح خوبیاں ہی خوبیاں، بھلائیاں ہی بھلائیاں اس موقع پر جمع ہوگئی ہیں، مسلم شریف کی روایت ہے کہ ”الصلواتُ الخمسُ والجمعةُ إلى الجمعة، ورمضانُ إلى رمضان مكفِّرات لما بينهن من الخطايا، إذا اجتنبت الكبائرُ، (پانچوں نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرا جمعہ اور ایک رمضان سے دوسرا رمضان گناہوں کو معاف کرانے والے ہیں، اگر بڑے بڑے گناہوں سے بچا جائے)۔ اور دوسری حدیث میں ہے: إن في الجمعة ساعةَ إجابةٍ لا يوافقها عبدٌ مسلمٌ إلا غُفِرَ له. (صحیح بخاری، کتاب الجمعة:۹۳۵) (جمعہ کے دن ایک مقبولیت کی گھڑی ہے، اگر کسی مسلمان کو اس میں دعا کرنے کی توفیق مل گئی تو

اس کی مغفرت ہوجاتی ہے)اللہ تعالیٰ بار بار رمضان کے جمعے نصیب فرمائے۔

بزرگو! اصطلاحی طور پر عرف میں اس جمعہ کو جمعۃ الوداع کا نام دیتے ہیں، اور معاشرہ میں اس کا بڑا اہتمام ہوتا ہے، اگر یہ جذبہ اس بنیاد پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بڑی نعمت دی تھی، ایک بڑا مہمان آیا تھا، ہم کما حقہ اس کی قدر نہیں کرسکے، جس پر ہمیں ملال ہے، افسوس ہے، اور اب ہم نمناک آنکھوں، بھیگی پلکوں اور حسرت و یاس کے عالم میں اس کو الوداع کہہ رہے ہیں، تو یہ جذبہ قابل قدر اور قابل تحسین ہے، اور جن مشائخ نے اس کو جمعۃ الوداع کا نام دیا، اُن کے نزدیک یہی معنی اور یہی مفہوم تھا. جمعۃ الوداع میں نہ نماز کی شکل مختلف ہے، اور نہ خطبہ کی، عام جمعوں کی طرح یہ نماز اور خطبہ ہوتا ہے، اور الوداع الوداع کہنا یہ بھی ضروری نہیں ہے، لیکن معاشرہ میں اس کو ایسا ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اگر الوداع الوداع یا شہر رمضان، الوداع الوداع یا شہر رمضان نہ کہا جائے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ خطبہ بھی نہیں ہوا، اور نماز ہی نامکمل ہوئی، یہ غلط نظریہ ہے، جو معاشرہ میں پنپ رہا ہے۔

حقیقت خرافات میں کھوگئی　　یہ امت روایات میں کھوگئی

حضرات! ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نے رمضان کی آمد پر ایک دوسرے کو مبارکبادی تھی، اور خوشی کا اظہار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اسلام کی حالت میں، عقل و شعور کی حالت میں، امن و امان کی حالت میں اور ایمان و توفیق کی حالت میں رمضان نصیب فرمایا، آج وہ دن ہے کہ ہم اس کے رخصت ہونے پر صبر کی تلقین کررہے ہیں، اور رمضان کو گویا الوداع کہہ رہے ہیں، وہ جارہا ہے، پتہ نہیں ہمارے اعمال قبول ہیں یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے کیا جانے والا عمل ضرور بالضرور قبول ہوتا ہے، اگرچہ وہ مقدار کے لحاظ سے کم ہی ہو، لیکن بدنیتی سے کیا جانے والا عمل انسان کے منہ پر مار دیا جاتا ہے، قیامت کے دن تین آدمیوں کو لایا جائے گا: ایک شہید ہوگا، اس نے اپنے خون کا آخری قطرہ نچوڑ دیا ہوگا، لیکن اس نے دکھاوے کے لئے کیا تھا، تو اس کو اوندھے منہ جہنم

میں ڈال دیا جائے گا، اسی طرح ایک اچھے قرآن پڑھنے والے، اور خوب خرچ کرنے والے کو لایا جائے گا، اور ان دونوں کو بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے برعکس اگر اخلاص سے کام کیا جائے تو یہ عمل اللہ کے یہاں بڑا وزنی ہے، لا إله إلا اللہ کا ایک جملہ آسمان و زمین کے وزن سے زیادہ وزنی ہے، نیک عمل کی برکتیں دنیا میں ظاہر ہوتی ہیں اور بلائیں ٹلتی ہیں، تین آدمی تھے، سفر کررہے تھے، ایک غار میں پناہ لی، اور غار کو ایک بڑے چٹان نے بند کردیا، اور تینوں نے اپنے اپنے نیک عمل کے ذریعہ دعا کی تو اللہ نے اس چٹان کو دور کردیا اور وہ اس غار سے نکل آئے۔

حضرات! اخلاص کیسے پیدا ہوگا؟ اخلاص پیدا ہوگا جب اللہ کا دھیان ہم اپنے دلوں میں بسائیں گے، اللہ کو حقیقی رب اور پالنہار مانیں گے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ راوی ہیں، کہتے ہیں کہ ایک صاحب آئے اور انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! نصیحت فرمایئے، اور مختصر نصیحت ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (۱) جب نماز پڑھو تو سمجھو کہ زندگی کی آخری نماز ہے (۲) اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالو کہ بعد میں پچھتانا پڑے (۳) اور لوگوں سے تم اپنی امیدیں نہ رکھو، اللہ سے امید رکھو (ابن ماجہ، مسند احمد) اخلاص اس وقت آئے گا جب تم نماز پڑھو تو یہ سمجھو کہ ہماری آخری نماز ہے، رمضان کا حق یہ ہے کہ جتنا وقت باقی رہ گیا ہے اس کو آخری رمضان سمجھ کر دعا و مناجات اور رب کی چوکھٹ پر آنسوؤں کے بہانے میں صرف کیا جائے۔

حضرات! قرآن کریم میں دو واقعے اس موضوع سے متعلق ہیں: ایک سورۂ کہف میں اور دوسرا سورۂ قلم میں، سورۂ کہف میں ہے کہ دو شخص تھے: ایک کو اللہ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا، مال و دولت کے ساتھ کھیتی کا بھی سلسلہ تھا، ایک دن وہ اپنے دوست سے کہنے لگا کہ مجھے نہیں لگتا ہے کہ میرا مال کبھی برباد اور تباہ ہوگا، اس کے دوست نے اسے سمجھایا اور کہا کہ ایسی بات نہیں کہی جاتی ہے، جو نعمتیں ہیں وہ اللہ کی عطا کردہ ہیں، اگر وہ چاہیں تو فوراً لے لیں، لیکن وہ اپنی طاقت کے نشہ میں چور رہا، اور اس نے کہا کہ یہ

سب میری کوششوں کا نتیجہ ہیں، آسمان سے طوفان آیا اور اس نے اس کے تمام سامان کو تہس نہس کر دیا، اور وہ منھ دیکھتا رہ گیا، اس نے اخیر میں کہا کہ اے کاش! میں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہوتا، اس کا شرک بتوں کی پرستش نہیں تھی، اس کا شرک یہی تھا کہ اس نے اللہ کی نعمت کو اپنے بازوؤں کا کرشمہ سمجھا۔

سورۂ قلم میں اللہ تعالیٰ نے باغ والوں کا واقعہ بیان کیا ہے کہ یمن کے علاقہ میں چند لوگ تھے، ان کے پاس مال و دولت کی کثرت تھی، ان کے والد نیک اور ہر ایک کا خیال رکھنے والے تھے، لیکن ان لوگوں نے والد کے انتقال کے بعد کہا کہ ہمارے بچے زیادہ ہیں، ہم والد صاحب کی طرح کہاں خیال رکھ پائیں گے، ان کے والد دن میں پھلوں کو توڑتے تھے اور اس موقع پر جو مانگنے والے آتے ان کو دے دیتے، لیکن ان لوگوں نے دوسری ترتیب بنائی کہ ہم رات میں جا کر سارے پھل توڑ لیں اور فقیروں کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی، یہ ان کا سوچنا تھا کہ جس رات یہ پھل توڑنے کے لئے جانے والے تھے اس کے اوّلین حصہ میں اللہ نے عذاب بھیج دیا، اور پورا باغ تہس نہس ہو گیا، اب جب یہ آدھی رات میں گئے تو دیکھا کہ پورا باغ نیست و نابود ہے، وہ ہکا بکا رہ گئے اور بعض نے کہا: ہم راستہ بھول گئے، لیکن عقلمندوں نے کہا کہ ہماری ناشکری کی وجہ سے یہ عذاب آیا ہے۔

میرے بزرگو! یہ جمعۃ الوداع محاسبہ کا دن ہے، اعمال کے جائزہ کا دن ہے، محاسبہ سے انسان ترقی کرتا ہے، تاجر کی تجارت میں نفع ہوتا ہے، مزدور کی مزدوری بڑھتی ہے، رمضان بے شمار خوبیوں کا مہینہ تھا، کیا ہم نے اِن خوبیوں کو حاصل کیا؟ یہ تقوی کا مہینہ تھا، کیا تقوی کا زادِ راہ ہم نے لیا؟ یہ صبر کا مہینہ تھا، کیا ہم نے صبر وضبط کے مفہوم کو سیکھا؟ یہ غمخواری کا مہینہ تھا، کیا ہم نے غمخواری اپنے رشتہ داروں اور پڑسیوں کے ساتھ کی؟ یہ قرآن کا مہینہ تھا، کیا ہم نے قرآن کا حق ادا کیا؟ یہ رحمت و مغفرت اور جہنم سے آزادی کا مہینہ تھا، لیکن کیا ہم نے اپنے نامۂ اعمال میں اِن خصوصیات کو جمع کیا، اگر جواب ہاں میں ہے، اور ان شاء اللہ ضرور ہاں میں ہوگا،

تو خدا کے واسطے اس کو رمضان تک محدود نہ رکھئے، بلکہ سال کے گیارہ مہینوں میں مزید اِس کو جاری رکھیئے، ہفتہ کے سات دنوں میں اس کو عام کیجئے، مہینے کے تیس دنوں میں اس کو نافذ کیجئے، اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر جو لمحے اور ساعتیں باقی رہ گئیں ہیں، اُن میں اپنے مغفرت کرنے والے رب کے سامنے جھک جایئے کہ مالک میرا سر ہے اور تیرا گھر۔

تیرا در ہو، میرا سر ہو، مرا دل ہو، تیرا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

میرے بزرگو! اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے حضرت مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو کہ انہوں نے رمضان کے الوداع کی مناسبت سے بہت اچھی نظم کہی ہے، جس میں ہمارے جذبات واحساسات کی بھرپور ترجمانی ہے:

رحمت حق آئی قسمت ور چلے — سجدہ ریزی کو خدا کے گھر چلے
قدر نعمت کی نہ کچھ ہم کر سکے — بوجھ عصیاں کا لئے سر پر چلے
وا ہوئے در بزم رحمت کے تمام — اہلِ درد وسوز کچھ کچھ کر چلے
ہائے رے حسرت نصیبی وائے غم — کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے
الفراق اے ماہِ رمضان الفراق — زخم دل پر کیا لگے نشتر چلے
ہوں نہ ہوں یہ لطف کے دن پھر نصیب — اور دورِ بادۂ کوثر چلے
اور بھی کچھ اور بھی کچھ اور بھی — جانے کب در بند ساقی کر چلے
ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تک بس چل سکے ساغر چلے

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

جمعۃ الوداع: یوم شکر واحتساب

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه ، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد ! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم : قل يا عبادى الذين أسرفوا على أنفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ، ان الله يغفر الذنوب جميعا ، انه هو الغفور الرحيم (الزمر : ۵۳)

حضرات ! یہ اس سال رمضان المبارک کا آخری جمعہ ہے، جس کو اصطلاح میں جمعۃ الوداع کہا جاتا ہے، یہ موقع شکر وسپاس کا ہے کہ اللہ تعالی نے رمضان کا مبارک مہینہ عطا فرمایا، اور روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ما يفعل الله بعذابكم إن شكرتم و آمنتم ، وكان الله شاكرا عليما (النساء : ۱۴۷)، (اللہ تعالی تم کو کیوں سزا دے گا اگر تم نے شکر ادا کیا اور ایمان لائے ، اور اللہ تعالی شکر قبول کرنے والے ہیں اور جاننے والے ہیں)، اس موقع پر دو باتیں بہت ہی اہمیت رکھنے والی ہیں: (۱) یہ دعا کہ اللہ تعالی ہماری عبادتوں اور اعمال صالحہ کو قبول کرلے، کیونکہ قبولیت اصل ہے، اعمال کتنے زیادہ ہوں، لیکن اگر قبولیت نہیں ہے تو بڑے خطرہ کی بات ہے، اللہ تعالی نے قبول کے سلسلہ میں فرمایا ہے: إنما يتقبل الله من المتقين (المائدۃ:۲۷) (اللہ تقوی والوں کے عمل کو قبول کرتا ہے) تو ہمیں اللہ تعالی سے ہمہ وقت ڈرتے رہنا چاہئے اور امید بھی رکھنا چاہئے ۔ (۲) دوسری بات یہ کہ جو کوتاہیاں ان عبادات کو انجام دینے میں ہوئی ہیں دعا کریں کہ اللہ تعالی ان کو معاف فرمادے، گویا آج کا یہ دن دعا اور استغفار کا دن ہے، اور جتنے دن بھی باقی رہ گئے ہیں، ان

کو دعا واستغفار کے ذریعہ آباد کرنا چاہئے اور اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

حضرات ! دعا اللہ تعالی کے حضور مانگنے کا ایک عنوان ہے، دعا اپنی ضرورت کا اظہار بھی ہے، اور عبادت بھی ہے، بلکہ اللہ تعالی دعا مانگنے سے خوش ہوتا ہے، اور جو دعا نہیں مانگتا، اس سے ناراض ہوتا ہے، قرآن کریم میں ہے: إن الذين يستكبرون عن عبادتي سيدخلون جهنم داخرين (غافر:۶۰) (جو لوگ میری عبادت سے روگردانی کرتے ہیں، اللہ تعالی ان کو ذلیل کر کے جہنم میں داخل کرے گا)، یہی وجہ ہے قرآن حضرات انبیاء کرام کی دعائیں نقل کی گئی ہیں، ان ہم نمونہ بنا کر اس دعا کے مہینہ مفید، نافع اور کارآمد بنا سکتے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کی دعا کے الفاظ خود اللہ نے ان کو سکھائے، وہ الفاظ یہ تھے: ربنا ظلمنا أنفسنا ، و ان لم تغفر لنا ، وارحمنا لنكونن من الخاسرين (الأعراف:۲۳) (اے ہمارے رب! ہم نے ظلم کیا ہے، اگر آپ نے معاف نہیں کیا ، اور رحم نہیں کیا تو ہم نقصان اور گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے)، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے متعدد دعائیں کی ہیں، ان میں اے دعا تو وہی ہے: سورۂ ابراہیم میں ہے: رب اجعلني مقيم الصلاة و من ذريتي ، ربنا وتقبل دعاء (ابراہیم:۴۰) (اے اللہ! مجھے اور مرے خاندان والوں کو نماز قائم کرنے والا بنادے، اور اے ہمارے رب ہماری دعا قبول فرما)، اور ایک دعا یہ بھی ہے کہ اے اللہ! ہمارے اعمال کو قبول فرما، آپ ہی سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ غرض دیکھا جائے تو دعاؤں کو ایک تسلسل ہے، جس کے ذریعہ ہم اللہ تعالی کی رضا حاصل کر سکتے ہیں، اور دین و دنیا کی جامع دعا وہ ہے جو اللہ تعالی رسول اللہ ﷺ کی زبانی ہم سکھایا: ربنا آتنا فى الدنيا حسنة ، وفى الآخرة حسنة ، وقنا عذاب النار (البقرة : ۲۰۱) اے اللہ! ہمیں دنیا کی بھلائیاں بھی عطا فرما، اور آخرت کی بھلائیاں عطا فرما، اور ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے) وہ دعا کی طاقت تھی، جس نے حضرت یونس کو مچھلی کے پیٹ سے

نکالا، وہ دعا ہی طاقت تھی، جس نے حضرت ایوب علیہ السلام کو بیماریوں سے شفادی، وہ دعا ہی طاقت تھی، جس نے حضرت زکریا کو صاحب اولاد بنایا، وہ دعا ہی طاقت تھی، جس نے رسول اللہ ﷺ بدر میں، احد میں، خندق میں خیبر میں، فتح مکہ میں، تبوک میں نیک نام کیا۔ آج بھی دعا میں وہ طاقت ہے، جو ناممکن کو ممکن، اور محال کو آسان بناتی ہے، اور تقدیر کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

حضرات! دعا کے ساتھ استغفار کی بھی اس مہینہ میں بڑی اہمیت ہے، اللہ کے نیک بندوں کی صفات میں ذکر کیا گیا ہے کہ كانوا قليلا من الليل ما يهجعون، وبالأسحار هم يستغفرون (الذاريات:١٧) اللہ کے نیک بندے وہ ہیں، جو رات کو کم سوتے ہیں اور سحری کے وقت میں استغفار کرتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! یہ لوگ رات عبادت میں گذارتے ہیں تو پھر صبح کو استغفار کیوں کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: رات میں کی جانے والی عبادت میں ان سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، اس کی وجہ سے استغفار کرتے ہیں کہ یا اللہ ہم آپ کی توفیق سے کھڑے تو ہو گئے تھے، لیکن جس طرح عبادت کرنی چاہئے تھی اس طرح ہم نہیں کر پائے، اس لئے وہ استغفار کرتے ہیں، قرآن وحدیث گواہ ہیں کہ جب تک انسان استغفار کرتا رہے گا، اس وقت تک اللہ تعالی کے غضب سے محفوظ رہے گا: وما كان الله ليعذبهم وأنت فيهم، و ما كان الله معذبهم وهم يستغفرون ۔(الأنفال: ٣٣)

حضرات! رمضان تربیت کا مہینہ ہے، اللہ تعالی چاہتا ہے کہ ہم تربیت حاصل کر کے پورے سال کو اسی نہج پر لائیں، اور پوری شریعت پر عمل کریں، اگر ہم نے صرف رمضان میں عبادتوں کا سلسلہ رکھا، اور سال کے بقیہ مہینے اس سے بیزار رہے تو رمضان کا حق ادا نہیں ہوا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی انسان اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے، یہ حدیث پورا

دستور العمل اور ہدایت نامہ ہے، اور اسی میں دنیا وآخرت کی کامیابی پوشیدہ ہے، دیکھئے اللہ تعالی کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل وہی ہے جو تھوڑا اور مسلسل ہو، ایک صحابی حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: مجھے ایسا عمل بتائیے، جس کو میں اپنا دستور العمل بنالوں، اور وہ ہمارے لئے کافی ہو، آپ ﷺ نے فرمایا: کہو کہ میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ، استقامت اختیار کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور اس پر جم گئے تو ان پر فرشتے اتریں گے، کہ ڈرو نہیں، اور نہ غم کرو، اور اس جنت کی خوشخبری قبول کرو، جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا تھا، ہمیں تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگی میں، اور آخرت میں بھی اور تمہارے لئے وہ سب ہے، جس کی تمہاری خواہش ہوگی اور جس کا تم مطالبہ کرتے تھے۔

حضرات ! آج کا دن یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم رمضان کے بقیہ دنوں کی قدر کرلیں، اور اپنی گناہوں کی معافی مانگیں، اور عہد کریں کہ ان شاء اللہ ہم اپنی زندگی اسلامی شریعت کے مطابق گذاریں گے۔ اور رمضان کی برکات کو پورے سال عام کریں گے وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين ۔

جمعۃ الوداع اور اس کے تقاضے

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه ، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد . فقد قال الله تعالى : واعبد ربك حتى يأتيك اليقين (الحجر : ۹۹) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تمہاری موت آجائے۔

حضرات ! آج رمضان المبارک کا آخری جمعہ ہے، اس کو جمعہ کو جمعۃ الوداع کے نام سے جانتے ہیں، جمعہ کا دن تو ویسے بھی برکتوں اور سعادتوں کا دن ہے، اور تمام دنوں کا سردار ہے، مزید یہ کہ رمضان کا جمعہ اس کی اہمیت اور زیادہ ہے، اور آخری جمعہ جس کے بعد رمضان کا کوئی جمعہ نہیں، اور ہوسکتا ہو کہ یہ ہماری زندگی کا بھی آخری جمعہ ہو، خیر جب بھی یہ جمعہ آتا ہے تو دو قسم کے جذبات ہمارے پیدا ہوتے ہیں، اور یہی دو جذبات ہر مسلمان کے دل میں ہونے چاہئے: ایک تو خوشی اور شکر کا جذبہ کہ اللہ نے اپنے فضل سے ایک مرتبہ پھر رمضان کا روزہ عطا فرمایا، اور ہمیں روزہ رکھنے، تراویح پڑھنے، اعتکاف میں بیٹھنے، صدقہ وخیرات کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے، دوسرا جذبہ یہ کہ آج ڈرنے اور خوف محسوس کرنے کا ہے، اگر ہماری مغفرت اس مہینے میں نہیں ہوئی تو بڑے خطرہ اور پریشانی کی بات ہے، تین لوگ ہیں جن کے لئے جبریل امین نے بدعاء کی ہے: ایک وہ شخص جو والدین کی خدمت نہ کرنے والا، درود شریف نہ پڑھنے والا، اور رمضان میں مغفرت سے محروم رہنے والا۔

حضرات ! رمضان المبارک رخصت ہورہا ہے، وہ ایک سال کے لئے ہم

سے جدا ہورہا ہے، لیکن اس کا پیغام باقی ہے، جو ہمہ وقت ہماری رہنمائی کرتا ہے، رمضان کے روزوں کی قبولیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہم اس کے پیغام کو گیارہ مہینوں کے لئے اپنا دستور العمل بنالیں، اور تقوی اور پرہیزگاری ہم نے حاصل کی ہے، اس کی شمع کو ہم بقیہ مہینوں میں بجھنے نہ دیں۔

رمضان کا پہلا سبق ہے کہ ہم مجاہدہ اور نفس پر کنٹرول کو اپنا وظیفہ بنائیں، اللہ تعالی نے صبح سے شام تک ایک مہینے جائزہ چیزیں ہمارے لئے حرام قرار دیں تاکہ ہم پہلے حرام چیزوں کو چھوڑنے کے عادی ہوجائیں، رمضان کے گذرنے کے بعد اگر ہمارے اندر حلال وحرام کا فرق نہیں، جائز وناجائز کا امتیاز نہیں، جھوٹ، غیبت، بدعہدی، رشوت، چغل خوری، ریاکاری میں ہم مبتلا رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے رمضان کے مشن اور اس کے پیغام کو نہیں سمجھا، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک مہینہ کوئی ٹیرننگ کورس کرے اور وہاں آنے کے بعد پھر وہی رفتار بے ڈھنگی جاری وساری رہے تو بڑے خطرہ کی بات ہے، اور یہ بھی امکان ہے کہ کہیں اللہ نے ہمارے روزوں کو رد تو نہیں کردیا، تو پہلا درس یہ ہے کہ ہم اپنے کو محنت ومجاہدہ اور نفس پر کنٹرول کرنے کا عادی بنائیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رات میں گشت کررہے تھے، ایک گھر سے انہوں نے آوز سنی کہ بیٹی دودھ میں پانی ملادو، بیٹی نے کہا کہ امی! کیا آپ نے امیر المؤمنین کا یہ آرڈر نہیں سنا ہے کہ دودھ پانی ملانا سخت منع ہے، ماں نے کہا: یہاں رات میں امیر المؤمنین کہاں دیکھ رہے ہیں، بیٹی نے بروقت جواب دیا کہ امیر المؤمنین نہیں دیکھ رہے ہیں تو کیا ہوا، امیر المؤمنین کا اللہ دیکھ رہا ہے؟ یہ ہے استحضار ہے، یہ ہے احتیاط اور یہ ہے تقوی کہ اللہ کی یاد بس جائے اور اس کے مطابق عمل شروع ہوجائے۔

رمضان کا دوسرا سبق قرآن سے گہرا، زندہ اور پائیدار تعلق ہے، رمضان اور قرآن لازم ملزوم ہیں، قرآن کریم کی فضیلت اور اہمیت کے بارے میں بہت سنا ہے آپ

نے ،اختتام رمضان پر یہ ذہن میں رکھئے کہ رمضان ہماری ذاتی کتاب ہے،اس میں ہمارا تذکرہ ہے،اس میں ہماری صفات ہیں ،وہ ہمارے لئے گائڈ بک ہے،آئینہ حیات ہے، اسی سے ہمیں رہنمائی مل سکتی ہے، جب یہ فکر ہوگی تو انشاءاللہ اللہ تعالی کی طرف سے توفیق ملے گی ،روزانہ تلاوت کا معمول ہو، بچوں کو بھی قرآن سکھانے کی طرف توجہ ہو، خواتین کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا جائے ، بلکہ گھروں میں تعلیمی حلقے لگیں،اس کے معانی کو سمجھنے کی کوشش کریں،اس پر عمل کریں اور دوسروں تک پہونچائیں ، یہی وجہ ہے،جس نے پہلے بھی زندگیوں میں انقلاب پیدا کیا ہے اور آج بھی یہ تاثیر اور قوت وطاقت اس کے اندر موجود ہے: إن الله يرفع بهذا الكتاب أقواما ويضع به آخرين (صحيح مسلم عن عمر بن الخطاب رضى الله عنه)

رمضان کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ ہمارے اندر جس طرح رمضان میں کچھ نہ کچھ دینے کا معمول رہا، سال بھر تھوڑا ہی سہی دیتے رہیں،اس کے دو فائدے ہوں گے،ایک یہ کہ مال پاک ہوگا ،اور دوسرا یہ کہ لالچ کی بیماری ہمارے سینوں سے نکل جائے گی ،حدیث پاک میں صاف آیا ہے کہ خدا کی قسم وہ مؤمن نہیں جو رات بھر پیٹ بھر کھا کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو،اور کروٹیں بدل رہا ہے،اور یہ بھی یاد رہے کہ ہم نے رمضان نے زکاۃ نکالی ہے، یہ فرض چیز ہے،اس کو نکالنا ہی تھا،فرض کے ساتھ نفلی چیزیں بھی ضروری ہیں،جس طرح نمازوں میں فرائض کے ساتھ نوافل ہیں،اسی طرح مال ودولت میں بھی فرائض کے ساتھ نوافل ہیں،قرآن کہتا ہے: لن تنالو ا البر حتى تنفقوا مما تحبون (آل عمران: ۹۲) تم نیکی تو نہیں پاسکتے یہاں تک کہ تم اپنی پسندیدہ چیز کو اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

رمضان کا یک سبق یہ بھی ہے کہ ہم جو کام کریں وقت کے اندر کریں ،ابھی ہم نے روزہ رکھا ،سحری کا وقت جیسے ختم ہوا ، کھانا پینا بند ، پھر افطار کا وقت ہوا تو افطار کیا ، رمضان ہمیں وقت کی پابندی سکھاتا ہے ،ہم زندگی کا کوئی بھی کام کریں وقت کے اندر

کریں ،صحیح وقت پر شروع کریں اور وقت کے اندر ختم کریں ،آج کل عام طور پر ہوتا یہ ہے پروگراموں کے وقت دیا جاتا ہے،گیارہ بجے اور شروع ہوتے ہیں بارہ بجے،اسی طرح ہم وعدہ کرتے ہیں کسی سے دس بجے کا،اور پہونچتے ہیں دس پندرہ منٹ کے بعد، یہ وقت کی پابندی نہیں،اور وعدہ خلافی بھی ہے،حدیث میں آیا ہے کہ لا إيمان لمن لا أمانة له ، ولا دين لمن لا عهد له (اس کا ایمان نہیں جس کے اندر امانت داری نہیں،اور اس کا دین نہیں،جس کے اندر وعہد کا پاس لحاظ نہیں۔

حضرات!

رمضان جا رہا ہے، رخصت ہو رہا ہے،اس سے پہلے تین باتیں خاص طور پر سن لیں۔(۱) صدقہ فطر،(۲) عید کی رات (۳) عیدالفطر کی تیاری اور اس کی سنتیں

جہاں تک صدقہ فطر کی بات ہے تو یہ ہر صاحب نصاب پر واجب ہے کہ وہ اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے نماز عید سے پہلے نکالے ،صدقہ فطر نکالنا واجب ہے، زکاۃ کا مسئلہ یہ ہے وہ نصاب پر سال گذرنے پر واجب ہوتا ہے،لیکن صدقہ فطر کے مال نصاب پر سال گذرنا ضروری نہیں ، بلکہ وہ عید کے دن بھی کسی کے پاس اتنا مال ہوگیا تو واجب ہوگا ، زکاۃ کے لئے سونا چاندی ،نقدی مال اور تجارت ضروری ہے،،لیکن صدقہ فطر کے لئے ضروریات سے زیادہ سامان ہوں تو یہ واجب ہوتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اس کا تعلق رمضان کے روزوں سے ہے کہ اس کی کمیوں کی تلافی ہوتی ہے۔صدقہ فطر کی مقدار پونے دوکلو گیہوں یا اس کی قیمت ،لیکن اگر کھجور، کشمش اور جو نکالیں تو ساڑھے تین کلو یا اس کی قیمت ہے۔صدقہ فطر کے مستحقین وہی ہیں جو زکاۃ کے مستحق ہیں ،مالداروں کا نہیں دیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آج کی رات انعام کی رات ہے،اور یہ رات بہت قیمتی ہے،اس کو عام طور پر تیاری میں اور لایعنی چیزوں مٰیں گذار دیا جاتا ہے، جب کہ شعب

الا یمان کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من قام لیلتی العید محتسبا لم قلبہ حیم تموت القلوب (جن نے عید کی راتوں میں عبادت کی، تو اس جس دن سارے دل مر جائیں گے اس کے دل نہیں مریں گے)

تیسری جیز یہ یے کہ عید الفطر کی سنتین ،کل ان شاء اللہ عید الفطر منائیں گے، لیکن اسکو شریعت کی روشنی میں منائیں،

پہلی سنت یہ ہے کہ عید کے دن وسیرے اٹھنا اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھنا

دوسرے یہ کہ جسم کے بال، وناخن کاٹنا اور مسواک کرنا اور غسل کرنا

تیسرے یہ کہ اچھا لباس پہننا چوتھے خوشبو لگانا،

پانچویں نماز سے پہلے صدقہ فطر ادا کرنا، چھٹے یہ کہ میٹھی چیز کھانا

ساتویں یہ کہ نماز کے لئے جلدی جانا آٹھویں یہ کہ عیدگاہ جاتے ہوئے آہستہ آہستے تکبیر تشریق پڑھنا اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر، اللہ اکبر، واللہ الحمد

یہ چند باتیں ہیں، ضرورت ہے کہ ہم اس جمعہ الوداع میں اس کا خیال رکھیں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیقات سے نوازیں۔

انفاق فی سبیل اللہ اور اس کی صورتیں

الحمد للّٰہ ربّ العالمین ، والصلاة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعهم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد ! فقد قال اللّٰہ تعالیٰ: "يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ، وَالْكَافِرُوْنَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ." (البقرة: ٣٤)

(اے ایمان والو! جو مال ومتاع ہم نے تم کو بخشا ہے، تم اس میں سے ہماری راہ میں ہمارے حکم کے مطابق خرچ کرو، قبل اس کے کہ قیامت کا وہ دن آجائے، جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہو سکے گی اور نہ کسی کی دنیوی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی سفارش کسی مجرم کو بچا سکے گی، اور نہ ماننے والے اصل ظالم ہیں)۔

حضرات! ہمارا اور آپ کا ایمان ہے کہ اس کائنات کے ذرے ذرے کا حقیقی خالق و مالک اللہ ہے، اور ہر چیز اُسی کی ملکیت ہے، لہٰذا مطالبہ بھی یہی ہے کہ ہر جگہ اسی کا نظام چلے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی کو مالدار بنایا، تو کسی کو غریب، مالدار کو خرچ کرنے کا حکم دیا، اور غریب کو سوال نہ کرنے کا، تاکہ اُس کے اندر صبر وشکر جیسی صفات پیدا ہوں، اِس طرح معاشرہ کے تمام طبقے اللہ کے اجر وثواب کے مستحق ہوں گے۔

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی متعدد صورتیں ہیں:

۱۔ زکاۃ: مخصوص شرائط ومدت کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

۲۔ نذر: آپ نے نذر کے ذریعہ کچھ نکالنے کو ضروری کرلیا تو اُس کی ادائیگی واجب ہے

۳۔ کفارہ: یہ مختلف وجوہات اور گناہوں کی وجہ سے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

۴۔ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا یہ واجب اور ضروری ہے۔

۵۔ نفلی صدقات۔

حضرات! قرآنِ کریم میں پچہتر آیتیں ایسی ہیں، جو بلا واسطہ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیتی ہیں، اس کے دنیوی واخروی فوائد وثمرات کو بہت واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے، سورۂ بقرہ میں ہے: "مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ، وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ (البقرة: ٢٦١) (جولوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ کہ اس سے سات بالیاں اُگیں، اور ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں، اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے، اور وہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے)

حضرات! اسلام کے پانچوں ارکان میں ایک اہم رکن زکاۃ ہے، نماز وروزہ جسمانی عبادت ہیں، تو زکاۃ مالی عبادت ہے، یعنی یہ اس وقت ادا ہوتا ہے جب انسان مال کا ایک متعین حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کردے، نماز وروزہ ہر مسلمان پر فرض ہیں، چاہے امیر ہو یا غریب، اس کے گھر میں کھانے کو ہو یا نہ ہو، وہ جھونپڑی میں رہتا ہو یا کوٹھی میں، لیکن زکاۃ انھیں پر فرض ہے، جن کے پاس روزمرہ کی ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد سال بھر رقم باقی ہے، تیسرا فرق ہے کہ نماز اور روزہ صرف خدا کا حق ہیں، لیکن زکاۃ خدا کے ساتھ بندوں کا بھی حق ہے۔

حضرات! زکاۃ کے معنی ہوتے ہیں پاک کرنے کے، شریعت میں خالص خدا کی خوشنودی کے لئے شارع کے حکم کے مطابق ایک مقررہ اور متعین مال کسی مستحق مسلمان کو مالک بنادینے کا نام زکاۃ ہے۔

حضرات! مال ایک انسانی ضرورت ہے، اس سے محبت فطری طور پر ہر انسان کے اندر ہوتی ہے، قرآن میں آیا ہے: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ (العادیات: ۷) (وہ

مال کا بڑا دلدادہ ہے)، مال کو قرآن نے قیام للناس کہا ہے یعنی وہ لوگوں کے بقاء کا ذریعہ ہے، علامہ اقبالؒ نے اس کو قاضی الحاجات (یعنی ضرورتوں کو پوری کرنے والا) کہا ہے:

اگر چہ مال ہے دنیا میں قاضی الحاجات
مگر جو فقر سے ممکن تونگری سے نہیں

اس مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے میں بڑے اجر اور ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، کتب احادیث میں بخاری ومسلم کے حوالے سے ہے کہ روزانہ دو فرشتے اترتے ہیں، اُن میں سے ایک کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بہت دے، اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ! روکنے والے کے مال کو تباہ کردے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص ایک کھجور کے برابر خرچ کرتا ہے اور حلال کمائی سے کرتا ہے...تو اللہ اُسے قبول فرماتے ہیں، اور اُس کو اِس طرح بڑھاتے ہیں جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔

مسلم شریف کی راویت ہے کہ ایک آدمی کہیں جارہا تھا کہ اُس نے بادل سے ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سینچ دو، چنانچہ بادل اپنی جگہ سے ہٹا اور سارے پانی کو ایک قطعہ زمین میں انڈیل دیا، وہ شخص جس نے آواز سنی تھی اسی بادل کی سمت گیا، تھوڑی دور جاکر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی اپنا کھیت سینچ رہا ہے، پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ اس نے وہی نام بتایا جو نام اس نے سنا تھا، اس نے پوچھا: اللہ کے بندے! میرا نام تم نے کیوں پوچھا؟ اس نے جواب دیا:. میں نے بادل سے آواز سنی کہ تمہارے کھیت کو سینچ آو، اچھا بتاؤ: تم کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا: اس کھیت کی پیداوار کا ایک حصہ راہِ خدا میں صرف کرتا ہوں، دوسرا اپنے اہل وعیال کے لئے رکھتا ہوں، اور تیسرا اسی میں صرف کردیتا ہوں۔

اب آیئے دیکھئے صحابہ کرامؓ کا جذبہ انفاق کیا تھا؟

حضرت ابوطلحہ انصاریؓ مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے، اُن کا محبوب مال مسجدِ

نبوی ﷺ کے سامنے کھجور والا باغ تھا، سورہ آل عمران کی آیت: "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مما تُحِبُّونَ (آل عمران: ۹۲) (جب تک اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کرو گے کامل نیکی کے مرتبہ کو نہ پہونچ سکو گے) نازل ہوئی، تو اُس کو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شاباش: نفع بخش مال ہے، نفع بخش مال ہے۔

حضرت ابوالدحداحؓ نے سورۂ حدید کی آیت "مَنْ ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً فَيُضَاعِفَه لَهُ، و لَه أَجْرٌ كَرِيمٌ (الحديد: ۱۱)" سنی تو انھوں نے اپنا باغ اللہ کے راستے میں دے دیا۔

حضرات! اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے دنیوی فائدے بھی ہیں اور اخروی بھی:

صدقہ کرنا عرش الٰہی میں سایہ دلائے گا۔ صدقہ کرنا قبر کی آگ کو بجھاتا ہے۔

صدقہ کرنا اللہ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ صدقہ قیامت کے دن دلیل اور حجت ہوگا۔

حضرات! آج کل دنیا میں شور ہے کہ غریبی کیسے دور کی جائے، فقر و فاقہ کیسے مٹایا جائے، صحیح بات یہ ہے کہ اسلام نے زکوۃ اور اُس کے متعلقات کی جو صورتیں تجویز کی ہیں، اگر نافذ کردی جائیں تو بھکمری خود بخود دور ہوجائے گی، دنیا نے تجربہ کرلیا، سرمایہ دارانہ نظام کا، کمیونزم اور سوشلزم کا، اور اب تجربہ کررہی ہے سودی نظام کا، اس میں اس کو سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسلامی نظام حیات کو اپنائے۔

حضرات! اس وقت خرچ کرنے کی صورتوں میں سے چند صورتیں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ علم کی نشر واشاعت میں خرچ کرنا۔ ۲۔ رفاہی کاموں میں خرچ کرنا۔

۳۔ یتیموں کی کفالت کرنا۔ ۴۔ محتاجوں کی دادرسی کرنا۔

اور ان کے علاوہ معاشرہ کی ضرورت کو دیکھ کر خرچ کرنا

اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

زکاۃ اور رمضان

الحمد لله ربّ العلمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين أما بعد: فقد قال الله تعالى: " وأقِيموا الصلاةَ وآتُوا الزكاةَ، وأقرِضوا اللهَ قَرضاً حسنا، وما تُقَدِّمُوا لأنفُسِكم مِن خَير تَجِدُوه عِندَ الله هو خَيراً وأعظم أجراً، واستغفِرُوا اللهَ، انّ اللهَ غَفُور رَحيم (المزمل: ۲۰)

(اور نماز پڑھتے رہو، اور زکاۃ دیتے رہو، اور اللہ کو اچھی طرح قرض دیتے رہو، اور جو بھی نیک عمل بھیج دوگے اسے اللہ کے پاس پہونچ کر پاؤگے، اس سے اچھا اور اجر میں بڑھا ہوا، اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو، بے شک اللہ بڑا مغفرت والا، اور بڑا مہربان ہے)

حضرات! جان اور مال اللہ کی عظیم نعمتیں ہیں، اللہ نے امانت کے طور پر ان کو انسان کے حوالہ کیا ہے، اور مطالبہ بھی کیا ہے کہ ان دونوں کو اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کرے، جان سے مراد انسانی وجود ہے، اور مال وہ گاڑھی کمائی جس کو انسان محنت ومشقت کے بعد حاصل کرتا ہے، مال کو قرآن نے قیام للناس (لوگوں کے زندہ رہنے کا ذریعہ) قرار دیا ہے، ایک جگہ مال کو فضل کہا گیا اور ایک جگہ خیر کہا گیا۔

اسلام کا بنیادی رکن زکاۃ ہے، وہ مالی اور قلبی عبادت ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی حاصل کی جاتی ہے، اور بخل، حرص اور لالچ کو دلوں سے نکالا جاتا ہے، اور ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "آپ ان کے مال سے صدقہ قبول کرلیجئے، تاکہ اس کے ذریعہ انھیں پاک صاف کردیں اور انھیں دعا دیجئے"۔

حضرات! زکاۃ سنہ ۲ ہجری میں فرض ہوا، لیکن اس کے تفصیلی احکامات ۸ھ

مدینہ منورہ میں آئے، قرآن کریم میں نماز کے ساتھ زکاۃ کا تذکرہ بار بار آیا ہے اور ۸۲/ بار آیا ہے، زکاۃ سابقہ امتوں کے ساتھ اس امت میں بھی فرض ہے۔

حضرات! اللہ تعالیٰ نے انسان پر جسمانی اور مالی دونوں حقوق فرض کئے ہیں، نماز اور روزہ جسمانی عبادت ہیں، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کئے جاتے ہیں، لیکن زکاۃ مالی عبادت ہے جو بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے ہے، زکاۃ کا نظام پھلوں، جانوروں، سونے چاندی اور سامانِ تجارت میں ہے، جو ان چیزوں میں زکاۃ نہیں نکالتے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعید سن لیں، قیامت کے دن سونے چاندی کو تپایا جائے گا، اور ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ یہ بدلہ تمہارے مال جمع کئے ہوئے کا، تو تم اپنے مال جمع کئے جانے کا مزا چکھو (التوبہ: ۳۵)

حدیث میں آیا ہے: جس مال کی زکاۃ ادا نہیں کی گئی وہ قیامت کے دن دو سانپ کی طرح اس کے جبڑے اور گردن کو نوچے گا اور کہے گا: میں تمہارا مال ہوں اور میں تمہارا خزانہ ہوں (صحیح بخاری بروایت ابوھریرۃ)

حضرات! پہلے زمانہ میں اللہ کی راہ میں صدقہ کی قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ صدقہ کا مال کسی جگہ رکھ دیا جاتا اور آسمان سے آگ آکر اسے جلد خاکستر کر دیتی، گویا صدقہ کا مال کسی بھائی کے کام نہ آتا، اللہ تعالیٰ نے امت مرحومہ پر یہ کرم فرمایا کہ اس سے زکاۃ کی شکل میں وصول کیا ہوا مال اسی کے ضرورت مند افراد پر خرچ کر دیا جاتا ہے: "تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ اِلَى فُقَرَائِهِمْ." (متفق علیہ، بروایت عبداللہ بن عباس)

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ زکاۃ کی ادائیگی اور صدقہ وخیرات مال سے مال گھٹ جاتا ہے، لیکن قرآن وحدیث کی صراحت یہ ہے کہ صدقہ سے مال گھٹتا نہیں، بلکہ بڑھتا ہے، حدیث میں آیا ہے: "ما نَقَصَ مَالٌ مِن صَدَقَةٍ" بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مال کم ہوا ہے، لیکن حقیقی معنوں میں مال میں اضافہ ہوا ہے، صدقہ کرنے سے نقد فائدہ حاصل ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: "صدقہ اللہ کے غصہ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔" (سنن ترمذی)

سنن ابوداؤد میں ہے کہ زکاۃ ادا کر کے اپنے اموال کو مضبوط کرنے کا انتظام کرو، صدقہ کے ذریعہ اپنے مریضوں کا علاج کرو، اور دعاء وگریہ وزاری کے ذریعہ آسمانوں کے طوفانوں کا مقابلہ کرو۔

حضرات! نصاب کی مقدار کیا ہے؟

سونے کا نصاب:	سات تولہ سونا	۸۷/ گرام
چاندی:	ساڑھے باون تولہ چاندی	۶۱۲/ گرام

حضرات! زکاۃ کن کو دی جائے گی؟ قرآن کریم کے سورۂ توبہ میں اس کو واضح کر دیا گیا ہے، اس کے متعدد مستحقین ہیں:

۱۔ فقراء ۲۔ مسکین ۳۔ قرض خواہ

۴۔ مسافر ۵۔ زکاۃ کو وصول کرنے والے

۶۔ غلام۔ گرفتار افراد۔ ۷۔ اللہ کے راستے میں۔

صدقۂ فطر

روزہ خواہ کتنے ہی اہتمام سے رکھے، کچھ نہ کچھ کوتاہی ہو ہی جاتی ہے، لغو، فضول باتوں سے احتراز نہیں ہو پاتا، اسی کی تلافی کے لئے صدقۃ الفطر رکھا گیا ہے، اور یہ روزہ داروں کے لئے واجب ہے، صدقۂ فطر کے دو مقاصد ہیں: روزہ کی کوتاہیوں کی تلافی، اور امت کے مسکینوں کے لئے عید کے دن رزق کا انتظام۔

جو شخص زندگی کی لازمی ضروریات کے علاوہ اتنی قیمت کے مال کا مالک ہو جس پر زکاۃ واجب ہو سکے تو اس شخص پر عید الفطر کے دن صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے، رمضان کا مہینہ خیرات وصدقات کا مہینہ ہے، اس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے، چونکہ اس میں نوافل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر ہو جاتا ہے، اس لئے لوگ رمضان میں زکاۃ ادا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ بہت مبارک عمل ہے، اس مہینہ میں زکاۃ

دی جائے، لیکن زکاۃ دینے میں مستحقین کو پریشان کرنا یہ کسی طرح سے مناسب نہیں۔

☆ ہندوستان کے طول وعرض میں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔اس میں غریب طلباء بھی پڑھتے ہیں اور مال دار بھی، غریب طلباء کو زکاۃ کی مد سے وظائف دے کر ان کو خود کفیل بنایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں مدارس کے سفراء اور محصلینِ زکاۃ کی حصول یابی کے لئے جاتے ہیں، ایسے محصلین کو تحقیق کر کے زکاۃ دینا صحیح جگہ زکاۃ کو پہنچانا ہے۔

☆ ہمارے شہر میں رکشا چلانے والے اور سخت کام کرنے والے مزدور بہت ہیں، وہ روزانہ کماتے ہیں اور روزانہ کھاتے ہیں یعنی روزانہ کنواں کھودتے ہیں اور روزانہ پانی پیتے ہیں، ایک مرتبہ میں ایک رکشتہ پر بیٹھا ہوا تھا، رکشے والے سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ وہ مسلمان تھا، میں نے کہا کہ روزہ تو رکھ رہے ہوں گے، کہا کہ اتنی سخت دھوپ میں رکشا چلا کر روزہ رکھ پاؤں گا، اب ہمارا اور آپ کا اخلاقی حق ہے کہ ایسے افراد کے بارے میں معلوم کر کے ان کو زکاۃ کا مال پہنچائیں، بہت سے گھر ایسے ہیں جہاں لڑکیاں بے نکاح پڑی ہیں، شادی نہیں ہو رہی ہے۔زکاۃ کے ذریعہ ایسے افراد کی مدد کی جاسکتی ہے؟

☆ معاشرہ میں ایک طبقہ ہے جو زکاۃ کا مستحق ہے، لیکن وہ خوددار ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے، ضرورت ہے کہ ایسے افراد کو تلاش کر کے ان کو زکاۃ دی جائے تاکہ ان کی ضرورت پوری ہوجائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

عیدین، حج، قربانی

عیدالفطر
زندگی میں انقلاب کا دن

الله أكبر الله أكبر، لا إله إلاّ الله، والله أكبر ، الله أكبر ، ولله الحمد
الحمد للّه، نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل
عليه، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيّئات أعمالنا ، من يهده
اللّه، فلا مضلّ له، ومن يضلله فلا هادي له، وأشهد أن لآ إله إلاّ الله
وحده لا شريك له، وأشهد أن سيّدنا محمدا عبده ورسوله، صلّى الله
عليه وعلى آله وأصحابه وأزواجه وذريّاته، وبارك وسلّم تسليماً
كثيرا.أما بعد : فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم، بسم الله الرحمن
الرحيم: يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ، وَلِتُكْمِلُوْا الْعِدَّةَ
وَلِتُكَبِّرُوْا اللّٰهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ." (البقرة: ١٨٥)

(اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا، اور یہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرلیا کرو، اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کرو، اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، عجب نہیں کہ تم شکر گذار بن جاؤ)

محترم حضرات، معزز سامعین!

آج کا دن عید الفطر کا دن ہے، عید الفطر رمضان کے روزوں کے انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، یہ انعام کا دن ہے، ہم نے اللہ کی توفیق سے پورے رمضان کے روزے رکھے، قرآن کی تلاوت کی، اپنی ذات کو ذکر و دعا میں مشغول رکھا، شب قدر کو تلاش کیا، تراویح کا اپنے آپ کو پابند کیا، اللہ کو یہ ادا بہت پسند آئی، چنانچہ اس نے بدلہ کے

طور پر ایک دن متعین فرمایا، اور وہ عید الفطر کا دن ہے۔

امام منذریؒ نے ترغیب وترہیب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عید کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے چوراہوں اور شاہراہوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اعلان کرتے ہیں کہ اے امت محمدیہ کے افراد! چلو، اس رب کی بارگاہ کی طرف جو زیادہ بخشنے والا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں سے سوال کرتے ہیں: کیا بدلہ ہے اس مزدور کا، جس نے اپنی مزدوری پوری کی، فرشتے عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ان کا بدلہ یہی ہے کہ ان کی مزدوری پوری دے دی جائے، پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ فرشتو! گواہ رہنا: میری عزت کی قسم، میری علوشان کی قسم، میری بلندئ مرتبہ کی قسم! میں نے اپنی رضامندی اور مغفرت سے انھیں نوازا، اعلان کردو کہ اپنے گھروں کو اس حال میں جاؤ کہ تم بخشے بخشائے ہو، اللہ ہم میں سے ہر شخص کو اس کا مستحق بنائے۔

میرے بزرگو! حدیث میں آیا ہے کہ بلاشبہ روزہ دار کو دو مسرتیں حاصل ہوتی ہیں: ایک افطار کے وقت، اور دوسرے رب کی دیدار کے وقت، افطار کا مطلب رمضان میں روزانہ افطار کے وقت، اور عید الفطر جس دن روزہ رکھنا حرام ہے، اس دن بھی، اور دوسرے جنت میں ان شاء اللہ، اللہ کا دیدار نصیب ہوگا، اس وقت بے پناہ مسرتیں حاصل ہوں گی: "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" (یونس:٢٦) (جن لوگوں نے نیک کام کئے ان کو جنت ملے گی اور دیدار الٰہی سے وہ شرف یاب ہوں گے)، اے اللہ! ہم میں سے ہر شخص کو اپنی دیدار سے مشرف فرما۔

معزز سامعین! رمضان کا مہینہ ایک انقلابی مہینہ تھا، اس نے سارے معمولات کو بدل کر رکھ دیا، حرام چیزوں پر پابندی تو پہلے ہی تھی، لیکن حلال چیزوں پر بھی ایک خاص وقت تک کے لیے پابندی لگادی، مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی عادتوں کا غلام نہیں، اللہ کا غلام ہے، اللہ کے زیر حکم ہے، یہی وجہ ہے کہ روزہ کا انعام خود اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ان کا وجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ حدیث قدسی میں فرماتے ہیں: "الصَّومُ لِي وأنَا أجزِي بِهِ. (اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا" (بخاری:۱۲۶۱) قرآن کریم میں آیا ہے: "يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَافَّةً، وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ، اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ." (البقرۃ:۲۰۸) (اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے)

حضرات! رمضان اس لئے آتا ہے کہ ہماری زندگی میں ایک تبدیلی آئے، ہمارے معمولات میں فرق آئے، ہماری تقریبات شریعت کے سانچے میں ڈھل جائیں اور تقویٰ کی صفت پیدا ہوجائے، خوف خدا ہر جگہ غالب رہے، ایک عمل بھی شریعت کے خلاف نہ ہو، لیکن دیکھا جاتا ہے، اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ رمضان کے ختم ہوتے ہی ہمارا دینی جذبہ کمزور پڑ گیا ہے، فرائض میں وہی سستی، حقوق کی ادائیگی میں وہی سہل انگاری، شادیوں کی تقریبات میں وہی فضول خرچی، ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں وہی کوتاہی، امانت میں وہی خیانت، گویا ہم پر رمضان کا کچھ اثر نہیں ہے۔

حضرات! ہمیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ اللہ کا قانون اور اس کا نظام ہے کہ انسان جو بھی عمل کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملے گا، اللہ کے یہاں کسی کی رشتہ داری نہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قوموں کے درمیان منتخب کیا، ان میں انبیاء اور رسول بھیجے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ." (دخان:۳۲) (اور ہم بنی اسرائیل کو اپنے علم کے مطابق تمام دنیا جہان والوں پر فضیلت دی)۔ لیکن انھوں نے اس اعزاز کا پاس ولحاظ نہیں رکھا، معصیتیں کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ انبیاء تک کو شہید کیا، دین پر عمل کرنے والوں کا مذاق اڑایا، آیتوں میں تحریف کی تو اللہ نے انھیں تو پہلے موقع دیا کہ اب سدھر جاؤ، سنبھل جاؤ، جب انھوں نے کسی طرح بات نہیں مانی تو اللہ نے انھیں اعزاز سے محروم کردیا: "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ" (ان پر ذلت اور محتاجی جمادی گئی ہے) (آل عمران:۱۱۲)

حضرات! یہ بڑی عبرت کی بات ہے، قرآن کریم کا یہ نظام ہے کہ اگر صرف باپ

دادا اچھے ہیں، تو یہی کافی نہیں، بلکہ انسان کو خود عمل کرنا پڑے گا، صرف یہی کافی نہیں کہ ہم قرآن والے ہیں، ہم رمضان والے ہیں، ہم امت محمدیہ کے فرد ہیں، ہندوستان کے اندر اس کی مثالیں موجود ہیں، مسلمانوں نے یہاں آٹھ سو سال تک حکومت کی، لیکن جب ان کے اخلاق وکردار میں زوال آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ ملک ان سے چھین کر انگریزوں کو دے دی، اندلس کی تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ وہ بھی ایک لمبی مدت تک اسلامی ثقافت کا مرکز رہا، لیکن جب کوتاہی ہوئی تو وہ ملک وہاں کے مسلمانوں سے چھین لیا گیا، تو اقبال کی زبان میں: مسجدیں اذان کو ترس گئیں، تاتاریوں کے ذریعہ بغداد کی تباہی کی داستان اظہر من الشمس ہے، بغداد عہد عباسی میں خلافت کا مرکز رہا، کیا یہ مرکزیوں ہی چھین لیا گیا، نہیں بالکل نہیں، اس کے اسباب اور وجوہات ہیں، بغداد میں رسم ورواج اور من مانی زندگی عام ہوگئی تھی، صرف ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں کہ بغداد کے مسلمان عید اور بقرعید کی نماز پڑھنے جب جاتے تو جلوس کی شکل میں جاتے، وہ جلوس بڑا زبردست ہوتا، اس میں خلیفہ اور بادشاہ ہوتے، تاریخ میں لکھا ہے کہ بعض دفعہ عیدگاہ پہنچتے پہنچتے مغرب ہوگئی، اور عید کی نماز مغرب کے بعد ادا کی گئی، بیچ کی نمازوں کا کیا حال ہوگا، شان وشوکت، دکھاوا اور رسمیات میں یہ امت بہت آگے نکل گئی تو اللہ تعالیٰ نے تاتاریوں کے ذریعہ اس کو پٹوایا، جس طرح بنی اسرائیل کو بخت نصر کے ذریعہ سے پٹوایا، تین روز تک اس طرح قتل کیا گیا کہ دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا، کتب خانوں کو جلایا گیا اور دریا میں ان کو پھینکا گیا کہ دریا کا پانی کالا ہوگیا۔

میرے بزرگو! یہ تاریخی حقائق ہیں کہ جب بھی اسلامی شریعت میں کوتاہی ہوگی تو اللہ تعالیٰ سخت آزمائش میں ڈالیں گے، یہ رمضان کا مہینہ اسی لیے آتا ہے کہ ہم کو شریعت کا پابند بنادے، ایک مہینے تک ہم ٹریننگ کورس میں تھے، اب اس کورس کے مطابق اپنی زندگی نہ گزاریں تو ہم نے کورس کا حق ادا نہیں کیا، اور رمضان کے تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔

رمضان کا مہینہ غم خواری کا مہینہ تھا، اس نے ہم کو یہ درس دیا کہ جس طرح سے ہم اپنی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہیں، اسی طرح سے اپنے ہم وطنوں کی ضروریات کا لحاظ رکھیں، انسانیت

کی بنیاد پر ہر ایک کا لحاظ رکھیں، کیوں کہ پوری انسانی برادری ایک کنبہ کے مانند ہے، اور اللہ کے نزدیک وہی پسندیدہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے۔ انبیاء کرام نے ہمیشہ اپنی دعوت میں پورے انسانی کنبہ کو موضوع بنایا، ان کے نزدیک رنگ و نسل، قوم و وطن کا کوئی فرق نہیں تھا، ہم بھی انھیں کے ماننے والے ہیں، اس لئے ہمیں اس نقش پر چلنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، انبیاء کرام نے بتایا کہ انسان اس زمین پر اللہ کی عظیم مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کا مسجود بنایا، عقل و فہم عطا کی، قوت گویائی عطا کی، اس کا حق تھا کہ یہ انسان اللہ کے سامنے جھکے، ذاتی بڑائی میں مشغول نہ ہو، لیکن یہ انسان اپنے منصب حقیقی کو بھول گیا، اور اپنی ہی جنس کے افراد پر حملہ آور ہوگیا، قابیل نے ہابیل کو قتل کیا، یوسف کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا، فرعون نے بنو اسرائیل کے بچوں کو تہہ تیغ کیا، قبائلی نخوت کی بنا پر سیکڑوں افراد زمانۂ جاہلیت میں قتل کئے گئے، جنگ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوم میں لاکھوں انسانوں کو تہہ تیغ کیا گیا، یہ سب اسی انسانیت کے مقام کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ خود فراموشی نتیجہ ہے خدا فراموشی کا، انسان جب اللہ کو بھول جاتا ہے تو وہ خود کو بھول جاتا ہے: "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ، أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ." (الحشر: ۱۹) (اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، سو اللہ نے خود ان کی جانوں کو ان سے بھلا دیا، یہی لوگ تو نافرمان ہیں)، رمضان اسی لیے آتا ہے کہ ہمارے اندر خدا فراموشی کا مادّہ نہ پیدا ہو۔

رمضان ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم دنیا کے نفع کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، صرف ہم اپنی ذات کی فکر نہ کریں، بلکہ اپنے پڑوسی کی فکر کریں، پڑوسی کئی طرف کے ہوتے ہیں: رشتہ دار پڑوسی۔ دوسرے مذہب کا پڑوسی، اور پہلو کا ساتھی، یہ سب ہماری توجہ کا مرکز ہوں، ہم سیرت رسول پاک ﷺ کے حلف الفضول نامی معاہدہ کے مبلغ اور داعی ہوں اور اس کو ہر سطح پر عام کرنے والے ہوں، مسلمانوں سے مطالبہ ہے کہ وہ جہاں کہیں رہیں اپنے ماحول کی فکر کریں، شتر مرغ کی طرح ریت میں اپنا سر نہ چھپائیں۔ اور "سب خیریت ہے" کا سبق

نہ دہرائیں، ہر جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے، انسانوں کے ساتھ خیر خواہی میں سب پہلی بات یہ کہ ہم اللہ کے ماننے والے ہو جائیں، ہمارے اندر شرک کا شائبہ تک نہ ہو، ایک طرف اللہ کی توحید ہو، تو دوسری طرف غیر اللہ کی نفی بھی ہو، اسی بات کی تلقین کلمہ وغیرہ میں کی گئی ہے، دوسری طرف ظلم کے خلاف، بدامنی کے خلاف، سینہ سپر ہو جائیں، اور معاشرہ کو آگاہ کریں کہ اگر ہم ڈوبے تو سب ڈوبیں گے۔

حضرات! رمضان قرآن کا مہینہ ہے، اور قرآن کی پہلی آیت علم کی تلقین کرتی ہے، علم ترقی کا زینہ ہے، علم سب سے بڑی دولت ہے، لیکن علم کی دو قسمیں ہیں: ایک فرض عین اور دوسرے فرض کفایہ، فرض عین شریعت کا علم، حلال و حرام کا علم، جائز و ناجائز کا علم ہے، اور فرض کفایہ وہ علم ہے جو زندگی کے کسی فن سے متعلق ہو، جیسے طب کا علم، انجینئرنگ کا علم، وکالت کا علم، سورج و چاند کا علم، آج پوری دنیا میں علم کا بہت شور ہے، لیکن شر و فساد ہے کہ ختم نہیں ہو رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بنیادی علم پر توجہ نہیں ہو رہی ہے، ہمیں غور کرنا چاہیے کہ پانی کہاں مر رہا ہے، غلطی کہاں کہاں ہو رہی ہے، جس سے انسان انسانیت کا علمبردار نہیں بن رہا ہے، قرآن اور رمضان دونوں بتاتے ہیں کہ جب علم اللہ کے نام سے جوڑ کر حاصل کیا جائے گا تو علم تعمیری ہوگا، تخریبی نہیں ہوگا، اسے انسانوں کی قدر معلوم ہوگی، نعمتوں کا احساس ہوگا۔

اسلام نے قدیم اور جدید اور دینی اور دنیوی علم کی کوئی تقسیم نہیں کی، ہمارے اسلاف نے قربانیاں دے کر علم دین کی حفاظت کی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم کو دین ملا، اسلام ملا، قرآن ملا، اگر ہم نے یوں ہی اپنے وقت کو ضائع کر دیا تو آئندہ نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا، کچھ نہیں کہا جا سکتا، اس لئے ہمیں قرآن، حدیث، فقہ اور بنیادی تعلیمات سے ہر حال میں واقف ہونا ہے اور اپنے بچوں کو بھی واقف کرانا ہے۔

حضرات! عید الفطر کا یہ دن اتحاد کا پیغام لے کر آتا ہے، سارے اختلافات آج مٹ جائیں گے اور لوگ ایک دوسرے سے گلے مل کر آپسی محبت اور تعلق کا ثبوت دیں گے، اختلاف کہاں نہیں، صحابۂ کرامؓ کے دور میں اختلافات تھے، لیکن انھوں نے

اختلافات میں معاملہ کرنے کا ہنر بتایا ہے، نفس کی بنیاد پر، انا کی بنیاد پر، ذات کی بنیاد پر جو اختلافات ہوتے ہیں، ان کو حل کرنے کے لیے اچھا گمان قائم کرنا پڑے گا، ہر وقت بدگمانی کی کیفیت ہوگی تو اختلافات مزید بڑھیں گے، اچھا گمان ہوگا تو سارے اختلافات دور ہوں گے، اور اگر اختلافات ہو گئے ہیں تو ان کو اچھی تدبیر سے حل کرنا ہوگا، اللہ ہمارے سینوں کو بغض وعداوت سے پاک وصاف فرمائے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ پرانی قوموں کی عداوتیں تمہارے اندر منتقل ہو رہی ہیں، یہ دین کو مونڈنے والی ہیں۔

میرے بزرگو! روزہ انقلاب کے لیے آتا ہے، اور انقلاب کا مطلب تبدیلی ہے، ہمارے تمام اعمال میں تبدیلی ہوجائے، اسلامی شریعت پر ہم آجائیں تو یہ انقلاب معتبر ہے، انقلاب کا مطلب کوئی طوفان نہیں، بلکہ معمول سے ہٹ کر اسلامی طرز کی زندگی ہم گزارنے لگیں۔

حضرات! ابتدا میں میں نے ایک آیت پڑھی تھی، وہ عید الفطر سے متعلق ہے، اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتے ہیں، سختی نہیں چاہتے، اور تم رمضان کے ۲۹-۳۰/روزے پورے کرو، اور اللہ کی ہدایت پر ان کی بڑائی بیان کرو، اور شکر کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو۔

آج کا دن شکر کا دن ہے، عید کی نماز شکرانہ کی نماز ہے، اللہ تعالیٰ نے روزوں کے انعام کے طور پر یہ عید الفطر عطا فرمایا ہے، اس کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ دو دن تہوار کا اہتمام کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دوسرے دو دن عطا فرمائے ہیں: عید الاضحیٰ اور عید الفطر۔ اس طرح آج کا دن امت محمدیہ کے لئے خاص انعام ہے، اس دن کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جائز مشغولیات میں مشغول رہیں، ناجائز کاموں سے پرہیز کریں، آج کے دن خاص طور سے حلال وحرام کا لحاظ ہو، خواتین میں پردہ کا اہتمام ہو، اور سنجیدہ مجالس میں شریک ہونے سے اسلام کبھی منع نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنے دین پر چلنا آسان فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

عید الفطر کا پیغام

الله أكبر ، الله أكبر لا إله إلا الله ، والله أكبر ، الله أكبر ولله الحمد ، الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه ، ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين ، أما بعد ۔ فقد قال الله تعالى : يريد الله بكم اليسر ، ولا يريد بكم العسر ، ولتكملوا العدة ولتكبروا الله على ما هداكم و لعلكم تشكرون (البقرة : ١٨٥)وقال تعالى : ما يلفظ من قول إلا لديه رقيب عتيد (ق : ١٨). (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تمارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، اور تمارے ساتھ تنگی نہیں چاہتا ہے، اور تاکہ تم متعینہ مدت پوری کرو، اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے، اور تاکہ تم شکر گذار بن جاؤ، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: انسان کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالتا، مگر اس کے پاس ایک نگراں تیار رہتا ہے)

محترم حضرات، اور معزز سامعین !

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی فطری خوشیوں اور مسرتوں کے اظہار کے لئے دو تہوار عطا فرمائے ہیں، جن میں ایک عید الفطر ہے اور دوسرے عید الأضحیٰ، یہ دونوں تہوار مدینہ میں مسلمانوں کو ملے، سنن ابوداود اور سنن نسائی میں ہے، حضرت أنس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ نیروز اور مہرجان نامی تہوار مناتے ہیں، پوچھنے پر مدینہ والوں نے بتایا کہ زمانہ جاہلیت سے ہم ان دونوں تہواروں کا مناتے رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا کہ اللہ تعالی نے تم کو ان کے بدلہ عید الفطر اور عید الأضحیٰ نامی تہوار عطا فرمایا ہے، اسلامی عیدوں کی امتیازی بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو دو عظیم عبادتوں سے جوڑ دیا ہے، ایک رمضان المبارک کے اختتام پر دوسرے حج بیت اللہ کے مکمل ہونے پر۔ اور درست فرمایا زبان رسالت نے: لكل قوم عيد و هذا عيدنا (ہر قوم کے لئے ایک عید ہے اور یہ ہماری عید ہے)

حضرات! آج عید الفطر کا دن ہے، یہ رمضان المبارک کے روزوں کی تکمیل پر شکرانہ کے طور پر ملی ہے، عید کے معنی ہوتے ہیں بار بار آنے والی خوشی کے، اور فطر کے معنی ہوتے ہیں: افطار کرنے کے، یعنی ایک مہینے کے روزے کے بعد ملنی والی خوشی، اسی کو حدیث میں بیان کیا گیا ہے: للصائم فرحتان : فرحة عند فطره ، و فرحة عند لقاء ربه (روزے دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں: ایک افطار کے وقت یعنی روزہ شام کو جب وہ افطار کرتا ہے، اور ایک مہینہ کے بعد جب عید کا دن ہوتا ہے، دوسرے جب جنت میں اللہ کی زیارت ہوگی اور دیدار نصیب ہوگا تو اس وقت بھی غیر معمولی خوشی ہوگی، وجوه يومئذ ناضرة إلى ربها ناظرة ۔

حضرات! آج کا دن بہت مبارک اور قابل احترام ہے، انعام کا دن ہے، مغفرت اور اللہ کی رضا پانے کا دن ہے، امام منذری نے ترغیب وترہیب میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ و نے فرمایا: جب عید کا دن ہوتا ہے تو اللہ کے فرشتے چوراہوں اور راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اعلان کرتے ہیں اے امت محمدیہ کے افراد چلو اس رب کی طرف جو زیادہ بخشنے والا ہے، پھر اللہ تعالی فرشتوں سے سوال کرتے ہیں کہ کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جس نے اپنی مزدوری پوری کی، فرشتے عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ان کا بدلہ یہی ہے کہ ان کی مزدوری پوری کی پوری دے دی جائے، پھر اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: اے فرشتو!

گواہ رہنا! میری عزت کی قسم! میری علوشان کی قسم، میری بلندئ مرتبہ کی قسم، میں نے اپنی رضامندی اور مغفرت سے انہیں نوازا۔ اعلان کردو کہ اپنے گھروں کو اس حال میں جاؤ کہ بخشے بخشائے ہو، اللہ تعالی ہم سے ہر شخص کو اس کا مستحق بنائے۔

حضرات! اللہ کے فضل سے جو ہم نے روزے رکھے، اگر غور کیا جائے تو اس کی دو قسمیں ہیں: ایک روزہ وہ ہے جو رمضان میں صبح سے شام تک تھا، جائز چیزوں کو اللہ تعالی نے ہمارے لئے حرام کر دیا تھا، اس روزے کا ثواب اللہ تعالی نے یہ ایک حدیث قدسی میں فرمایا: الصوم لي و أنا أجزي به ، روزہ میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، دوسرا روزہ وہ ہے، بالغ ہونے کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اور موت کے وقت تک جاری رہتا ہے، یہ ہر مسلمان کا روزہ ہے، رمضان کا روزہ تو مکمل ہوا، لیکن یہ روزہ باقی ہے، گیارہ مہینے ہم کو یہ روزہ رکھنا ہے، شریعت پر چلنا ہے، قرآن کو تھامنا ہے، صحیح عقائد کو اختیار کرنا ہے، عبادات میں اعتدال رکھنا ہے، اخلاق اور معاملات کو اچھے انداز میں برتنا ہے، اللہ نے صاف وعدہ کیا ہے کہ جو اللہ کی شریعت پر وعمل کریں گے انہیں کے لئے نجات ہے، اور جو اس سے منہ موڑیں گے وہ قرآن کی نگاہ میں فاسق، ظالم اور کافر ہے: ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الفاسقون (المائدة : ٤٧)

حضرات! اس موقع پر جب کم ہم رمضان کی برکتوں سے خوب مالا مال ہو چکے ہیں، ایک حدیث پیش کرنا چاہتا ہوں، جس میں ہماری زندگی کے بنیادی اصولوں کا تذکرہ آ گیا ہے:: سنن ترمذی میں ہے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کون ہے جو ان کلمات کو مجھ سے لے لے اور ان پر عمل کرے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں یا رسول اللہ اپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ باتیں بتائیں: اتق المحارم تكن أعبد الناس ،

حرام سے سے بچو لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار ہو جاؤ گے، وارض بما
قسم الله تكن أغنى الناس اللہ نے تمارے لئے جو مقرر کیا ہے، اس پر راضی رہو،
تم لوگوں میں سب سے غنی ہو جاؤ گے، وأحسن الى جارك تكن مؤمنا اپنے
پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو تم کامل درجے کے ایمان والے ہو جاؤ گے، و أحب
للناس ما تحب لنفسك تكن مسلما اور لوگوں کے لئے وہی پسند کرو، جو اپنے لئے
پسند کرتے ہو تم اچھے مسلمان ہو جاؤ گے، ولا تكثر الضحك ، فإن كثرة الضحك
تميت القلب، اور زیادہ ہنسنے سے بچو، اس لئے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

حضرات ! میں نے خطبہ میں قرآن کریم کی ایک آیات پڑھی تھی ، جس میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے : ما يلفظ من قول إلا لديه رقيب عتيد (انسان زبان سے کوئی بات نہیں نکالتا مگر اس کے لئے ایک نگراں تیار ہے) انسانی جسم میں دل کو جس طرح اہمیت ہے، اسی طرح زبان کو بھی بہت اہمیت ہے، زبان اللہ تعالی کی بڑی نعمت ہے، اسی زبان کی نعمت سے انسان تمام مخلوقات میں ممتاز ہے، انسان کتنا ہی قابل اور صلاحیت والا ہو، اگر زبان نہ ہو تو اس کی قابلیت اور صلاحیت کا علم کس کو ہوگا اور کون اس سے فائدہ اٹھائے گا، زبان ہی کے ذریعہ ماں باپ ، بیٹے ، بھائی ، دوست اور دوسرے افراد ایک دوسرے کو تسلی اور تسکین دیتے ہیں۔

حضرات ! زبان دیکھنے میں ایک چھوٹی چیز ہے، لیکن اس سے بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں، زبان سے صرف ایک جملہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ دل کے یقین کے ساتھ نکل جائے تو انسان مسلمان ہو جاتا ہے، اور اگر اس کے الٹا ہو یعنی کفر کا جملہ نکلے تو انسان کافر ہو جاتا ہے، زبان سے بڑے بڑے فتنے برپا ہوتے ہیں اور بڑے بڑے فتنے ختم ہوتے ہیں، زبان سے دشمن دوست بن جاتا ہے، اور دوست دشمن بن جاتا ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر حدیث کی اہم کتاب ترمذی میں ہے کہ

جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر صبح کو انسان کے تمام اعضاء زبان کے آگے عاجزی کرتے ہیں، کہتے ہیں، خدا کے لئے ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر، اگر تو سیدھی ہے تو ہم بھی سیدھے ہیں، اگر تو ٹیڑھی ہے تو ہم بھی ٹیڑھے رہیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ زبان کو صحیح طور پر ہم استعمال کریں اور اس کے غلط استعمال سے بچیں۔ ترمذی، کتاب البر والصلۃ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم دو چیزوں (زبان اور شرمگاہ) کی ضمانت لے لو، میں جنت کی ضمانت لیتا ہوں، ترمذی کی ایک دوسری روایت ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا: نجات کا راستہ کیا ہے: آپ ﷺ نے بہت جامع الفاظ میں فرمایا: (أمسك عليك لسانك ، و ليسعك بيتك ، وابك على خطيئة) ، زبان کو قابو میں رکھو، تمہارا تمہارے لئے کافی ہو اور اپنی غلطیوں پر روؤ (ترمذی کتاب الزھد)

حضرات ! زبان کے سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسان جب بھی بولے سوچ سمجھ کر بولے، بلا ضرورت نہ بولے، بولنے کی ضرورت ہو تو بولے، ورنہ خاموش رہے، خاموش رہنے میں انسان بہت سے فتنوں سے محفوظ رہتا ہے ، من صمت نجا۔ (جو خاموش رہا، وہ بچا رہا) ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ)

زبان کی نیکیوں میں اللہ کا ذکر ہے، اللہ کو یاد کرنا ہے، اور یہ زبان کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہے، اللہ تعالی نے ڈائیریکٹ قرآن کریم میں کسی کام کے کرنے بہت زیادہ کرنے کا حکم دیا ہے، ہاں ذکر ایسی چیز ہے، جس کے بارے میں آیا ہے کہ یٰأیھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا (اے ایمان والو! اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو)، مردوں کو بھی حکم دیا ہے، اور عورتوں کو حکم دیا (الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات)، اس یاد کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میں خود یاد کرتا ہوں، اور اس کے پاس ہوتا ہے: فاذكروني أذكركم (تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کرتا ہوں)

،ذکر دلوں کی غذاء ہے، ان کی صفائی اور پاکیزگی اور ان کو نرم کرنے کا ذریعہ ہے، ذکر کرنے والا زندہ ہے، اور ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے، ذکر کرنے والے پر فرشتے کرتے ہیں، اس پر رحمت اترتی ہے، اللہ تعالی ان پر فخر کرتا ہے، عذاب قبر سے محفوظ رہتے ہیں، نور کے منبروں پر ہوں گے، ذکر کے حلقے جنت کی کیاریاں ہیں، ذکر کرنے والے کو عرش کا سایہ نصیب ہوگا، ذکر کرنے والے عقلمند لوگ ہیں۔ ذکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دل کو چین اور قرار نصیب ہوتا ہے: ألا بذكر الله تطمئن القلوب

ذکر اصلا دل میں ضروری ہے، لیکن زبان سے بھی یاد کرنا ضروری ہے، حدیث مین آتا ہے کہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ إلا اللہ واللہ أکبر أفضل کلمہ ہیں، اسی طرح سبحان اللہ وبحمدہ ہے، اگر کوئی ان کو کہتا ہے تو اس کے گناہ اگر سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں تو بھی معاف ہوجاتے ہیں، لا إلہ الا اللہ تو افضل ذکر ہے، لاحول ولا قوۃ إلا باللہ، یہ جنت کے خزانوں میں سے ہے، اللہ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔

حضرات! زبان کی نیکیاں میں یہ ہے کہ ہمہ وقت اللہ کا نام لیا جاتا رہے، رسول اللہ ﷺ نے ہمہ وقت ہم کو اللہ کا نام لینے کی تلقین فرمائی ہے، جب بچہ پیدا ہو تو اللہ کا نام اذان اور اقامت کی کہی جائے، نماز کے لئے اذان میں گیارہ بار اللہ کا نام لیا جائے، اقامت میں اسی طرح انتقال کے وقت کلمہ کی تلقین کی جائے، جنازہ پڑھتے وقت اللہ کا نام لیا جائے، قبر میں رکھتے وقت اللہ کا نام لینا ہے، مٹی دیتے ہوئے اللہ کا نام لینا ہے، ہر کام شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام، کھانے کھانے سے پہلے اللہ کا نام، کھانا کھانے کے بعد اللہ کا نام لینا ہے، اچھی چیز کو دیکھیں تو ماشاء اللہ، آئندہ کوئی کام کرنا ہو تو إن شاء اللہ کہیں، غم کی خبر سنیں تو انا للہ وإنا إلیہ راجعون، کسی کا

شکریہ ادا کریں تو کہیں جزاک اللہ، سلام کریں تو کہیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ درود بھیجیں تو کہیں صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کا نام لیں تو رضی اللہ عنہ، بزرگ کا نام لیں تو کہیں رحمۃ اللہ علیہ، کسی مہمان کا استقبال کریں تو کہیں ماشاء اللہ، الحمد للہ، کسی کو رخصت کریں تو کہیں فی أمان اللہ، کوئی کھانے کی دعوت دے تو کہیں بارک اللہ، چھینک آئے تو کہیں الحمد للہ، یرحمک اللہ، یھدیک یہ اللہ کے نام کا تذکرہ ہے۔

حضرات! زبان کی نیکیوں میں قرآن کی تلاوت ہے، اس سے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے اور گناہ معاف ہوتے ہیں، اس لئے تلاوت کا معمول ہونا چاہئے، یہ زبان کی بنیادی نیکیوں میں ہے۔

زبان کی نیکیوں میں حمد وشکر کے کلمات ہیں، الحمد للہ کا کلمہ دہراتے رہیں، اللہ کے رسول اللہ ﷺ کوئی اچھا کام کرتے تو فرماتے الحمد لله الذى بنعمته تتم الصالحات، اور اگر کوئی ناگوار چیز دیکھتے تو فرماتے: الحمد لله على كل حال۔

زبان کی نیکیوں میں دعاء ومناجات بھی ہے، زبان کی نیکیوں میں توبہ و استغفار بھی ہے،، زبان کی نیکیوں میں درود وسلام بھی ہے، زبان کی نیکیوں میں سلام کرنا بھی ہے، زبان کی نیکیوں میں اچھی بات کی تلقین کرنا اور بری بات سے روکنا بھی ہے، زبان کی نیکیوں میں سچ بولنا بھی ہے کیونکہ سچائی نجات دیتی اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔

حضرات! جس طرح زبان کی نیکیاں ہیں، اسی طرح زبان کی خرابیاں بھی ہیں ، جھوٹ بولنا یہ بری خصلت ہے، صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان اور جھوٹ ایک ساتھ جمع نہیں سکتے ہیں، جھوٹ بولنا منافقوں کی علامت ہے، اور منافقین اپنے نفاق کی وجہ سے جہنم کے آخری درجے میں ہوں گے، جھوٹ بولنے سے انسان صرف اپنا نقصان نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے پورے معاشرہ کو بدبودار بنادیتا ہے۔

زبان کی خرابیوں میں غیبت ہے، غیبت کہتے ہیں کہ کسی کی پیچھے اس کو برائی

کرنا، یہ بہت سنگین بیماری ہے، قرآن مجید نے کہا ہے کیا تم میں سے کسی شخص یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرادر بھائی کا گوشت کھائے، تو تم کو اس سے گھن آتا ہے (الحجرات:۱۲)، غیبت کو زنا سے بھی زیادہ سخت کہا گیا کہ زنا میں انسان گناہ کرتا ہے، پھر توبہ کر لیتا ہے، اور اللہ تعالی اس کے گناہ معاف کر دیتے ہیں، لیکن غیبت میں جب تک صاحب معاملہ سے معافی نہیں مانگے گا معاف نہیں کیا جا سکتا، اگر کسی کی غیبت ہوگئی ہو تو حدیث کی کتاب میں اس کی معافی کی شکل یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالی سے مغفرت مانگے (اللهم اغفر لنا و له (بیہقی فی شعب الإیمان)

زبان کی خرابیوں میں تہمت لگانا، الزام لگانا، اور غلط بات کی نسبت اس کی طرف کرنا ہے، بہتان کہتے ہیں کہ کسی کے اندر کوئی خرابی نہ ہو اور اس کی طرف وہ خرابی منسوب کی جائے، اگر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو اس حد قذف ہے، اس میں سو کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں، قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے بارے میں ذکر کیا ہے: إن الذين يحبون أن تشيع الفاحشة في الذين آمنوا لهم عذاب أليم في الدنيا والآخرة (النور۱۹) (جو لوگ ایمان والوں میں بے حیائی پھیلاتے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے)

زبان کی خرابیوں میں چغل خوری ہے، یہ ایک خطرناک مرض ہے، لوگوں میں توڑ پیدا کرنے کے لئے غلط باتیں پہونچانا چغلی کہلاتا ہے، چغل خور کے بارے میں آیا ہے کہ وہ جنت میں کبھی داخل نہیں ہوگا (بخاری، کتاب الأدب) قرآن میں آیا ہے کہ اگر کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو (الحجرات:۶)

زبان کی خرابیوں میں برے ناموں سے پکارنا ہے قرآن میں ہے: ولا تنابزوا بالألقاب (اور نہ برے ناموں سے پکارو)

زبان کی خرابیوں میں گالی گلوج ہے، اور یہ شریعت میں سخت منع ہے، حدیث

میں آیا ہے: سباب المؤمن فسوق (مسلمان کو گالی دینا گناہ کی بات ہے۔

غرض یہ زبان کی چند نیکیاں اور خرابیاں ہیں، ضرورت ہے کہ ہم فکر کریں کہ لفظ لفظ تولیں اور حرف حرف بولیں اور اس میں کسی جھجھک اور تردد کا اظہار نہ کریں، اللہ تعالی ہمیں دلوں کے امراض اور زبان کی خرابیوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔

حضرات! آج کا دن تین نمایاں خصوصیات ہیں: شکر کا دن ہے، (۲) اللہ کی بڑائی اور عظمت کے اظہار کا دن ہے (۳) اتحاد و اتفاق کا دن ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شکر کا دن ہے، ہم مہینے بھر روزے رکھے تو اللہ تعالی نے اس کے صلہ میں یہ دن ہم کو عطا فرمایا، قرآن کے سلسلہ میں قرآن کہتا ہے: لئن شکرتم لأزیدنکم ولئن کفرتم إن عذابي لشدید (اگر تم شکر کروگے تو میں تم کو خوب عطا کروں گا، اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بہت سخت ہے) شکر یہ دل کی عبادت ہے، بس دل کو اللہ تعالی کی طرف متوجہ کیجئے اور اللہ کے عذاب سے محفوظ رہئے، ما یفعل اللہ بعذابکم إن شکرتم وآمنتم وکان اللہ شاکرا علیما (اللہ تم کو کیوں سزا دے گا اگر تم شکر ادا کروگے اور ایمان لاؤگے اور اللہ شکر قبول کرنے والے اور جاننے والے ہیں)

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ اللہ کی بڑائی کے اظہار کا دن ہے، یہی ہے کہ جو تکبیر ہم کو دی گئی ہے، اس میں اللہ نے ہم اللہ کی بڑائی کے بیان کرنے کا سلیقہ سکھایا ہے، الله أكبر الله أكبر لا إله إلا الله، والله أكبر، الله أكبر ولله الحمد، بڑائی اللہ کی صفت ہے، جو شخص بھی بڑائی کا احساس پیدا کرے گا، اللہ اس کو ذلیل وخوار کردے گا۔ وله الكبرياء في السماوات والأرض وهو العزيز الحكيم

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ اتحاد و اتفاق کا دن ہے، عید کی نماز بڑی جگہ پر پڑھنے کا حکم ہے، اور اس میں یہی حکمت و مصلحت ہے کہ ہمارے دل ملیں، ایک دوسرے گلے ملیں، اور ایک جسم کا نمونہ پیش کریں، اور ایک عمارت کی مثال پیش کریں۔ اللہ تعالی

عیدالفطر کی ان خصوصیات کو اپنے اندر منتقل کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔

آیئے! عید کی نماز کا طریقہ سن لیجئے۔

عیدالفطر کی نماز واجب ہے، اور یہ دو رکعت ہوتی ہے، اس میں چھ زائد تکبیرات ہوتی ہیں، دل میں نیت کیجئے کہ ہم عیدالفطر کی نماز پڑھنے جارہے ہیں، پہلی رکعت میں تین تکبیریں ہیں، اور دوسری رکعت میں تین تکبیریں ہیں، پہلی رکعت کی تکبیریں اس طرح ہیں:

سب سے پہلے 'اللّٰہ أکبر' کہتے ہوئے ہاتھ باندھنا ہے اور 'ثنا' پڑھنا ہے، دوسری بار جب 'اللّٰہ أکبر' کہا جائے گا تو ہاتھ اٹھا کر چھوڑنا ہے، تیسری بار جب 'اللّٰہ أکبر' کہا جائے تو ہاتھ اٹھا کر چھوڑنا ہے، چوتھی بار جب 'اللّٰہ أکبر' کہا جائے گا تو ہاتھ اٹھا کر باندھنا ہے، اس کے بعد 'سورۂ فاتحہ' پڑھی جائے گی اور 'سورت' پڑھی جائے گی اور رکوع اور سجدے ہوں گے، دوسری رکعت کے لئے جب کھڑے ہوں گے تو 'سورہ فاتحہ' اور 'قرأت' ہوگی، اس کے بعد رکوع سے پہلے تین تکبیریں کہی جائیں گی، ان تینوں میں ہاتھ اٹھا کر چھوڑنا ہے اور چوتھی تکبیر میں رکوع کرنا ہے، پھر نماز مکمل کی جائے گی۔ دعاء کے بعد خطبہ ہوگا، یہ خطبہ بھی نماز کا حصہ ہے، اس کو غور سے سننا چاہئے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین

رمضان کے بعد کیا کریں؟

الحمد للّٰه ربّ العلمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين أما بعد: فقد قال اللّٰه تعالىٰ: "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ.

(سورة الأنفال: ٢٩)

(اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے دے گا، اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا، اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ فضل والا ہے)

حضرات! رمضان کا مہینہ گزر گیا، اس کے گزرنے سے دو قسم کی کیفیتیں لوگوں پر طاری ہوئیں: ایک مایوسانہ، جیسے کوئی عزیز مہمان رخصت ہو جائے، اور بہت دنوں میں اس کے آنے کی امید ہو، اور بہت سے لوگوں پر ایک اطمینانی کیفیت طاری ہوئی، جیسے ان کا کام ختم ہو گیا، اور اب ان پر کوئی ذمہ داری نہیں، یہ دونوں کیفیتیں اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا اور رمضان کی روح کے منافی ہیں، رمضان اگرچہ رخصت ہو گیا، لیکن اس کے تقاضے، شریعت اور اس کے احکام، اللہ تعالیٰ اور اس سے تعلق بہر حال باقی ہے۔

حضرات! رمضان ایک دور کا خاتمہ نہیں، بلکہ ایک دور کا آغاز ہے، رمضان انتہا نہیں، ابتدا ہے، رمضان سب کچھ لے کر نہیں جاتا، بلکہ کچھ دے کر اور جھولیاں بھر کر جاتا ہے، رمضان کے بعد انسان گناہوں سے ہلکا ضرور ہوتا ہے، لیکن ذمہ داریوں سے بوجھل اور گرانبار ہو جاتا ہے، اِس کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ رمضان کیا ہے؟ اب کیا کریں؟

تو سب سے مقدم اور اہم کام ہے کہ رمضان میں اللہ تعالی سے تعلق قائم ہو گیا تو

اس تعلق کو باقی رکھا جائے، رابطہ کو استوار رکھا جائے، اور اُس کی آسان شکل توبہ ہے، توبہ کی قرآن میں جابجا تاکید آئی ہے، سورۂ نور میں ہے: ’’اے ایمان والو! اللہ کی طرف رجوع اور توبہ کرو، تاکہ کامیاب ہو، سورۂ توبہ میں ایمان والوں کی بڑی بڑی صفات کا تذکرہ آیا ہے، لیکن سب سے پہلے توبہ ہی کا ذکر ہے: ’’التَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ، الْآمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ.‘‘ (التوبة: ١١٢) (وہ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، حمد کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، رکوع کرنے والے ہیں، سجدہ کرنے والے ہیں، بھلائی کا حکم دینے والے ہیں، اور برائی سے روکنے والے ہیں، اور اللہ کے حدود کا خیال رکھنے والے ہیں، اور (آپ) مومنین کو خوشخبری سنا دیجئے)

توبہ کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ گناہ ہوجائے تو توبہ کریں گے، توبہ کوئی ضرورت اور مجبوری والی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ مستقل عبادت، قربت اور محبوبیت کا ذریعہ ہے، یہ بزرگوں کی بھی ضرورت ہے اور چھوٹے افراد کی بھی ضرورت ہے، دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دن میں سو سو بار یا ستر ستر بار استغفار کرتے تھے، حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں سب سے بڑا خوش نصیب وہ ہوگا جو حشر کے دن اپنے نامۂ اعمال میں استغفار کی کثرت پائے گا۔

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ایمان کو تازہ کیا جائے، اس کو غذا پہونچائی جائے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان ایک مرتبہ لے آنا کافی ہے، جب کہ ایسا نہیں، ایمان کی تجدید کی ضرورت ہے، حدیث میں آتا ہے کہ ایمان اسی طرح پرانا ہوجاتا ہے جیسے کپڑا میلا اور پرانا ہوجاتا ہے، اس کو نیا اور اجلا کرتے رہو، صحابہؓ نے عرض کیا: کیسے اس کو نیا کرتے رہیں؟ فرمایا: لا إله إلا الله کی کثرت کرو، خود قرآن میں آیا ہے کہ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ، وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ، (الحدید:١٦)

(کیا وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد سے، اور جو اترا ہے سچا دین) اس آیت کے پڑھنے اور سننے سے بعض صحابہؓ اپنے دل کی سختی اور اور بے حسی سے مایوس ہوتے، اسی لئے اللہ تعالی نے اس کے بعد ذکر فرمایا کہ یاد رکھو کہ اللہ تعالی زمین کے مردہ ہوجانے کے بعد زندہ کردیتا ہے، ہم نے تمہارے لئے اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کیں، تاکہ تم سمجھو، اور دوسری آیت میں ہے: ’’يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا‘‘، یہاں بھی ایمان کی تجدید اور تکمیل ہے۔

حضرات! ایمان کی تجدید کی صورتیں ہیں: (۱) سوچ سمجھ کر، شعور واحساس کے ساتھ کلمہ طیبہ کو پڑھا جائے اور بار بار پڑھا جائے (۲) ذکر کی کثرت، اور ذکر کی قوت کا اہتمام کیا جائے، قوت کا مطلب یہ ہے کہ خاص کیفیات، توجہ اور استحضار کے ساتھ اللہ کو یاد کیا جائے، ان کیفیات کے ساتھ تھوڑا یاد کرنا بھی تھوڑا نہیں ہے، اور بڑے اثرات رکھتا ہے، لیکن اس کے لئے محنت، مجاہدہ اور انابت کی ضرورت ہوتی ہے (۳) ایمان کی تجدید کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے، اے ایمان والو: اللہ کا لحاظ کرو، اور اس سے ڈرو، اور صادقین کے ساتھ رہو، ۴: چوتھی چیز اعمال کی کثرت اور اس پر مداومت ہے، اس سے بھی ایمان میں جلا، قوت اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔

حضرات! رمضان کے بعد اور ہمیشہ کرنے والے کاموں میں شریعت کی پابندی اور فرائض واحکام کی بجا آوری ہو، جس کی مشق رمضان میں کرائی جاتی ہے، لعلکم تتقون، سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب رمضان میں حلال چیزیں ایک خاص وقت کے لئے منع ہیں تو غیر رمضان میں حرام چیزیں کیسے جائز ہوسکتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ مومن کے دو روزے ہیں: ایک عارضی اور دوسرے دائمی، عارضی روزہ رمضان کے ایک مہینہ کا ہے، اور دائمی روزہ پوری زندگی کا ہے، یہ بلوغت سے شروع ہوتا ہے اور موت تک رہتا ہے: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ.

رمضان کا ایک خاص تحفہ اور عطیہ قرآن مجید ہے، رمضان تو سال بھر کے لئے رخصت ہوگیا، مگر اپنا پیام، اپنا تحفہ، اور اپنی سوغات چھوڑ گیا، ضرورت ہے رمضان گذر جانے کے بعد اس تحفہ سے اس کی یاد تازہ کی جائے، بہت سے لوگ رمضان میں تو بڑی مستعدی سے قرآن پڑھتے ہیں، لیکن رمضان ختم ہوتے ہی اس کو لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

رمضان غم خواری کا مہینہ تھا، اس کے جانے کے بعد بھی غم خواری کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے، اگر اللہ نے گنجائش دی ہے تو ان بھائیوں کی خبر گیری کرنا چاہیے جو ہماری امداد واعانت کے محتاج ہیں، خاص طور سے ان لوگوں کی جو اللہ کے راستے میں ہیں، زمین میں چلتے پھرتے ہیں، ان کے کپڑوں اور لباس کو دیکھ کر جاہل یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑے اچھے ہیں (البقرۃ:۲۷۳)

غرض رمضان بے شمار برکتوں کا مہینہ تھا، اس کی خصوصیات ہمارے اندر منتقل ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهُ، اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ، وَاُولٰئِكَ هُمْ اُولُو الْاَلْبَابِ." (الزمر: ۱۹:۱۷) (سو آپ بشارت دے دیجئے میرے انہی بندوں کو جو (اس) کلام کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں، یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے، اور یہی ہیں جو اہلِ عقل ہیں)

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

حج بیت اللہ

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا، وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ." (آل عمران:۹۷)

(اللہ کے واسطہ لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا فرض ہے، مگر سب کے ذمہ نہیں، بلکہ خاص خاص لوگوں کے یعنی اس شخص کے جو طاقت رکھے وہاں تک پہونچنے کی، اور جو شخص احکام خداوندی کا منکر ہو تو خدا کو کیا ضرر، اللہ تمام جہاں والوں سے غنی ہے)

حضرات! اسلام توحید خالص کا دین ہے، وہ اللہ اور بندے کے درمیان وساطت اور ایجنسی کا قائل نہیں، وہ کسی مادی اور محسوس چیز کا قائل نہیں، جس کو انسان اپنے ذہن میں بسا کر معبود کی طرح پوجے اور ساری توجہ اسی کی طرف مرکوز کردے، اس میں نہ واسطوں کی گنجائش ہے، نہ مظاہر کی، نہ تصویروں کی، نہ بتوں کی، اسی کا اعلان ہے: "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ، اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ." (البقرة: ۱۸۶) (اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے، پس لوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ ہدایت یاب ہوجائیں) لیکن فطرت انسانی چونکہ فطرت انسانی ہے، وہ برابر ایسی چیز کی تلاش میں رہتی ہے، جس کو اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ سکے، اور اس کے ذریعہ اپنے جذبۂ شوق کو تسکین دے سکے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ ظاہری اور محسوس چیزیں رکھی ہیں جو اس کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں، اور جن پر ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی تجلی برستی

رہتی ہے، اوران کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے، ان کو شعائر اللہ کہا جاتا ہے، شعائر اللہ میں نماز بھی ہے، قرآن بھی، محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات بھی ہے اور خانہ کعبہ بھی اور کہہ دیا گیا کہ جو شعائر کی تعظیم کرے گا تو وہ اللہ کا متقی بندہ شمار ہوگا اور یہ اس کے لئے بہتر ہوگا۔

حضرات! خانہ کعبہ اور اس کے قرب وجوار میں موجود اللہ کی نشانیوں کی زیارت کے لئے حج کو مشروع کیا گیا ہے، حج اسلام کے بنیادی ارکان میں ہے، اور یہ جانی اور مالی دونوں ہے، نماز جانی عبادت ہے، روزہ جانی عبادت ہے، زکاۃ مالی عبادت ہے، لیکن حج جانی اور مالی دونوں عبادت ہے، حج زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے، اس کے شرائط ہیں:

۱۔ جس مرد وعورت کو اللہ تعالی نے اتنی وسعت دی ہو کہ اس کے ذریعہ اپنے گھر سے مکہ مکرمہ آمد ورفت پر قادر ہو۔

۲۔ بیوی بچے اور جن حضرات کے نفقہ کی ذمہ داری شرعا اس کے ذمہ عائد ہوئی ہے، حج بیت اللہ سے واپسی تک ان کے نفقہ دینے پر قادر ہو۔

۳۔ بذات خود تندرست اور سفر کے لائق ہو۔

۴۔ عورت ہو تو اس کے ساتھ اس کا محرم بھی ہو۔

سنن ابو داود میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو آدمی حج کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ حج کرنے میں جلدی کرے۔

ترمذی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس حج کا سامان ہو، اور اس کو ایسی سواری بھی میسر ہو جو بیت اللہ تک اس کو پہونچا سکے، پھر بھی حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔

حضرات! اسلام میں عبادات کا ایک تسلسل ہے، الگ الگ نوع اور الگ الگ تاثیر رکھنے والی عبادتیں ہیں، قرآن کریم میں تمام عبادات کے منافع اور مصالح کا تذکرہ کیا گیا ہے، نماز کے بارے میں آیا ہے: "اِنَّ الصَّلَاۃَ تَنۡهَی عَنِ الۡفَحۡشَاءِ وَالۡمُنۡکَرِ." (العنکبوت:۴۵) (بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے) روزہ کے

بارے میں آیا ہے: "یٰاَیُّهَا الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ." (البقرۃ:۱۸۳) (اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے، تاکہ تم متقی بن جاؤ) زکاۃ کے بارے میں آیا ہے: "خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَکِّیۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَیۡهِمۡ." (التوبۃ:۱۰۳) (آپ ان کے مالوں سے صدقہ لے لیجئے، اس کے ذریعہ آپ انہیں پاک صاف کردیں گے، اور آپ ان کے لئے دعا کیجئے) لیکن حج کے بارے میں کسی ایک فائدہ کا ذکر نہیں، بلکہ وہ مجموعہ فوائد ہے: لِیَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ یعنی حج کے فوائد، برکات، آثار وثمرات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو انفرادی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا، بس وہاں جا کر ان کو محسوس کیا جا سکتا ہے، لیکن زبان نبوت نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے: "مَنۡ حَجَّ فَلَمۡ یَرۡفُثۡ وَلَمۡ یَفۡسُقۡ رَجَعَ کَیَوۡمٍ وَلَدَتۡهُ اُمُّهُ." (صحیح بخاری بروایت ابو ہریرۃ) (جس نے حج کیا اور کوئی گندی بات اور گناہ کا کام نہیں کیا تو وہ اس طرح لوٹتا ہے جیسے اس کو اس کی ماں نے اسی دن جنا ہو) اور فرمایا: اَلۡحَجُّ الۡمَبۡرُوۡرُ لَیۡسَ لَهُ جَزَاءٌ اِلَّا الۡجَنَّةَ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) (مقبول حج کا بدلہ جنت ہے)۔

حضرات! ہر انسان میں فطری طور پر دو جذبے ہیں: خوف اور شوق، نماز اور روزہ اور زکاۃ یہ خوف کے عناصر پر مشتمل ہیں، لیکن حج کی شان نرالی ہے، اس میں شوق بھی ہے، والہانہ کیفیت بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ حج کی نیت کرتے ہی حاجی اپنے عام لباس سے آزاد ہو جاتا ہے، اور دو چادروں میں ملبوس ہو کر اپنے شوق و وارفتگی کا اظہار کرتا ہے، حاجی حکم کا بندہ اور چشم وابرو کا غلام ہے، وہ کبھی منی میں ہوتا ہے تو کبھی عرفات میں، کبھی سعی کرتا ہے تو کبھی طواف، کبھی مزدلفہ میں ہوتا ہے تو کبھی غلاف کعبہ پکڑ کر روتا، بلکتا، سسکتا نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا حج افضل ہے؟ فرمایا: اَلۡحَجُّ الۡعَجُّ الثَّجُّ (سنن ترمذی، کتاب الحج:۸۳۵) (وہ حج جس میں نعرۂ مستانہ لگانا (تلبیہ پڑھنا) اور قربانی کرنا ہو) اور پوچھا گیا کہ کون سا حاجی معتبر ہے؟ فرمایا: اَلشَّعِثُ التَّفِلُ (ابن ماجہ، کتاب المناسک، ۳۰۰۸) (پراگندہ حال، پراگندہ بال)۔

حضرات ! حج کی عبادت حضرت ابراھیم علیہ السلام کی قربانیوں کی یادگار ہے ، انہوں نے تین عظیم قربانیاں دیں: (۱) حالات مخالف تھے، بادِ صرصر چل رہی تھی، فضا مسموم تھی، آگ کا الاؤ روشن تھا، اس میں ان کو ڈالا جاتا ہے، لیکن وہ توحید پر ثابت قدم رہتے ہیں، (۲) دوسرے یہ کہ اللہ کے حکم سے اپنے بچے اور اہلیہ کو بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ دیتے ہیں (۳) انہوں نے اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو راہ خدا میں قربان کرنے کے لئے لٹا دیا، یہی قربانیاں ان کی پیشوائی کا ذریعہ بنی۔

حضرات ! حج کی عبادت بہت مہتم بالشان ہے ، اس میں جہاں ایک طرف ضروری سامان لینا ہوتا ہے، وہیں دوسری طرف تقوی اور خوف خدا سے آراستہ ہونا ضروری ہے، معجم کبیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی نوجوان حج کے زمانہ میں ملتا تو فرماتے : زَوّدَكَ اللّٰهُ التَقوى، وغَفَرَ ذَنبَكَ ويسَّر لك الخَيرَ حيثما كنتَ (سنن الترمذی) (اللہ تعالی تم کو تقوی کا زادراہ دے، اور تمہارے گناہ بخش دے، اور جہاں جاؤ تمہارے لئے بھلائی مقدر کرے) اسی کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے، بغیر اخلاص کے حج پر جانا بے سود ہے، کنز العمال میں ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ مالدار تفریح کے لئے حج کریں گے، درمیانی طبقہ کے لوگ تجارت کے لئے ، قراء ریاکاری کے لئے ، فقراء مانگنے کے لئے حج کریں گے (عجلونی، کشف الخفاء ومزیل الالباس)، اسی کے ساتھ کوئی مشکوک اور حرام مال اس سفر کے انتظامات میں شامل نہ ہو، ورنہ جانا اور آنا بیکار رہے۔

حضرات ! جن لوگوں کو حج کی سعادت نہیں ملی ، وہ حج کے لئے دعاؤں کا اہتمام کریں، مزید یہ محترم مہینہ ہے، اس میں اعمال کے اجر وثواب میں اضافہ کیا جاتا ہے، اور عشرہ ذی الحجہ تو خاص اہمیت وفضیلت کے حامل ہیں ان کو اہتمام سے گذاریں، اللہ تعالی بے شمار برکتیں نازل فرمائیں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين ، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "جَعَلَ اللّٰهُ الكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِلنَّاسِ، وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْىَ وَالْقَلَائِدَ، ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْئٍ عَلِيْمٌ." (المائدة :۹۷) (اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے، نیز حرمت والے مہینے کو اور حرم میں قربانی کو اور گلے میں پڑے ہوئے جانوروں کو، یہ اس لئے کہ تم یقین کرلو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ اس سب کا علم رکھتا ہے اور بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

حضرات ! ذی الحجہ کے مہینہ میں اسلام کا اہم رکن حج ادا کیا جاتا ہے، حجاج کا گروہ وہ مبارک اور نیک گروہ ہے، جس کے بارے میں سنن نسائی اور ابن ماجہ میں ہے، حضرت ابوھریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حج اور عمرہ کرنے والے اللہ کے مہمان ہیں، اگر وہ اللہ سے دعا کریں تو اللہ ان کی دعا قبول کرتا ہے، اور اگر وہ بخشش مانگیں تو انہیں بخش دیتا ہے، مسند احمد میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب حاجی سے ملو تو اس کو سلام کرو، اور مصافحہ کرو، اور درخوست کرو کہ وہ استغفار کرے، قبل اس کے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو، کیونکہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

حضرات ! ایک سوال یہ ہے کہ حج کو دین اسلام میں کیوں فرض کیا گیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں دو باتیں اہم ہیں: ایک تو یہ کہ ملت ابراہیمی سے اس امت کا تعلق باقی رہے، ادیان وملل کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی دین کا تعلق اپنے بانی اوّل اور داعی اول سے

ٹوٹ گیا تو اس کی روح نکل گئی، حج کا ایک مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ دین تحریف سے محفوظ رہے کہ زندگی میں کوئی ایسا موقع آئے کہ مسلمان دیکھ لیں کہ پوری دنیا کے مسلمان کس طرح نماز پڑھتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو ملک ملک میں الگ الگ نمازیں شروع ہو جائیں گی، اور دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔

غرض حج کی نسبت خانہ کعبہ کی طرف ہے، اور خانہ کعبہ ایسا عظیم گھر ہے، جو دنیا کے بالکل بیچ میں ہے، اور اسی سے نظام عالم مربوط ہے، کیونکہ وہاں سے جو پیغام جاری ہے اسی پر دنیا قائم ہے، خانہ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ اور اللہ کی تجلیات کا مظہر ہے، قرآن کریم میں کہیں اسے البیت العتیق (قدیم اور غیر مقبوضہ گھر) اور کہیں البیت الحرام (محترم گھر) کہا گیا ہے، یہ زمین سے پندرہ میٹر اونچا ہے، اس کے چار کونے ہیں: رکن حجر اسود، رکن عراقی، رکن شامی اور رکن یمانی، یہ پہلا گھر ہے جو روئے زمین پر تعمیر کیا گیا، علامہ اقبال نے صحیح کہا ہے:

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

حضرات! روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر خانہ کعبہ کو تعمیر کیا، اور اس کے چالیس سال کے بعد مسجد اقصی کو فلسطین کی سرزمین پر تعمیر کیا، تاریخی لحاظ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچی ہوئی ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کی، ان کے بعد عمالقہ نے کی، پھر قبیلہ جرہم نے اور پھر قریش نے کی، قریش نے نبوت سے پانچ سال پہلے جب خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو ابراہیمی انداز میں اس کی دیواروں کو اٹھایا، ان کے پاس حلال مال کم تھا، اس لئے وہ تین طرف ہی دیواریں اٹھا سکے، اور چوتھی سمت کی دیوار نہیں اٹھا سکے، دوسری اہم تبدیلی یہ کی کہ زمین سے خانہ کعبہ کی سطح کو ۱۵؍میٹر اونچا کر دیا، تاکہ ہر کس و ناکس اس میں داخل نہ ہو،

وہ جس کو اجازت دیں وہ داخل ہو، اور جس کو اجازت نہ دیں داخل نہ ہو، فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز پر مکمل کی جائے، لیکن چونکہ نئے نئے افراد اسلام میں داخل ہوئے تھے اس لئے اس کو منہدم کر کے تعمیر کرنے میں ان کے اسلام سے بدگمان ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے ایسا نہیں کیا۔

۶۴ھ میں یزید نے حصین بن نمیر کی قیادت میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے جنگ کے لئے مکہ فوج بھیجی، اس فوج نے بہت توڑ پھوڑ کی، جس سے کعبہ کی دیواریں متاثر ہوئیں، یزید کے انتقال کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی منشأ کے مطابق اسے تعمیر کرایا، لیکن جب ۷۴ھ میں جب حجاج بن یوسف حاکم ہوا تو اس نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کی ہیئت و شکل کے مطابق کر دیا، اس طرح یہ خانۂ خدا متعدد حکمرانوں کے زمانوں میں بدلتا رہا، ہارون رشید کو جب معلوم ہوا کہ حجاج نے خانۂ کعبہ میں تصرف کیا ہے تو اس کو بدلنے کا ارادہ کیا، اس موقع پر امام مالکؒ نے فرمایا: امیر المؤمنین! میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ خانہ کعبہ کو ویسے ہی رہنے دیا جائے، اور بادشاہوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنایا جائے، جس کے نتیجہ میں اس کی عظمت ختم ہو جائے۔

جہاں تک غلاف کعبہ کی بات ہے تو سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ پر غلاف چڑھایا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حمیری بادشاہ تبع جو یمن کا تھا اس نے غلاف چڑھایا، پھر قریش نے یہ سلسلہ شروع کیا، اور آج بھی مصنع كسوة الكعبة (غلاف کعبہ کمپنی) موجود ہے، جہاں غلاف کعبہ تیار ہوتا ہے، اور عرفہ کے روز خانہ کعبہ پر چڑھایا جاتا ہے۔

حضرات! خانہ کعبہ ہر لحاظ سے قابل تعظیم ہے، ابن ماجہ میں نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا تَزَالُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ بِخَيْرٍ مَا عَظَّمُوا حَقَّ تَعْظِيمِهَا، فَإِذَا ضَيَّعُوا ذٰلِكَ هَلَكُوا (جب تک لوگ خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے رہیں گے بھلائی میں

رہیں گے، جب وہ اس کو چھوڑ دیں گے ہلاک ہوجائیں گے) خانہ کعبہ کے سلسلہ میں دونوں قسم کے احترام مطلوب ہیں: ظاہری بھی اور باطنی بھی، ظاھری احترام یہ ہے کہ اس کا نام بے ادبی کے ساتھ نہ لیا جائے، اور وہاں پہونچ کر اس کے آداب کا لحاظ رکھا جائے، اور ہر جگہ سے اس کی حفاظت کی کوشش اور تدبیر کی جائے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

باطنی احترام یہ ہے کہ اس کے پیغام توحید کو عام کیا جائے، یہ پیغام "وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَعْبُدَ الْاَصْنَامَ." (ابراہیم:۳۵) سے نکلا ہے، شرک سے اجتناب اور توحید پر استقامت۔ دوسرا پیغام یہ ہے کہ اقامت صلاۃ: "رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ." (إبراهيم : ٣٦) (یہ اس لئے اے ہمارے پروردگار! کہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں، سو تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے، اور انھیں کھانے کو پھل دے، جس سے یہ شکر گذار رہیں)

یہ پیغام جس قدر عام ہوگا، اسی کے اعتبار سے دنیا کی بقاء اور دوام کا فیصلہ ہوگا، اور جس دن یہ پیغام ختم ہوگا، تو قیامت کے آنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ." (اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے، نیز حرمت والے مہینے کو اور حرم میں قربانی کو اور گلے میں پڑے ہوئے جانوروں کو)

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

مسجدِ اقصیٰ کی پکار

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "سُبْحَانَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلاً مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى الَّذِيْ بَارَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ آيَاتِنَا، اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ." (الإسراء: ١)

حضرات! مسجد اقصی دنیا کی اہم ترین مساجد میں سے ایک ہے، مسلمانوں کے نزدیک تقدس واحترام کے لائق، اور ان کا قبلۂ اول ہے، وہ القدس نامی شہر میں واقع ہے۔ قرآن کریم میں مسجد اقصی کا ذکر ہے، سورۂ اسراء کی آیت اس پر گواہ ہے، اور وہ ان تین مساجد میں سے ایک ہے، جہاں کے لئے سفر کئے جانے کا حکم ہے: "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: المَسْجِدُ الْحَرَامُ، والمَسْجِدُ الْأَقْصَى وَمَسْجِدِيْ هٰذَا (بخاری و مسلم)" (تین مسجدوں ہی کے لئے سفر کیا جائے گا: مسجد حرام، مسجد اقصی اور میری یہ مسجد (مسجد نبوی)

مسجد اقصیٰ کے متعدد نام ہیں: مسجد اقصی، البیت المقدس، اور بیت المَقْدِس، مسجد اقصی کو مسجد اقصی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے درمیان اور خانہ کعبہ کے درمیان خاصی مسافت ہے، البیت المقدس، مبارک اور پاکیزہ گھر کے معنی میں لیا گیا ہے، اور بیت المقدس یہ نام شروع ہی سے متعارف ہے، احادیث میں یہ نام آیا ہے۔

مسجد اقصی سے مراد صرف ایک مسجد نہیں، بلکہ پورے وہ حدود ہیں، جن میں میدان بھی ہے، بلکہ ایک لاکھ چوالیس ہزار مربع میٹر حدود کو مسجد اقصی کہا جاتا ہے۔

حضرات! مسجد اقصی کی تعمیر کس نے کی؟ احادیث میں آیا ہے کہ حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے پہلے خانہ کعبہ تعمیر کی، اُس کے چالیس سال بعد مسجد

اقصیٰ تعمیر کی، حضرت آدمؑ کے بعد اس علاقہ کے آثار کا پتہ نہیں چلتا ہے، حضرات ابراہیم علیہ السلام بھی عراق سے ہجرت کر کے یہاں آئے، اور انہوں نے شہر قدس کی تعمیر کی، اس کے بعد حضرت اسحٰق اور یعقوب علیہ السلام نے اس کو آباد کیا، تاریخی حوالوں سے اتنی بات معلوم ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت سے پہلے تقریباً تین ہزار سال پہلے یبوسیوں کا ایک قبیلہ آباد ہوا، یبوسیوں کے بعد فراعنۂ مصر آئے، اس کے بعد عمالقہ آئے، پھر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو فتح کیا، ان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے نظام حکومت سنبھالا، حضرت آدمؑ کی بنائی ہوئی مسجد کی از سر نو تعمیر کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی تو تین دعائیں کی: اے اللہ! مجھے فیصلہ کی طاقت عطا فرما، اے اللہ! مجھے غیر معمولی لمبی حکومت عطا فرما، اور اے اللہ! اس مسجد کو ایسا بنا کہ یہاں کوئی آئے اور نماز پڑھے تو اس کے گناہ معاف ہو جائیں، اور وہ ایسا ہو جائے جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ان کی تینوں دعائیں قبول فرمائیں۔

حضرت سلیمانؑ کی حکومت ۸۰/سال رہی، اس کے بعد بنی اسرائیل کی حکومت ختم ہوگئی، ان کی وفات کے بعد بابل کے رہنے والے بخت نصر کا غلبہ ہوا، اس نے یہودیوں کو ان کی حکم عدولی کی وجہ سے سزائیں دیں، اور بڑی تعداد کو قتل کیا اور ایک تعداد کو قید، پھر پرانے بادشاہ نے ان کو مخصوص شرائط کے ساتھ آنے کی اجازت دی، پھر ان کو اقتدار حاصل ہوا، پھر حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے ستر سال بعد ٹائٹس نامی بادشاہ نے ان کو بے دخل کیا، اور اس سرزمین پر عیسائیوں کا غلبہ رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری دور میں شام کے علاقہ کی طرف حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا، اسی درمیان آپ ﷺ کا حادثۂ وفات پیش آ گیا، حضرت ابوبکرؓ نے اس کو روانہ کیا، لیکن جب عمر فاروقؓ کا دور آیا تو انہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں شام کی طرف فوج روانہ کی، اور اس فوج نے وہاں کا محاصرہ کیا، محاصرہ سے تنگ آکر وہاں قابض

عیسائیوں نے کہا کہ اپنے خلیفہ اور امیر کو بلائیے تو ہم ان کو چابی دیں گے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے وہاں کا سفر کیا، اور فاتحانہ انداز میں گئے، اور مسجد اقصیٰ کو عیسائیوں کے اثر و رسوخ سے آزاد کرایا، ۱۶ھ میں یہ واقعہ پیش آیا، یہ مسجد خلافت امیہ اور عباسیہ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہی، اسی درمیان صلیبی جنگیں ہوئیں، اس کے نتیجہ میں عیسائیوں نے ۹۰/سال تک اپنے دست رس میں رکھا، پھر اللہ نے صلاح الدین ایوبی کو بھیجا، انہوں نے شام کی تمام مسلم حکومتوں کو متحد کیا، اور حطین کے میدان میں صلیبیوں کو شکست دے کر بیت المقدس کو آزاد کرایا، اور وہ ۷/جون ۱۹۶۷ء تک مسلمانوں کے پاس رہی، اور عرب و اسرائیل جنگ میں بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا، جو اب تک برقرار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ان کے اعمال بد کی وجہ سے دو مرتبہ پٹوایا، اور یہ وارننگ دے دی کہ اگر دوبارہ ایسا کریں گے تو اس سے دوچار کئے جائیں گے: وإن عُدتُم عُدنَا، صحیح مسلم میں ہے کہ آخری زمانے میں مسلمانوں اور یہودیوں کی جنگ ہوگی، جس میں مسلمانوں کو فتح ہوگی، یہاں تک کہ درخت پکار پکار کر کہیں گے اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہودی میرے پیچھے چھپا ہے، اس کو مارو، سوائے غرقد کے پیڑ کے، کیونکہ یہ یہودیوں کے درخت میں سے ہے۔

ہم مسلمانوں کے لئے ان واقعات میں عبرت و نصیحت کے بے شمار پہلو ہیں، اگر ہم نے یہودیوں کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے دوچار کریں گے: "وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ، ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (سورۃ محمد: ۳۸) (اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے)

حضرات! فلسطین کی زمین محشر کا میدان بنے گی، حدیث میں آیا ہے کہ اگر وہاں پہنچ سکتے ہو تو پہنچو، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہاں کے لئے اسباب و وسائل زیست کا انتظام کرو، اللہ تعالیٰ مسجد اقصیٰ کو دشمنوں کے چنگل سے آزادی نصیب فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصّلاۃ والسّلام علی سیّد الأنبیاء وإمام المرسلین محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد: فقد قال اللّٰہ تعالیٰ : "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ، هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ." (الفجر: ۱–۵) (قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی (ذی الحجہ کی پہلی دس راتوں کی) اور جفت کی اور طاق کی (ذی الحجہ کی دسویں اور نویں کی)، اور رات کی جب وہ جانے لگے، یقیناً اس میں قسم ہے ہر صاحب فہم کے لئے)

حضرات! اللہ تعالیٰ نے سابقہ امتوں کی عمریں لمبی رکھی تھیں، اور اس امت کی عمر کم اور مختصر، لیکن اس کمی کی تلافی سال کے مختلف اوقات میں بابرکت لمحات کے ذریعہ کی، چنانچہ عشرۂ ذی الحجہ انھیں مبارک لمحات میں ہے، جن میں اللہ تعالی اعمال کے اجر وثواب بڑھا دیتے ہیں، جس طرح اللہ تعالی نے ہفتے کے سات دنوں میں جمعہ کو، اور سال کے بارہ مہینوں میں رمضان کو اور رمضان کے تین عشروں میں عشرۂ اخیرہ کو خاص فضیلت دی ہے، اس طرح ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں کو بھی اپنے خاص فضل ورحمت کا عشرہ قرار دیا ہے، کیونکہ حج جیسا عظیم رکن اسی میں ادا کیا جاتا ہے، بخاری شریف میں ہے کہ اللہ تعالی کو عمل صالح جتنا ان دس دنوں میں محبوب ہے، اتنا کسی دوسرے دنوں میں نہیں، سوال کیا گیا کہ کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ فرمایا: ہاں اللہ کے راستے کا جہاد بھی نہیں، ہاں اگر کوئی شخص شہید ہوجائے تو اس کا مرتبہ بلند ہے۔

حضرات! اس عشرہ میں روزہ رکھنے کی فضیلت آئی ہے، خاص طور سے عرفہ کا روزہ تو ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ ہے (روایت ابوقتادہؓ)، اس عشرہ کی نویں تاریخ سے تکبیر تشریق پڑھی جاتی ہے، اور وہ ہے: "اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ الا اَللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ."

حضرات! ذی الحجہ کے مہینے میں دو عبادتیں بہت اہم ہیں: ایک حج بیت اللہ،

دوسرے قربانی۔ حج اور قربانی دونوں تسلیم ورضا اور محبت وعشق کے نمونے ہیں۔

قربانی ایک اہم عبادت ہے، وہ شعائر اسلام میں ہے، زمانہ جاہلیت میں بتوں کے نام پر قربانی ہوتی تھی، اللہ تعالی نے اس سے منع کیا، اور سورۂ کوثر میں فرمایا: "اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ، اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ." (الکوثر: ۱–۳) (ہم ہی نے آپ کو خیر کثیر عطا کی، سو آپ اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے، یقیناً آپ کا معاند ہی ایسا ہے جس کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا)، اس سورت میں بتایا گیا کہ قربانی اللہ ہی کے لئے ہونی چاہیے۔

حضرات! قربانی ہر مسلمان عاقل، بالغ، مقیم پر واجب ہے، جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی اور ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجات اصلیہ سے زائد ہو، قربانی کے معاملہ میں سال کا گذرنا شرط نہیں، گھر کے مرد وعورت جن کے پاس اتنی مالیت ہو ان تمام پر قربانی واجب ہے، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ گھر میں ایک فرد کی طرف سے قربانی ہوگئی اور اسی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے، یہ معتبر نہیں ہے۔

سنن ترمذی کی روایت ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو فرزند آدم کا کوئی عمل اللہ کو قربانی سے زیادہ محبوب نہیں، اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنی سینگوں اور بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا، اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضا اور مقبولیت کے مقام پر پہونچ جاتا ہے، پس اے خدا کے بندو! دل کی پوری خوشی سے قربانیاں کرو۔

مسند احمد اور ابن ماجہ کی روایت ہے، حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں: صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ قربانیوں کی کیا حقیقت اور تاریخ ہے؟ فرمایا: یہ تمہارے روحانی اور نسلی مورث حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، صحابہ کرامؓ نے پوچھا: ہمیں اس کے بدلے کیا ملے گا؟ فرمایا: قربانی کے ہر جانور کے ہر ہر بال کے عوض ایک ایک نیکی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عشرۂ ذی الحجہ، اس کی روح اور پیغام کے ساتھ گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین

عشرہ ذی الحجہ اور اس کے تقاضے

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه ، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد . فقد قال الله تعالى : والفجر وليال عشر ، والشفع والوتر (الفجر : ١-٤) اللہ تعالی ارشاد ہے: قسم ہے فجر کی قسم ہے دس راتوں کی، قسم ہے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ، قسم ذی الحجہ کی نوی تاریخ کی

محترم حضرات ! آج ذی القعدہ کی ۲۷ ویں تاریخ ہے، دوتین دن میں ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو رہا ہے، اسلامی جنتری کا آغاز محرم سے ہوتا ہے، اور اس کا اختتام ذی الحجہ پر ہوتا ہے، ذی الحجہ کا مطلب ہی ہے حج کا مہینہ، گویا اس مہینہ کو حج کی عبادت کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے، اسی طرح اس مہینہ کا ایک مبارک عمل قربانی ہے، وہ بھی بہت ثواب کا کام ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس مہینہ کی ابتدائی دس راتوں کی اللہ تعالی قسم کھائی اس سے ان کی اہمیت وعظمت کا احساس ہوتا ہے، ولیال عشر۔ اور دس راتوں کی قسم، اور قرآن میں ہے: واذكروا الله فى أيام معلومات (متعین دنوں میں اللہ کو یاد کرو) اس سے مراد ذی الحجہ کے یہی دس دن ہیں۔

اللہ تعالی کی حکمتوں اور مصلحتوں اور رازوں کو کوئی سمجھ نہیں سکتا، پہلے قوموں کی عمریں لمبی ہوا کرتی تھی، وہ اس میں اپنی تمام کام انجام دیتی تھی، لیکن اس امت کی عمر مختصر اور کم ہے، اس کمی کی تلافی کے لئے اللہ تعالی نے مختلف اوقات میں بابرکت لمحات، اوقات اور گھڑیاں رکھی ہیں، جن میں انسان عبادت کر کے پچھلی امتوں کی لمبی عمر کو پہونچ سکتا ہے، ہفتہ میں جمعہ کے دن کو اللہ نے مبارک فرمایا ہے، سال کے بارہ مہینوں میں رمضان

کو مبارک فرمایا ہے، اسی طرح ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں کی اہمیت بیان فرمائی ہے:

سنن ابوداود میں مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ما من أيام العمل الصالح فيها أحب إلى الله من هذه الأيام أى من أيام العشر ، قالوا : يا رسول الله ! ولا الجهاد فى سبيل الله ، قال : ولا الجهاد فى سبيل الله إلا رجل خرج بماله و نفسه ولم يرجع من ذلك بشئ (ان دنوں میں نیک عمل کرنا اللہ تعالی کو تمام دنوں کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے، صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ اللہ کے راستہ کا جہاد بھی نہیں، فرمایا: اللہ کے راستہ کا جہاد کرنا بھی اتنا پسندیدہ نہیں، مگر یہ کہ انسان اپنی جان ومال لے کر نکلے اور پھر لوٹ کر نہ آئے یعنی وہ شہید ہوگیا تو اس کا مرتبہ بلند ہے۔)

سنن ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، جس کو حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ ذی الحجہ کے ایک دن کے روزہ کا ثواب ایک سال کے روزے کے برابر اور ایک رات کی عبادت کا ثواب شب قدر کی عبادت کے برابر ہے (سنن ۷۵۸) یہی وجہ رسول اللہ ﷺ نے ذی الحجہ کے روزوں کا بڑا اہتمام فرمایا ہے، سنن نسائی میں ہے رسول اللہ ﷺ عاشورا کے روزے کا اہتمام فرماتے تھے، ہر مہینہ کے تین دن کے روزوں کا اہتمام فرماتے تھے اور ذی الحجہ کے ابتدائی دنوں کے روزے کا اہتمام فرماتے تھے، اور فجر سے پہلے دو رکعت سنت کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔

حضرات! ذی الحجہ کے ان دس دنوں میں ایک دن عرفہ کا ہے، عرفہ کا دن نویں ذی الحجہ کو کہتے ہیں، اور حج کا بنیادی اور مرکزی دن وہی عرفہ کا دن ہے، اس دن شیطان اتنا زیادہ ذلیل اور رسوا ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ کسی دن نہیں ہوتا، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالی تمام حاجیوں کے گناہوں کو معاف کر رہے ہیں، اور ان کو جنت میں داخلہ کا پروانہ دے رہے ہیں، حاجیوں کے علاوہ حضرات کے لئے اللہ کے رسول ﷺ نے روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے، اور ارشاد فرمایا ہے کہ صيام يوم عرفة إنى أحتسب على الله

أن يكفر السنة التى قبلها والسنة التى بعدها (صحیح مسلم) عرفہ کے روزہ کے بارے میں مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ ہے) ذی الحجہ کے اسی سے تکبیر تشریق کا آغاز ہوتا ہے، ہر فرض نماز کے بعد وہ تکبیر پڑھی جاتی ہے: الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله، والله أكبر، الله أكبر ولله الحمد۔

حضرات! ذی الحجہ کی دسویں تاریخ عید کا دن ہے، اس دن کو یوم النحر کہتے ہیں، اس دن روزہ رکھنا حرام ہے، بلکہ اس کے بعد تین دن تک روزہ رکھنا حرام ہے، پورے سال میں پانچ دن روزہ رکھنا حرام ہے، جن میں ایک عید الفطر کا دن، اور چار ۱۰۔۱۱۔۱۲۔۱۳ ۔ ہیں، دسویں تاریخ کی اہم عبادت دوگانہ نماز اور قربانی ہے: اللہ تعالی فرماتا ہے: فصل لربك وانحر (اپنے رب کے لئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے) قربانی ایک اہم عبادت ہے، وہ شعائر اسلام میں ہے، مسند احمد میں ہے، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام نے پوچھا: یا رسول اللہ قربانی کی حقیقت کیا ہے؟ اپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے باپ ابراھیم علیہ السلام کی سنت ہے، صحابہ کرام نے پوچھا کہ ہمیں اس میں کیا ملے گا: آپ ﷺ نے فرمایا: ہر بال کے بدلہ ایک نیکی۔ سنن ترمذی میں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ و نے فرمایا: ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو اولاد آدم کا کوئی عمل اللہ کو قربانی سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اور قربانی کا جانور اپنی کھروں، بالوں اور سینگوں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے یہاں مقبول ہو جاتا ہے، پس اے اللہ کے بندو! دل کی خوشی سے قربانی کرو۔

حضرات! قربانی ہر عاقل بالغ مقیم مسلمان پر واجب ہے، جو صاحب نصاب ہو، یعنی قربانی کے دنوں میں ۶۱۲ رگرام چاندی اور ۸۷ گرام سونے کے برابر مالیت ہو تو اس پر قربانی واجب ہے، اس عبادت کے لئے سال کا گذرنا ضروری نہیں ہے، گھر کی عورتوں پر

زیورات کی وجہ سے اتنی مالیت ہوتی ہے، اس لئے ان پر قربانی واجب ہوتی ہے، ایسے ہی یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر ایک آدمی کی طرف قربانی ہوئی تو تمام کی طرف سے کافی ہوگی، ایسا نہیں ہے، جس جس کے پاس مالیت ہو اس پر قربانی واجب ہے۔

قربانی سے پہلے ضروری ہدایت یہ ہے جیسا سنن ترمذی میں آیا ہے کہ رسول اللہ و نے فرمایا: من رأى هلال الحجة و أراد أن يضحى فلا يأخذن من شعره ولا من أظفاره (جس کو قربانی کرنی تو تو وہ ذی الحجہ کا چاند نکلنے کے بعد اپنے ناخن اور بال بالکل نہ کٹوائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ دس دن بڑی اہمیت کے ہیں، اللہ تعالی ان کو اہتمام کے ساتھ گذارنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

قربانی اور اس کی قسمیں

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء ،وامام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد : فقد قال الله تعالى : أرأيت من اتخذ الهه هواه ، أفأنت تكون عليه وكيلا (الفرقان : ٤٣) کیا آپ اس شخص کی ہدایت کا ذمہ لے سکتے ہیں، جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

حضرات ! یہ ذی الحجۃ کا مہینہ قربانی کا مہینہ ہے،، اسی مہینہ میں بحمد اللہ ہم میں سے قدرت رکھنے والوں افراد نے اپنی وسعت کے مطابق راہ خدا میں جانوروں کی قربانی پیش کی، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان قربانیوں کو قبول فرما کر دنیا وآخرت میں ہماری ترقی کا ذریعہ بنائیں۔ یہ مہینہ جب بھی آتا ہے تو حضرت ابراھیم علیہ السلام کی پیش کی ہوئی قربانی کی یاد دلاتا ہے، ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالی کو بیٹے کی قربانی لینا مقصود نہیں تھا، بلکہ جذبات واحساسات کو اللہ کے حوالہ کرنا مقصود تھا، اور بلا شبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں کامیاب ہوئے۔

حضرات ! ذی الحجہ کے اس مہینہ کا ہم سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ ہم جانوروں کو ذبح کر کے اپنے احساسات اور جذبات کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کریں، اگر ہم نے جانوروں کو تو ذبح کر دیا، اور اپنے احساسات وجذبات کو شریعت کے سانچے میں نہیں ڈھالا ، اور ان پر چھری نہیں چلائی تو ہم نے قربانی کی روح اور اس کے پیغام کو نہیں سمجھا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: الكيس من دان نفسه ، وعمل لما بعد الموت (عقلمند اور زیرک اور دانشمند وہ ہے، جس نے اپنے نفس کو تابع کیا، اور موت کے

بعد کے احوال کے لئے عمل کیا)، اس عقلمندی اور دانشمندی کا اعلی نمونہ خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے کہ آپ نے پوری زندگی مجاھدہ اور ریاضت میں گذاری، اور نفس کی غلامی سے اپنے کو آزاد رکھا، نبوت سے پہلے آپ ﷺ غار حراء جاتے تھے اور کئی کئی دنوں تک قیام کرتے تھے، تا کہ دور حاضر کے فتنوں سے بچ سکیں اور نفس کو کنٹرول کرنے کا مزاج پیدا کر سکیں۔ نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ نے کبھی بھی پر تعیش زندگی نہیں اختیار کی ، بلکہ آپ نے اختیاری فقر وفاقہ کو اپنے لئے چنا اور اسی میں پوری زندگی صرف کر دی۔ اللهم اجعلني مسكينا ، و أحييني مسكينا ، واحشرني في زمرة المساكين .

حضرات ! حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے کو شریعت کے سانچے میں ڈھال دیا تھا، اور شریعت ہی ان کی حکمراں تھی، اس سے وہ سر مو انحراف کرنا بڑا جرم سمجھتے تھے، اگر صحابہ کرام کی زندگی کا مطالعہ کیا جے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے پانچ قسم کی قربانیوں دیں ہیں، اور وہی قربانیاں ہمیں بھی دینی ہے تب دین کہیں سر بلند ہوگا، پہلی قربانی یہ کہ انہوں نے مال کو اپنا مال نہیں سمجھا،، بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ایک تحفہ سمجھا، اور جب بھی ضرورت پڑی راہ خدا میں خرچ کر دیا، اس سلسلہ حضرت صہیب رومی کا واقعہ سامنے ہونا چاہئے کہ جب وہ ہجرت کرنے لگے تو کافروں نے کہا کہ بس ایک شرط پر تم کو مدینہ جانے دیں گے وہ یہ کہ تم اپنا سارا مال میرے حوالے کر دو، انہوں نے بے چوں چرا اپنا مال ان کے حوالہ کر دیا

صحابہ کرام کی دوسری قربانی جسمانی ہے کہ انہوں نے راہ خدا میں نہ صحت کہ پرواہ کی اور نہ جسم کی ، بلکہ اسلام کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اپنا سب کچھ تج دیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ امیہ کے غلام تھے، وہ اتنا ستاتا تھا کہ اس کو سن کر رونگٹے کھڑے وہ جاتے ہیں، لیکن انہوں نے جسم اور صحت کی دین کی خاطر ذرا بھی پرواہ نہ کی۔

صحابہ کی تیسری قربانی قلبی اور روحانی ہے، جب ہجرت کا واقعہ پیش آیا تو انہوں نے اپنی اہلیہ اور بچے کو اپنی اونٹ پر سوار کیا، اور انوٹ کی نکیل پکڑ کر چل پڑے، حضرت ام

سلمہ کے قبیلے بنومغیرہ آئے اورانہوں نے کہا کہ تم جاسکتے ہو لیکن میری بیٹی کونہیں لے سکتے، یہ کہہ کر چھین لے کر لے گئے، پھر ابوسلمہ کے قبیلہ بنوعبدالاسد آئے اورانہوں نے کہا کہ تم جا سکتے ہو، ہمارے بچے کونہیں لے جاسکتے، ایسے پریشان کن حالات میں حضرت ابوسلمہ بیوی اور بچے کوچھوڑ کر مدینہ روانہ ہوئے اوراس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔

صحابہ کرام کی جانی قربانی کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے احد کی جنگ میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اگر میں شہید ہوگیا تو کہاں جاؤں گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں، وہ کھجور کھا رہے تھے اتنا سننا تھا کہ ہاتھ میں کھجور پھینکیں اور راہ خدا میں جنگ کی یہاں تک کہ شہادت کی موت پائی۔

صحابۂ کرام کی ایک قربانی خواہشات کی قربانی ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر شدید خواہش اور مکہ سے بے پناہ محبت کے باوجود انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا حکم تسلیم کرتے ہوئے قربانی اور بال منڈوائے، ورنہ وہ اس کی خاطر جان دینے کے لئے تیار تھے۔ یہ ہے پانچ قسم کی قربانیاں: مالی، جسمانی، قلبی، جانی اور خواہشات کی قربانی آج یہی قربانیاں مطلوب ہیں، اگر ہم نے ذی الحجہ کے مہینہ میں یہ عہد کرلیا اوراس پر عمل کرنا شروع کردیا تو اللہ تعالیٰ مزید ہمت وحوصلہ سے نوازیں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

عیدالاضحیٰ: تاریخ، پیغام

الله أكبر الله أكبر، لا إله إلاّ الله، والله أكبر، الله أكبر، ولله الحمد. الحمد لله نحمده، و نستعينه و نستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا، ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادى له، ونشهد أن لآ إله إلا الله وحده لا شريك له، ونشهد أن سيدنا محمداً عبده و رسوله. صلى الله عليه وعلى آله وأصحابه وأزواجه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا، وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوْا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ." (الحج: ۳۷)

(اللہ تعالیٰ تک ان کا گوشت پہنچتا ہے اورنہ ان کا خون، البتہ اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے، اسی طرح اللہ نے تمہارے زیر حکم کردیا ہے، تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، اور آپ اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔

محترم حضرات، معزز سامعین!

آج کا دن عرف اور شریعت میں عیدالاضحیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے، عیدالاضحیٰ کے معنی قربانی کی عید اور خوشی کے ہیں، اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں: ایک عیدالفطر جو رمضان کے اختتام پر منائی جاتی ہے، دوسری عیدالاضحیٰ ہے، جو ذی الحجہ کی دس تاریخ کو منائی جاتی ہے، سال میں پانچ دن ایسے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے خوردونوش اور جشن منانے کے لئے بنایا ہے: ذی الحجہ کی دس، گیارہ، بارہ، تیرہ تاریخوں میں اور عیدالفطر کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔

حضرات! ایک غلط فہمی معاشرہ میں رائج ہے، وہ لفظی ہے، بعض حضرات اس عید کو عیدالاضحیٰ کہتے ہیں، یعنی چاشت کی عید، یہاں تک بعض اخبارات میں اسی طرح لکھا ہوا دیکھا گیا، یہ عید عیدالضحی نہیں، عیدالأضحیٰ ہے، یعنی قربانی کی عید۔ جب کہ عیدالضحیٰ کے معنی چاشت کی عید ہے، چونکہ یہ دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہے، اور انہوں نے اپنے لخت جگر کی قربانی پیش کی تھی، اور ان کے عمل کو قیامت تک کے لئے زندۂ جاوید بنادیا گیا، اس لئے اس کو عیدالأضحیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حضرات! قربانی کی ایک تاریخ ہے، سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانہ سے یہ سلسلہ قائم ہے، ہابیل اور قابیل نے اپنی مراد پوری کرنے کے لئے قربانی پیش کی تھی، ایک نے جانور کی، دوسرے نے غلہ کی، اللہ تعالی نے ایک کی قربانی قبول کی، دوسرے کی رد کردی، اوراعلان کردیا کہ اِنَّمَا یَتَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ (اللہ ڈرنے والوں کے عمل کو قبول کرتا ہے) (المائدہ:۲۷)

بنی اسرائیل بھی اپنی پوری تاریخ میں قربانی پیش کرنے کے مکلّف تھے، اور نسلاً بعد نسل یہ سلسلہ ان کے یہاں منتقل ہوتا چلا آیا تھا، یہاں تک کہ وہ نبی کی نبوت کے لئے یہ دلیل مانگتے کہ قربانی پیش کریں اور وہ قبول ہوجائے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے: اَلَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَا اَلا نُؤْمِن بِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَأْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ (آل عمران : ۱۸۳) (یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں، جب تک وہ ہمارے مواجہہ میں ایسی نیاز نہ پیش کرے، جسے آگ کھا جائے)، قدیم زمانہ میں قربانی کی قبولیت کی شکل یہ تھی کہ ایک آگ کا شعلہ آسمان سے آتا، اور اس کو جلا کر خاک کردیتا، اس طرح اگر کسی نے قربانی پیش کی ہے تو وہ اس کے استعمال کی نہیں ہوتی تھی، امت محمدیہ پر اللہ تعالی نے منجملہ تمام احسانات کے ایک احسان یہ فرمایا کہ اس سے اللہ کی رضا بھی حاصل ہوتی ہے، اور قربانی کا گوشت قابل استعمال بھی ہوتا ہے۔

قریش مکہ میں بھی قربانی کا رواج تھا، لیکن اس کی شکلیں بگڑی ہوئی تھیں، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ساتھ ملت حنیفی کی تجدید ہوئی تو اس کی شکل کو مکمل و جامع بنایا گیا۔

حضرات! قرآن کریم کی بے شمار آیتیں قربانی کے ذکر و تذکرہ سے معمور ہیں:

(۱) سورۂ کوثر میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَر" (اپنے رب کے لئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے)، سورۂ حج میں آیا ہے: "وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً لِیَذْكُرُوْا اِسْمَ اللّٰهِ عَلَی مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ." (الحج:۳۴) (ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کا طریقہ مقرر کیا ہے، تاکہ ان چوپائے جانوروں پر اللہ کا نام لیں، جو اللہ نے انہیں دے رکھے ہیں)۔

سورۂ انعام میں آیا ہے: "قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ." (الأنعام:۱۶۲) (آپ فرمادیجئے کہ یقیناً میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خالص اللہ تعالی ہی کے لئے ہے، جو سارے جہاں کا مالک ہے)۔

سورۂ حج میں آیا ہے: "لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَاؤُهَا، وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ." (الحج : ۳۷) (اللہ تعالیٰ کو قربانیوں کے گوشت نہیں پہنچتے، نہ ان کے خون، بلکہ اسے تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے)۔

ترمذی شریف اور ابن ماجہ میں میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذی الحجہ کی ۱۰ ؍تاریخ کو کوئی نیک عمل اللہ تعالی کے نزدیک قربانی سے بڑھ کر پسندیدہ اور محبوب نہیں، قربانی کرنے والا قیامت کے دن اپنے جانور کے بالوں، سینگوں اور کھروں کو لے کر آئے گا، (اور یہ چیزیں اجر و ثواب کا ذریعہ بنیں گی)، نیز فرمایا: قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالی کے نزدیک شرف قبولیت حاصل کرلیتا ہے، اس لئے تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو۔

ابن ماجہ، مسند احمد اور ترمذی میں آیا ہے: حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ

صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یہ قربانی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ ہمیں اس کے بدلہ کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی۔

مسند احمد میں مزید آیا ہے کہ حضرت ابوھریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص میں قربانی کرنے کی وسعت ہو، پھر بھی قربانی نہ کرے تو ایسا شخص ہماری عیدگاہ نہ آئے'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرمایا اور اس عرصہ میں آپ مسلسل قربانی کرتے رہے (ترمذی)۔

قربانی کا وجوب:

حضرات! قربانی ایک مستقل عبادت ہے، بلکہ یہ فریضہ ہے، یہ شرائع دین میں سے ہے، شریعت کی اصطلاح میں واجب ہے، ہر اس شخص پر جو بنیادی ضرورت کے علاوہ اتنے سامان کا مالک ہو، جو نصاب تک پہونچ جائے، اور اس مال پر سال گذرنا ضروری نہیں، کسی بھی شخص کے پاس تینوں دنوں میں کسی دن بھی اتنی مالیت آجائے تو اس پر قربانی واجب ہے۔

جانور کیسا ہونا چاہئے:

قربانی کا جانور ہر قسم کے عیب سے پاک ہونا چاہئے، حدیث پاک میں آیا ہے:
چار قسم کے جانوروں کی قربانی نہیں ہوگی:
(۱) ایسا کانا جس کا کانا پن واضح ہو (۲) ایسا لنگڑا جس کا لنگڑا پن واضح ہو (۳) کمزور اور مریل جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو (۴) بیمار جانور (عن البراء بن عازب، نسائی، ابن ماجہ) قربانی کے جانور چونکہ قیامت کے دن سواری ہوں گے، اس لئے ان کا موٹا تازہ، ہونا بہتر ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے دو خوبصورت مینڈھوں کی قربانی کی۔

(سنن ابوداود، سنن ترمذی) اور ایک دوسری حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے قربانی کے جانوروں کو موٹا کرو، کیونکہ یہ پل صراط پر تمہاری سواری ہوں گے۔

چند مسائل:

(۱) یہ معاشرہ میں عام ہے کہ پورے گھر میں ایک قربانی ہوجائے، یہ کافی ہے، نہیں، بالکل نہیں، حنفی مسلک کے مطابق گھر میں جتنے افراد صاحب نصاب ہیں، ان تمام پر فرداً فرداً قربانی واجب ہے۔

(۲) خواتین کے پاس اتنے زیورات ہوتے ہیں کہ وہ صاحب نصاب ہوتی ہیں، لہٰذا ان کو اپنی طرف سے قربانی کا ضرور اہتمام کرنا چاہئے۔

(۳) بعض گھروں میں یہ نظام ہے کہ سلسلہ وار نام سے قربانی کرتے ہیں، ایک سال والد کے نام سے، دوسرے سال والدہ کے نام سے، تیسرے چوتھے سال لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ ناموں سے، جب کہ یہ حقیقت ہے کہ قربانی جس پر واجب ہے، اسی کو ہر سال اپنے نام سے کرنا چاہئے، اپنے نابالغ لڑکے کے نام سے کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوگی۔

(۴) اسی طرح اگر کسی صاحب کو اپنے کسی متوفی بزرگ کی طرف سے قربانی کرنی ہے تو صرف ان کی طرف سے کر دینے سے ان کی قربانی ادا نہیں ہوگی، ان کو مستقل قربانی کرنی ہوگی۔

(۵) قربانی کا گوشت بہتر ہے کہ تین حصوں میں کیا جائے: ایک حصہ اپنے لئے، ایک حصہ رشتہ داروں کے لئے، اور ایک حصہ فقراء اور مساکین کے لئے۔

ایک بڑا مغالطہ:

آج کل یہ مغالطہ دینے کو کوشش کی جارہی ہے کہ اتنی بڑی مقدار میں قربانی کی کیا

ضرورت؟ صدقہ وخیرات کر کے لوگوں کی مدد کی جائے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام ایک جامع مذہب ہے، اس نے صدقہ و خیرات کا حکم مستقلاً دیا ہے، اور معاشرے کے تمام افراد کے حقوق کی رعایت کی ہے، اس کے بعد صاحب نصاب کو قربانی کرنے کا حکم دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ قربانی اللہ کے ایک مقبول بندے کے عمل کی تقلید ہے، انہوں نے اپنے بیٹے کی قربانی دی تھی، ان کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا، اور اس کو قیامت تک کے لئے لازم قرار دے دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ نے تو بیٹے کو قربانی میں پیش کر دیا، لیکن ہم سے مطالبہ ہے کہ بیٹوں کی نہیں، جانور کی قربانی پیش کر کے ان کی یاد مناتے ہوئے اللہ کا قرب حاصل کریں، اور مزید نعمتوں سے لطف اندوز ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ۱۴۰۰ ارسو سال سے یہ عمل جاری ہے، ہر نسل میں کروڑوں افراد اس کو کرتے چلے آئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ امت کی اتنی بڑی تعداد کبھی بھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔

تیسری بات یہ ہے کہ آج کل ہر چیز کو معاش سے جوڑ دیا گیا ہے کہ اتنے جانوروں کی قربانی پر اتنے مصارف آتے ہیں، یہی سوال کچھ دنوں کے بعد حج پر ہوگا کہ حج بیت اللہ کی کیا ضرورت؟ اس میں کروڑہا کروڑ روپیوں کا خرچ ہے؟ پھر نماز پر یہی سوال ہو گا کہ پانچ وقتوں میں اتنا وقت ضائع ہوتا ہے، اگر اس وقفہ میں کام کیا جائے تو اتنا فائدہ ہو گا، یہ سب باتیں غلط ذہنیت کی پیداوار ہیں، تو ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین امتحان:

حضرات! عید الأضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہے، حضرت ابراہیم کی زندگی پر از مشقت ہے، امتحانات کی آماج گاہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے کئی امتحان لئے

اور سارے امتحانوں میں وہ کامیاب ہوئے، اللہ نے ان کو اپنا خلیل بنایا، اور ان کی یاد کو قیامت تک کے لئے زندۂ جاوید بنا دیا۔

عراق کے علاقہ ''اُر'' میں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوتے ہیں، ان کے والد کا نام آزر ہے، وہ بت تراشنے والا اور بت بیچنے والا تھا، آزر کے بارے میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ تورات میں ان کا نام تارح ہے، اس لئے مستشرقین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن نے ابراہیم کا نام غلط بتایا ہے، لیکن اگر مان لیا جائے کہ تورات کی بات صحیح ہے تو جواب ہوگا کہ ایک نام ہے، دوسرا لقب ہے، یا ان کے دو نام تھے، جس طرح اسحاق علیہ السلام کے بیٹے کا نام یعقوب بھی ہے اور اسرائیل بھی۔

(۱) توحید پر استقامت:

تاریخی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنی والدہ سے توحید سے متعلق گفتگو کی، قرآن کا بیان ہے کہ انہوں نے محبت آمیز لہجے میں اپنے باپ سے توحید پر گفتگو کی، اپنی قوم سے بھی خطاب کیا، دعوت میں تدریجی عمل جاری رکھا، ایک موقع پر ستارے، سورج چاند کو بطور تمثیل کے پیش کیا، بتوں کی بے بسی واضح کی، اور آخر کار بادشاہ سے مناظرہ کیا۔ بادشاہ مناظرہ میں ناکام ہوا تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا حکم دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو صحیح سالم آگ سے نکال دیا: قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ، وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ. (الأنبياء: ۶۹ – ۷۰) (ہم نے حکم دیا اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں اور لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہی تھی، سو ہم نے انھیں لوگوں کو ناکام کر دیا)

(۲) بے آب وگیاہ میدان میں شیر خوار بچے اوران کی والدہ کو چھوڑنا:

قوم کی ہدایت سے مایوس ہوکر عراق کو خیر باد کہا، اور شام پہونچے، بائبل میں ہے کہ شام میں قحط پڑا تھا، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر چلے گئے تھے، وہاں کے بادشاہ نے آپ کو بے شمار تحائف اور حضرت ہاجرہ کے ساتھ کر دیا، واضح رہے کہ حضرت سارہ پہلے ہی سے آپ کی زوجیت میں تھیں اور سفر مصر میں ساتھ تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام شام لوٹے، عمر ۸۰/سال تھی، اللہ تعالی نے حضرت ہاجرہ کے بطن سے ان کو اولاد دی، اس عہد پیری میں اللہ کا حکم ہوا کہ وہ حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو بے آب وگیاہ میدان میں لے جا کر چھوڑ دیں، انہوں نے اس آواز پر لبیک کہا، اور دونوں کو بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑ دیا، اس طرح اللہ کی طرف سے اس امتحان میں بھی کامیاب ہوئے۔

(۳) اپنے لخت جگر کو قربان کرنا:

حضرت اسماعیلؑ اسی علاقہ میں رہے، اللہ تعالی نے غیب سے ان کے لئے بے شمار چیزوں کا انتظام کر دیا، اور قبیلہ جرہم وہاں آکر آباد ہوا، اس طرح آبادی کے امکانات پیدا ہوگئے، وقتاً فوقتاً حضرت ابراہیم علیہ السلام خبر گیری کے لئے آتے رہے، ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ حضرت اسماعیل کو راہ خدا میں قربان کر رہے ہیں، کئی بار خواب دیکھا، اس کو وحی الٰہی سمجھ کر ان کو راہ خدا میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے، قرآن کریم میں ان کے اس واقعہ کا تذکرہ کچھ اس طرح آیا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى، قَالَ يَأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِينَ، فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ، إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ، وَفَدَيْنَاهُ

بِذِبْحٍ عَظِيمٍ." (الصافات:۱۰۲-۱۰۷) (سو جب وہ لڑکا ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا، تو انھوں نے کہا: بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو، تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے: ابا جان! آپ کر ڈالئے جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے، آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے، پھر جب دونوں نے حکم کو تسلیم کر لیا، اور باپ نے بیٹے کو کروٹ پر لٹا دیا اور ہم نے انھیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں، بے شک یہ تھا بھی کھلا ہوا امتحان اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا)

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مثالی زندگی گذار کر اس دنیا کو خیر باد کہا، ان کی ان قربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالی نے ان کو قیامت تک کے لئے قابل نمونہ قرار دیا ہے، قرآن نے ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا ہے۔

ملت ابراہیمی کے نمایاں ارکان :

توحید۔ رسالت۔ آخرت۔ نماز۔ قربانی۔ حج۔ ختنہ۔ انفرادی ذمہ داری

یہ بنیادی عناصر ہیں ملت ابراہیمی کے، اور یہ تمام شریعت محمدی میں پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے کہا ہے: "مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ، هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ." (الحج: ۷۸) (تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو، اسی نے تمہیں مسلم قرار دیا، پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی، تا کہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں، اور تم سب لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ٹھہرو)

عیدالاضحیٰ کا پیغام:

حضرات! عیدالاضحیٰ ہر سال آتی ہے اور چلی جاتی ہے، اس کا پیغام کیا ہے، جو سال بھر ہمارے لئے حرز جاں ہو، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا پیغام اس میں ہے

کہ ہر کام کو ہم اخلاص کے ساتھ کرنے والے ہو جائیں، قرآن میں آیا ہے کہ فاعبُد اللہَ مخلصاً لله الدینَ (اللہ کی عبادت کرو، دین کو اس کے لئے خالص کر کے)۔ اور اخلاص کے ساتھ کیا ہوا عمل ایسی طاقت رکھتا ہے کہ بڑے بڑے چٹانوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، مصائب کی آندھیوں کو دور کر دیتا ہے، اور اخلاص کی روح سے خالی عمل خود انسان کو جہنم کا ایندھن بنا دیتا ہے۔

عیدالاضحیٰ کا ایک پیغام یہ بھی ہے کہ ہماری جان اور ہمارا مال خود ہمارے نہیں، بلکہ اللہ تعالی کی ملکیت ہیں، اس نے ہم کو استعمال کے لئے بطور امانت دیا ہے، لہٰذا احتیاط کے ساتھ ہم ان کو استعمال کریں، اور راہ خدا میں خرچ کرنے کا اگر مطالبہ ہو تو ذرا بھی دریغ نہ کریں: "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ." (التوبة: ۱۱۱) (بے شک اللہ نے مومنوں سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس کے عوض میں کہ انھیں جنت ملے گی)

عیدالاضحیٰ کا ایک پیغام یہ بھی ہے کہ ہم اپنے اخلاق و عادات کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں، انا، خود پسندی کو اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں حائل نہ ہونے دیں، گویا نفس سے جہاد کریں، اس پر لگام لگائیں، ناجائز باتوں سے دور رکھیں اور اچھی باتوں کا اسے عادی بنائیں، حدیث شریف میں آیا: لیس الشدیدُ بالصُرعة ، انما الشدیدُ مَنْ یَمْلِكُ نَفْسِهِ عِنْدَ الغَضَب (صحیح بخاری بروایت ابوهریرة، کتاب الأدب (حدیث: ۵۷۶۳) (بہادر وہ نہیں ہے جو میدان جنگ میں دشمن کو پچھاڑ دے، بلکہ بہادر وہ ہے جو نفس کو غصہ کے وقت قابو میں رکھے)۔

حضرات! اخیر میں ہم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے اس پیغام پر اپنی بات ختم کرتے ہیں، انہوں نے ۱۹۷۸ء میں پڑوسی ملک میں منتخب مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''ہر چیز کا ایک شجرۂ نسب ہوتا ہے، مسجد کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد بیت اللہ سے ملتا ہے، اور جس مسجد کا شجرۂ نسب مسجد ابراہیمی پر ختم نہ ہو، وہ مسجد خانہ خدا کہلانے کی مستحق نہیں، وہ مسجد ضرار ہے، تو اسی طرح جس قربانی کا شجرۂ نسب ابراہیم خلیل اللہ کے جذبۂ ایثار اور حب خدا اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی بے نفسی وتسلیم ورضا پر ختم نہ ہو وہ صحیح النسب نہیں ہے'' (دعوت فکر وعمل: ۲۶۔۲۸)

اس ملک میں ہم کو تین طرح کی قربانیاں دینی ہیں: ایک وہ جو سیدنا خالد بن ولیدؓ نے یرموک کی جنگ میں دی تھی، عین میدان جنگ میں ان کو قیادت سے معزول کیا جاتا ہے، لیکن ان کی پیشانی پر شکن نہیں آتا اور تاریخ میں ان کا یہ جملہ موجود ہے کہ اگر میں عمرؓ کے لئے لڑتا تھا تو اب نہیں لڑوں گا، اور اگر اللہ تعالی کے لئے لڑتا تھا تو میرے جوش وسرگرمی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

دوسری قربانی سیدنا حسنؓ کی ہے کہ حضرت علیؓ کے بعد خلیفہ منتخب ہو گئے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگ معاشرہ میں فتنہ وفساد پیدا کرنا چاہتے ہیں، ایسے موقع پر خلافت سے اپنے کو دستبردار کر لیا، اور معاشرہ کو اختلاف وانتشار سے بچا لیا، تیسری قربانی وہ ہے جو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے دی، وہ خلافت پر آنے سے پہلے ناز ونعمت میں پلے ہوئے نوجوان تھے، لیکن جیسے ہی ان کو خلافت ملی، اپنے کو ایک خادم اور معمولی انسان تصور کرتے ہیں، اور عوام اور رعایا کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔

یہ قربانیاں سب اسی مرکزی قربانی کی شاخیں اور حاشیئے ہیں، ہمیں ہر موقع پر ان کو یاد رکھنا چاہئے اور ان کی روشنی میں اپنی زندگی گذارنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قربانیوں کو قبول فرمائیں اور اخلاص کی دولت سے مالا مال فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

قرآن کریم: ایک ہدایت نامہ

تلاوتِ قرآن اور اس کی فضیلت

الحمد للّٰه رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد ! فقد قال اللّٰه تعالى: أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم، بسم اللّٰه الرحمن الرحيم: اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَاَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرّاً وَعَلَانِيَةً يَرْجُوْنَ لَنْ تَبُوْرَ." (فاطر : ٢٩) (جولوگ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور ہمارے دیئے ہوئے مال کو خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی نفع بخش تجارت کرتے ہیں، جس میں گھاٹا نہیں)

حضرات! قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے، اس کا مقصد زندگی کے تمام گوشوں میں تمام طبقات کے لئے ہدایت ورہنمائی ہے، شروع ہی سے اللہ تعالی نے انسانیت کی رہنمائی کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں: ایک یہ کہ انبیائے کرام اور رسولوں کو بھیجا، جو اللہ کا پیغام پہونچاتے رہے، دوسرے یہ کہ کتابیں اور صحیفے اتارے، جو دستور اور قانون کی شکل میں موجود تھے، آخری کتاب قرآن مجید ہے، جو ۲۳؍سالہ عرصہ میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اتارا گیا۔

حضرات! اس وقت دنیا کی تمام کتابوں میں قرآن واحد کتاب ہے، جس کو پڑھنا عبادت اور اس کو زبان سے ادا کرنا باعث اجر وثواب ہے، بلکہ تلاوت کرنا رسول اللہ ﷺ کے مشن کا حصہ ہے: "هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ." (سورۂ جمعہ:۲) سورۂ عنکبوت میں ہے: "اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ (العنکبوت:۴۵) (جو کتاب وحی کے ذریعہ آپ کو عطا کی گئی ہے اسے پڑھئے) صحیح مسلم کی روایت ہے، حضرت ابوامامہ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: قرآن پڑھو، وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے حق میں سفارشی بن کر آئے

گا،سنن بیہقی میں ہے،نعمان بن بشیرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کی سب سے افضل عبادت قرآن کریم کی تلاوت ہے۔

حضرات! ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں،ہمیں اس پر کیا ملے گا؟اس کا جواب زبان نبوت نے خود عطا فرمایا: جو قرآن کریم پڑھتا ہے اور عمدگی کے ساتھ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیک اور صالح فرشتوں کو اس کی حفاظت کے لئے مقرر فرمادیتے ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ قرآن کریم کے ہر حرف پر اللہ تعالیٰ ایک نیکی مقرر عطا فرماتے ہیں،اور ہر نیکی دس گنا کردی جاتی ہے اور یہ بھی کہ زمین میں وہ ہمارے لئے نور ہے،اور آخرت میں سب سے زیادہ ثواب کا ذریعہ ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ کہ قرآن کریم کی تلاوت اللہ رب العزت کے تقرب کا ذریعہ ہے،مستدرک حاکم میں ہے،حضرت ابوذر غفاریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا تقرب سب سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت سے حاصل ہوتا ہے،یہ تقرب سمجھ کر پڑھنے اور بغیر سمجھے پڑھنے دونوں سے حاصل ہوتا ہے۔

حضرات! ان خوبیوں اور فضیلتوں کی وجہ سے قرآن کریم کی تلاوت کو صحابۂ کرامؓ نے اپنا معمول بنالیا تھا،وہ نماز میں بھی پڑھتے تھے،اور جب بھی موقع ملتا،تلاوت میں مشغول ہو جاتے تھے،عام معمول سات دن میں قرآن کریم مکمل کرنے کا تھا،گویا ہر دن ایک منزل پڑھتے تھے،لیکن خاص دنوں اور مہینوں میں اس سے کم مدت میں قرآن مکمل کرتے تھے۔

حضرات! قرآن کریم کی تلاوت مستقل عبادت ہے اور بہت پاکیزہ عمل ہے،لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب صحت الفاظ،مخارج حروف،غنہ اور مدہ کے ساتھ ادا کی جائے،پڑھنے والا تصور کرے کہ میرے مالک اور آقا کا کلام ہے،جس کو میں عاجز وفقیر سراپا تقصیر دہرا رہا ہوں،دل ہر قسم کے خیالات سے پاک ہو،حدیث شریف میں آیا ہے: زَیِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ (مسند ابن ماجہ ۱۳۴۲، بروایت براء بن عازب) (قرآن کو اپنی آواز سے مزین کرو) وَمَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا (صحیح بخاری بروایت ابوھریرۃ ۷۵۲۷) (جو قرآن کریم خوبصورتی سے نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں) قرآن کریم اگر صحیح انداز میں پڑھا جائے تو سننے والے

اور دوسری مخلوقات پر اس کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے،حضرت اسید بن حضیرؓ قرآن کی تلاوت کررہے تھے اور پوری بے خودی کے ساتھ کہ قریب کا گھوڑا بدکنے لگا،معلوم ہوا کہ ان کی تلاوت کو سننے کے لئے فرشتے آنے لگے تھے،حضرت ابی بن کعبؓ اچھے قاری صحابی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ابی! میرے مالک نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم سے قرآن پڑھوا کر سنوں،ان کی چیخ نکل گئی اور کہا کہ کیا میرے اللہ نے میرا نام لیا ہے،صحابہ کرامؓ کے واقعات اسلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر حضرات وہ ہیں جنہوں نے تلاوت قرآن کو سن کر اسلام قبول کیا،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ آیَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَاناً وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ." (الأنفال : ۲) (ایمان والے تو بس وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے،تو ان کے دل دہل جاتے ہیں،اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں)

حضرات! قرآن کوئی روایتی کتاب نہیں ہے کہ اس کو جیسے چاہا پڑھ لیا جائے،بلکہ وہ اللہ کا کلام ہے،اور اللہ کا کلام جب تک پورے استحضار نیت کے ساتھ اور اپنی زندگی کی ذاتی کتاب سمجھ کر نہیں پڑھا جائے گا،اس وقت تک اس کا کوئی عظیم فائدہ حاصل نہیں ہوگا، اسی کو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

یہ بات ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار کتابیں اتاری ہیں: پہلی کتاب تورات ہے،جو احکام کا مجموعہ ہے،دوسری کتاب زبور ہے،جو حضرت داود علیہ السلام کو دی گئی،اور زبور میں احکام نام کی کوئی چیز نہیں،وہ صرف اللہ کی حمد وثنا ہے،اس کو حضرت داود علیہ السلام بڑی عمدہ آواز میں پڑھتے تھے،اور تلاوت کرتے تھے،اور جس وقت وہ تلاوت کرتے تھے پوری کائنات ان کا ساتھ دیتی تھی،اسی وجہ سے لحن داودی مشہور ہے،انجیل

کے معنی خوشخبری کے ہیں، اس میں بھی زیادہ احکام نہیں، تورات کے بعض احکام میں تبدیلی کی گئی ہے، اور اخیر میں قرآن اتارا گیا، جو موعظت بھی ہے اور احکام بھی، ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی۔ "يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ، قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا، هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ." (یونس: ۵۷) (اے لوگو! بالیقین تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے، اور شفاء بھی ان بیماریوں کے لئے جو سینہ میں ہوتی ہیں، اور ایمان والوں کے حق میں ہدایت اور رحمت ہے)

حضرات! جب قرآن ہی سب سے بڑی چیز ہے تو اس کو سلیقہ سے رکھنا، اس کا لحاظ کرنا اور اس کا حق ادا کرنا ضروری ہے، اس کو خوبصورت آواز سے پڑھنا تو اس کا اہم حق ہے، صحیح بخاری میں باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن میں ہے کہ ایک رات حضرت ابوموسی اشعریؓ اپنے گھر میں تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کر رہے تھے، رات کے سناٹے میں تلاوت کی آواز رسول اللہ ﷺ کے حجرہ تک پہنچی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی خوبصورت آواز عطا فرمائی تھی، رسول اللہ ﷺ کو ان کا پڑھنا بہت پسند آیا، تو آپ ﷺ سننے کے لئے تشریف لے گئے، بعض روایتوں میں ہے کہ امہات المؤمنین بھی باہر آ گئیں، اور وہ اور آپ ﷺ دیر تک تلاوت سنتے رہے، حضرت ابوموسی اشعریؓ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ رات میں یہ واقعہ پیش آیا ہے، وہ حسب معمول خدمت رسول ﷺ میں حاضر ہوئے، تو نبی اکرم ﷺ نے ان کو شاباشی دی، اور فرمایا: يَا أَبَا مُوسَىٰ! لَقَدْ أُوتِيتَ مِزْمَاراً مِنْ مَزَامِيرِ دَاوُدَ (اے ابوموسی! اللہ نے حضرت داود کو جو عمدہ آواز عطا فرمائی تھی اس کا ایک حصہ تمہیں بھی عطا فرمایا ہے، حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ نے میری تلاوت سنی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں میں نے سنی، اور مجھے بہت پسند آئی، جواب میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں اور اچھا کر کے پڑھتا، اس حدیث کی بنا پر حکیم الأمت، دانائے

رمز شریعت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: کوئی عمل اللہ کے نیک اور صالح بندوں کو خوش کرنے کے لئے کیا جائے تو وہ اخلاص کے منافی نہیں ہے، کیونکہ جب یہ جذبہ ہو کہ اللہ کے نیک بندے خوش ہوں تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے اور بے پناہ اجر دیتا ہے۔

حضرات! یہ بات قابل توجہ ہے کہ پوری شریعت میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ پورے قرآن کا حفظ کرنا فرض یا واجب ہے، اگر یاد کرنا ضروری ہے تو صرف اتنی مقدار، جس سے نماز درست ہو جائے، اگرچہ پورا قرآن یاد کرنا فرض یا واجب نہیں، لیکن جو لوگ یاد کر چکے ہیں، ان کا یاد رکھنا فرض عین ہے، اور اس کا بھول جانا گناہ کبیرہ ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، اس لئے جو بھی قرآن یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے لئے آسان کر دیں گے، لیکن اس کو یاد رکھنا اصل ذمہ داری کا کام ہے، صحابہ کرامؓ میں جو حفاظ تھے وہ قرآن کریم کے یاد رکھنے کا بڑا اہتمام کرتے تھے، وہ روزانہ ایک منزل پڑھتے تھے، اس کا مختصر انہوں نے "فَمِي بِشَوْقٍ" نکالا تھا (اس کا مطلب فاتحہ سے مائدہ تک، مائدہ سے یونس تک، یونس سے بنی اسرائیل تک، بنی اسرائیل سے شعراء تک، شعراء سے صافات تک، صافات سے ق تک) اس طرح معمول بنانے میں ان کا حفظ مکمل یاد رہتا تھا۔

حضرات! قرآن کریم انمول خزانہ ہے، اور جس کو یہ حاصل ہو جائے وہ رشک عالم بن جاتا ہے، اس پر رشک کیا جاتا ہے، لیکن اس کو بھولنے والا کوڑھی بنا کر اٹھایا جائے گا، وہ اندھا ہوگا، رزق کی تنگی میں ہوگا، معاشی مجبوریوں میں ہوگا، اور ہمیشہ پریشان رہے گا۔ سنن ترمذی میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کے اعمال میرے سامنے پیش کئے گئے، میں نے ان میں سب سے بڑا گناہ یہ پایا کہ کسی انسان کو قرآن کی کوئی سورت یاد ہو اور وہ اس کو بھول جائے، درازی عمر اور غلبہ نسیان کی وجہ سے ہو تو الگ بات ہے، لیکن عام حالت میں تلاوت نہ کر کے بھول جانا سخت وعید پر مبنی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم کے اس حق کو مکمل انداز میں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم تلاوت قرآن کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں، روزانہ تلاوت کا معمول بنائیں، اور اس کی برکات حاصل کریں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالىٰ: "اِنَّ هٰذَا الْقُرآنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ." (الاسراء: ۹) (بے شک یہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا جو بالکل سیدھا ہے)

حضرات! قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری مقدس کتاب ہے، آج سے چودہ سو سال پہلے جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی ہے، زمانۂ نزول ۲۳/سال ہے، پہلی آیت اس وقت نازل ہوئی، جب آپ ﷺ مکہ میں غار حراء کی تنہائی میں تھے، اچانک ایک فرشتہ نمودار ہوا، اس نے کہا: پڑھئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں، اس نے کئی بار یہی جملہ دہرایا، پھر کہا: پڑھئے: "اِقْرَأْ بِسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ----" (پڑھئے: اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) قرآن کریم کی یہ پہلی آیت ہے، اس میں فرمادیا گیا کہ پڑھنا لکھنا اس امت کی اور مسلمانوں کی شان ہے، کوئی مسلمان اس وقت تک مکمل مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک وہ کچھ نہ کچھ دین اسلام کا واقف کار نہ ہو، قرآن کریم پورے ۲۳/سال میں اترا، کبھی ایک آیت، کبھی ایک سورت، کبھی چند آیتیں، اور جب کوئی آیت یا سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ اس کو لکھنے والوں سے لکھوالیتے تھے۔

قرآن سے پہلے کئی کتابیں اتاری گئیں، ان میں تورات، زبور، انجیل خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، اسی طرح کئی چھوٹے چھوٹے صحیفے (پُرزے) متعدد انبیاء کرام کو دیئے گئے، ان میں صحیفۂ ابراہیم، صحیفۂ موسیٰ اور صحیفۂ نوح کا تذکرہ ملتا ہے، قرآن مجید ہدایت کی کتاب ہے، زندگی کے تمام مسائل کا حل اسی کتاب میں موجود ہے، گھریلو مسائل، سیاسی مسائل، معاشی واقتصادی مسائل، تجارتی وزراعتی مسائل، غرض کہ ہر درد کا علاج اور ہر مرض

سے شفایابی کا نسخہ قرآن کریم ہے، قرآن میں آیا ہے: "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِيْنَ، وَلَا يَزِيْدُ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا خَسَاراً." (سورۂ کہف: ۸۲) (یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں، مومنوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے، ہاں ظالموں کو بجز نقصان کے اور کوئی زیادتی نہیں ہوتی)، ایک حدیث میں آیا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں ہر بیماری سے شفا ہے، تجربہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات کا پانی پر دم کیا جائے اور مریض کو پلایا جائے اور اس کو پڑھ کر مریض کے لیے دعا کی جائے تو مرض کا اثر بہت جلد زائل ہوتا ہے، اسی طرح قرآن کریم ظاہری وروحانی امراض سے آزادی کا بھی ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

حضرات! قرآن کریم وہ کتاب ہے، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے، اس میں باطل کے اثر انداز ہونے کی گنجائش نہ آگے سے ہے، نہ پیچھے سے، نہ دائیں سے، نہ بائیں سے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' (حجر: ۹)، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت اس طرح کرائی کہ حفاظ نے اپنے سینوں میں الفاظ قرآن کو محفوظ کرلیا، قراء نے قرآن کو پڑھنے کے طریقے اور اس کے لب و لہجے کو محفوظ کرلیا، علماء نے قرآن کے صحیح معانی ومطالب مستند تفاسیر وتراجم کے اندر محفوظ کردی، یہ اللہ تعالیٰ کی ہمارے اوپر بڑی مہربانی اور فضل ہے کہ قرآن حضور اکرم ﷺ پر جس طرح نازل ہوا تھا، بعینہ اسی طرح اب بھی محفوظ وموجود ہے، اس میں کہیں زبر، زیر یا پیش، نقطہ کا بھی کوئی فرق نہیں ہوا، جب کہ دوسری آسمانی کتابیں تبدیلی کا شکار ہوگئیں، اور ان میں ہیر پھیر کو روا رکھا گیا۔

حضرات! قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت تمام کلاموں پر اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اپنی تمام مخلوقات پر، قرآن کریم سب سے بڑی دولت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس کے سینہ میں قرآن کا کوئی حصہ نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو قرآن کریم کو سیکھے اور سکھائے، آج ہمارے معاشرہ میں مال دار کو، گاڑی والے کو، کارخانے والے کو بہتر اور معزز سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ رسول اکرم ﷺ نے ان لوگوں کو

بہتر قرار دیا ہے، جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا دیکھنا ثواب، اس کا چھونا ثواب، اس کا سننا ثواب، اس کا سنانا ثواب، اس کو یاد کرنا اور کرانا ثواب ہی ثواب ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین چیزیں انسان کے ذہن کو بڑھاتی ہیں: مسواک، روزہ اور قرآن شریف کی تلاوت۔

حضرات! قرآن کریم ایسی کتاب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو اوپر اٹھاتا ہے اور بہت سے افراد کو نیچے بھی گراتا ہے، عروج بھی عطا کرتا ہے، زوال بھی دیتا ہے، ترقی سے بھی نوازتا ہے، پستی میں بھی ڈالتا ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ کچھ لوگوں کو اوپر اٹھاتا ہے، اور کچھ لوگوں کو اس کی وجہ سے پستی میں گرا دیتا ہے یعنی جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو دنیا وآخرت میں رفعت وعزت عطا فرماتے ہیں، اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے، حق تعالیٰ ان کو ذلیل کرتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کے مقاصد بعثت میں تلاوتِ قرآن، اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کرنا، معانی قرآن سمجھانا اور حدیث نبوی سے آگاہ کرنا تھا، اس لئے ہم مسلمانوں پر قرآن کریم کے پانچ حقوق ہیں:

(۱) اس بات پر ایمان لانا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تراشیدہ کلام نہیں ہے، جس کو انہوں نے یمامہ کے ''رحمان'' شخص سے حاصل کیا ہے۔

(۲) قرآن کریم کی قدر اور احترام کرنا۔

(۳) قرآن کریم کی بکثرت تلاوت کرنا، حفظ کا اہتمام کرنا۔

(۴) قرآن کریم کے احکام ومطالبات پر عمل کرنا، معانی پر غور کرنا۔

(۵) قرآن کے پیغام کو پوری دنیا میں عام کرنا۔

سچ کہا ہے شاعر مشرق علامہ اقبال نے:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان — اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

قرآن ساری انسانیت کے لئے ہدایت نامہ ہے

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى : أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحم الرحيم.

"اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ، وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْراً كَبِيْراً، وَاَنَّ الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَاباً اَلِيْماً." (الإسراء: ۹) (یہ قرآن اسی راستے کی طرف لے جاتا ہے، جو سب سے سیدھا ہے، اور خوشخبری سناتا ہے، ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، اور نیک عمل کئے کہ ان کے لئے بڑا ثواب ہے، اور انہوں جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے)

محترم حضرات! قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، آج سے چودہ سو سال پہلے جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام کے واسطے سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں غارِ حراء کی تنہائی میں تھے تو ایک فرشتہ آیا، اور اس نے کہا کہ پڑھئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں، اس نے کئی بار یہی جملہ دہرایا، پھر کہا: پڑھئے! اقرا باسم ربك الذى خلق، پڑھئے اپنے اس رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا، یہ قرآن کی پہلی آیت ہے، اس میں فرمادیا گیا کہ پڑھنا، لکھنا اس امت کی اور مسلمانوں کی پہچان ہے، کوئی مسلمان اس وقت تک مکمل مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ کچھ نہ کچھ دینِ اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات نہ جانتا ہو، قرآن کریم ۲۳ر

سال کے عرصہ میں اترا، کبھی ایک آیت، کبھی ایک سورت، اور کبھی چند آیتیں، اور جب کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لکھنے والوں سے لکھوا لیتے تھے۔

محترم حضرات! قرآن کریم سے پہلے کئی کتابیں اتاری گئیں، ان میں تورات، زبور، اور انجیل ہیں، اسی طرح کئی چھوٹے چھوٹے صحیفے متعدد انبیاء کو دیئے گئے، ان میں صحیفہ ابراہیمؑ، صحیفہ موسیٰؑ اور صحیفہ نوح کا تذکرہ ملتا ہے، قرآن مجید ہدایت کی کتاب ہے، زندگی کے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، جیسے عائلی زندگی، سیاسی زندگی، معاشی زندگی، تجارتی زندگی، اور زراعتی زندگی وغیرہ، غرض ہر درد کا علاج اور ہر مرض کی شفا قرآن میں موجود ہے، ارشادِ باری ہے: " وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ " (الإسراء:۸۲) (اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں اتارتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے لئے تو شفا اور رحمت ہے)، اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ "سورۂ فاتحہ میں ہر بیماری کی شفا ہے"، اور یہ تجربہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات کو پانی پر دم کیا جائے، یا اس کو پڑھ کر پھونک دیا جائے تو اس کا اثر بہت جلد ہوتا ہے، لیکن ہائے افسوس کہ قرآن کی ساری تعلیمات کو چھوڑ کر قرآن کو جھاڑ پھونک کے لئے خاص کر دیا گیا ہے، اے کاش! مسلمان اس حقیقت کو سمجھتے اور قرآن کو اپنی زندگی میں اتارتے۔

برادرانِ اسلام! قرآن کریم وہ کتاب ہے، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، قرآن میں باطل کے گھسنے کی گنجائش نہ آگے سے ہے نہ پیچھے سے، نہ دائیں سے، نہ بائیں سے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت اس طرح کرائی کہ حفاظ نے اپنے سینوں میں قرآن کے الفاظ کو محفوظ کرلیا، قراء نے قرآن کے پڑھنے کے طریقے اور اس کے لب ولہجہ کو محفوظ کرلیا، اور علماء نے قرآن کے معانی ومطالب، تفاسیر وتراجم کو محفوظ کرلیا، یہ اللہ تعالیٰ کی ہمارے اوپر بڑے مہربانی اور فضل ہے کہ قرآن جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، بعینہ اسی طرح اب بھی موجود ہے، اس میں کہیں پر زیر، زبر یا نقطہ کا بھی کوئی فرق نہیں ہوا، جب کہ دوسری آسمانی کتابیں تبدیلی کی شکار ہوگئیں،

اور اس میں ہیر پھیر کر دیا گیا۔

حضرات! قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، اور اللہ کے کلام کی فضیلت تمام کلاموں پر اسی طرح ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی تمام مخلوقات پر، قرآن کریم سب سے بڑی دولت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس کے سینے میں قرآن کا کوئی حصہ نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے، (سنن ترمذی:۱۰۰۰)، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جس گھر میں قرآن مجید پڑھا جاتا ہے، اس میں اولاد زیادہ ہوتی ہیں، اور اس میں خیر وبرکت بڑھ جاتی ہے، فرشتے اس میں نازل ہوتے ہیں، اور شیطان اس گھر سے نکل جاتے ہیں، اور جس گھر میں قرآن کی تلاوت نہیں ہوتی ہے، اس میں تنگی خصوصاً بے برکتی ہوتی ہے، فرشتے اس گھر سے نکل جاتے ہیں، شیاطین اس میں گھس جاتے ہیں۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے، آج ہمارے معاشرہ میں مالدار کو، گاڑی والے کو، کارخانے والے کو بہتر اور معزز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن لوگوں کو اس سے بہتر شخص نہیں قرار دیا، جو قرآن سیکھے اور سکھائے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کا دیکھنا ثواب، اور اس کا چھونا ثواب، اس کا سننا ثواب، اس کا سنانا ثواب اور اس کو یاد کرنا اور کرانا ثواب ہی ثواب ہے، حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ تین چیزیں انسان کے ذہن کو بڑھاتی ہے: مسواک، روزہ، اور قرآن شریف کی تلاوت، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ جس شخص نے نماز میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھا، اس کو ہر حرف پر سو نیکیاں ملیں گی، اور جس شخص نے بیٹھ کر پڑھا، اس کے لئے پچاس نیکیاں، اور جس شخص نے بغیر نماز کے وضو کے ساتھ پڑھا، اس کے لئے پچیس نیکیاں، اور جس نے بلا وضو پڑھا، اس کے لئے دس نیکیاں، اور جو شخص پڑھے نہیں، بلکہ صرف پڑھنے والے کی طرف کان لگا کر سنے، اس کے لئے ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ملتی ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایک حرف قرآن کا پڑھے اس کے لئے ایک حرف کے بدلے ایک نیکی ملتی ہے، اور نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ سارا الم ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔

حضرات! قرآنِ کریم ایسی کتاب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ہدایت نامہ کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو اوپر اٹھاتا ہے، اور نیچے بھی گراتا ہے، عروج بھی عطا کرتا ہے، زوال بھی دیتا ہے، ترقی سے بھی نوازتا ہے، پستی میں بھی ڈالتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ کچھ لوگوں کو اوپر اٹھاتا ہے، اور کچھ لوگوں کو اس کی وجہ سے پستی میں گرادیتا ہے، یعنی جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، اللہ ان کو دنیا و آخرت میں رفعت و عزت عطا فرماتے ہیں، اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں حق تعالیٰ ان کو ذلیل کرتے ہیں۔

حضرت عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع بن عبد الحارث کو مکہ کا حاکم بنا رکھا تھا، ان سے ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ جنگلات کا ناظم کس کو بنایا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ابن ابزی کو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ابن ابزی کون شخص ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارا ایک غلام ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعتراضاً فرمایا کہ غلام کو امیر کیوں بنا دیا؟ انہوں نے کہا کہ قرآن کا اچھا قاری ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی حدیث نقل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کی بدولت بہت سے لوگوں کا درجہ بلند کرتے ہیں اور بہت سے پست کرتے ہیں۔

حضرات! قرآنِ کریم کے ہم پر پانچ حقوق ہیں:

(۱) اس بات پر ایمان لانا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، نعوذ باللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گڑھا ہوا یا ان کا لکھا ہوا نہیں ہے۔

(۲) قرآن کی قدر اور احترام کرنا۔

(۳) قرآن کی تلاوت کا اہتمام کرنا۔

(۴) قرآن کے احکام پر عمل کرنا۔

(۵) قرآن کے پیغام کو پوری دنیا میں عام کرنا، خاص طور سے اپنے گھر میں اس کی تلاوت کا اہتمام کرانا۔

ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي (مؤطا امام مالک) (میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑیں ہیں: ایک قرآن، دوسرے اپنی سنت)، اور قرآن شفیع ہے، إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ أَوْ عِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُو لَهُ (صحیح مسلم بروایت ابو هریرة) (جب انسان کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے سارے اعمال اس سے منقطع ہوجاتے ہیں سوائے تین چیزوں کے: صدقۂ جاریہ یا ایسا علم جس سے استفادہ کیا جائے، یا ایسی اولاد جو اس کے لئے دعا کرے)، قرآن معجزہ ہے، اس کا ظاہر بھی ہے اور اس کا باطن بھی، ایک حدیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دلوں کو زنگ لگتا ہے، جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے، سوال کیا گیا: اس کے دور کرنے کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: قرآن کی تلاوت اور موت کی یاد، (بیہقی فی شعب الایمان، وکنز العمال: ۴۲۱۳) ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ میں دو خاموش نصیحت کرنے والے چھوڑ کر جا رہا ہوں: ایک قرآن اور دوسرے موت (ابن الجوزی فی بستان الواعظین)

آج جو لوگ دنیا و آخرت میں کامیابی چاہتے ہیں، ان پر لازم ہے کہ قرآن کی دعوت پر لبیک کہیں۔

مسلمانوں اٹھو قرآن کی دعوت کو پھیلاؤ
جہانِ بے اماں کو عافیت کے راز سمجھاؤ
زمانہ آج بھی قرآن ہی سے فیض پائے گا
مٹے گی ظلمتِ شب اور عالم جگمگائے گا

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

تعلیم وتربیت

علماء روشنی کا مینار ہیں

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصّلاۃ والسّلام علی سیّد الأنبیاء وإمام المرسلین محمد وعلی آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد! فقد قال اللّٰہ تعالیٰ: "ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتَابَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا، فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرَاتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ، وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُ." (الفاطر: ۳۲)

(پھر ہم نے یہ کتاب ان لوگوں کے ہاتھ میں بھی پہنچائی، جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پھر ان میں سے بعض تو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں، اور بعض ان میں سے متوسط ہیں، اور بعض ان میں سے اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے جاتے ہیں)

محترم حضرات اور معزز سامعین!

زندگی، متحرک اور تغیر پذیر ہے، وہ ہر دم رواں اور دواں اور سدا جواں ہے:

جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس متحرک زندگی کے تقاضے بے شمار ہیں اور مطالبات لامحدود، مسائل اَنْ گنت ہیں اور حالات مختلف، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں: ایک یہ کہ ایسی کامل ومکمل اور زندہ شریعت عطا فرمائی، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا مقابلہ کرسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِيۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا." (المائدۃ: ۳) (آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کردیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی، اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کرلیا)

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں ایسے زندہ افراد بھیجتا رہا ہے، جو ان تعلیمات کو عملی طور پر زندگی میں منتقل کرتے رہے، سنن ابوداؤد کی کتاب الملاحم میں ہے، حضرت

ابو ہریرہؓ نے فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا أَمْرَ دِيْنِهَا." (بے شک اللہ تعالی اس امت کے ہر صدی میں ایسے افراد بھیجتا رہے گا جو اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے)

حضرات! شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر اور اس کے اعصاب پر ایسے خطرناک حملے ہوئے کہ اگر کوئی مذہب ہوتا تو وہ اپنا وجود کھودیتا، یہ حملے بین الاقوامی سطح پر بھی ہوئے، یہود ونصاریٰ کی دسیسہ کاریاں، سازشیں اور خفیہ تدبیریں اسی کا حصہ ہیں، اور ملکی اور داخلی سطح پر بھی ہوئے، ان میں باطنیت، کرامیت، جہمیت، معتزلیت، خارجیت اور رافضیت وغیرہ نمایاں ہیں، یہ تحریکیں ارکانِ اسلام اور اصولِ دین کو زک پہنچاتی رہیں، دونوں سطح پر علمائے امت ہی نے اپنے حریفوں کو شکست دی اور اسلام کے صاف وشفاف چہرے کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، حدیث پاک میں آیا ہے: "يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ، وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." (اس علم نبوی کے وارث ہر دور میں ایسے انصاف پرور افراد ہوں گے جو غلو پسندوں کی تحریفات اور اہل باطل کی تاویلات اور جاہلوں کی جہالت کو دین اسلام سے کھرچ کھرچ کر صاف کردیں گے) (بیہقی، مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم)

حضرات! علمائے امت روشنی کا مینار ہیں، علمائے امت کشتی نوح ہیں، جو اس میں سوار ہوگیا وہ کامیاب ہوگیا اور نجات پاگیا اور جو دور رہا وہ ہلاک ہوگیا، علماء کی مثال ستاروں کی طرح ہے، جن سے روشنی بھی حاصل کی جاتی ہے، اور وہ آسمان کی زینت اور خوبصورتی کا ذریعہ ہیں اور شیاطین کو مارنے کا آلہ اور وسیلہ ہیں، اسی طرح علماء اس زمین کے لئے زینت اور خوبصورتی کا ذریعہ ہیں، ان سے راستے معلوم کئے جاتے ہیں، اور وہ شرک وبدعت کے خلاف سر بکف رہنے والے شمشیر برہنہ ہیں، عالم کون ہوتا ہے؟ عالم وہ ہے جو قرآن وسنت کا ماہر اور فقہ اسلامی کا جاننے والا ہو، عملی طور پر ان کا نمونہ بھی پیش کرتا ہو، ایسی لوگوں کو ربانی

علماء کہا جاتا ہے، اللہ والے علماء، جو علم سیکھے اور عمل کرے اور سکھائے وہی عالم ہے۔

حضرات! بنیادی طور پر علم تین ہیں: قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی، بقیہ تمام علوم اسی کی شاخیں اور فروع ہیں، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ علم کے دو حصے ہیں: ایک کا سیکھنا فرض عین اور دوسرے کا سیکھنا فرض کفایہ، فرض عین یہی ہے کہ عقائد کا علم، عبادات کا علم، معاملات کا علم، اخلاقیات کا علم، ان بنیادی باتوں کو جانے بغیر انسان مکمل انسان نہیں ہوسکتا، چہ جائے کہ مسلمان اور عالم، دوسرے علم فرض کفایہ ہے، جس کو چند لوگ حاصل کرلیں تو دوسروں کو حاصل کرنا ضروری نہیں ہوتا، جیسے وکالت کا علم، طبابت کا علم، سورج، چاند کا علم وغیرہ۔

حضرات! اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ چند نوجوان سیر وتفریح کے لیے نکلے، راستہ میں دریا پار کرنے کے لئے کشتی کا سہارا لینا پڑا، وہ کشتی پر سوار ہوئے، نوجوان تفریحی موڈ میں تھے، انھوں نے ملاح سے پوچھا کہ چچاجان! آپ نے فلکیات کا علم حاصل کیا ہے، دوسرے نے کہا: آپ نے زولوجی اور بانٹنی، علم الحیوانات اور علم نباتات حاصل کیا ہے، تیسرے نے اسی طرح کا سوال کیا، بے چارہ ملاح ہکا بکا تھا، کیا جواب دیتا، اس نے کچھ پڑھا ہی نہیں تھا، نوجوانوں نے کہا: چچاجان! آپ نے اپنی آدھی عمر ضائع کی، اتنے میں دریا میں طغیانی آئی، اور کیفیت یہ پیدا ہوئی کہ کشتی اب ڈوبی، تب ڈوبی، ملاح نے پوچھا: میرے بچو! کیا آپ نے تیراکی سیکھی ہے، سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی، سب نے کہا: چچاجان! ہم نے تیراکی نہیں سیکھی، ملاح نے بروقت کہا: اگر سائنس اور ٹکنالوجی کا علم حاصل نہ کرکے میں نے آدھی عمر ضائع کی تو آپ لوگوں نے تیراکی نہ سیکھ کر اپنی پوری عمر ضائع کی۔

حضرات! آج دنیا میں علوم وفنون کی کمی نہیں، نوع بنوع کے علوم ایجاد ہوگئے

ہیں، لیکن وہ علم ناپید ہے جس کے لیے اللہ نے انسان کو دنیا میں بھیجا ہے، فرض عین کا علم ہمارے پاس نہیں ہے، اسی لیے لاکھ کوششوں کے باوجود نہ امن قائم ہو رہا ہے، نہ شر و فساد۔ فرض عین کا یہ علم مکاتب میں، مساجد میں اور مدارس میں حاصل کیا جاتا ہے، اگر یہ علم حاصل ہو گیا تو دیگر علوم کو حاصل کرنا رحمت ہی رحمت اور اگر یہ علم نہیں حاصل ہوا تو سارے علوم زحمت کا ذریعہ ہیں۔

حضرات! تاریخ بتاتی ہے کہ جب اصل علم کی طرف توجہ کی گئی تو زمانہ نے ترقی کی ہے، عہد صحابہ وتابعین میں یہی صورتِ حال تھی، اس لیے امن وامان کی فضا تھی، ان علوم کو حاصل کرنے والوں کی بے شمار فضیلتیں اور اوصاف ہیں، ابن ماجہ کی ایک حدیث سنئے:

"فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ." (ابن ماجہ بروایت عبداللہ بن عباس)
(ایک عالم شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہے) یعنی شیطان ہزار عابدوں کو دھوکہ دے سکتا ہے، لیکن اس کے لئے ایک عالم کو دھوکہ دینا مشکل ہے)۔

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اگر یہ علم حاصل کرلیا، اور اس سے مقصد دنیا طلبی ہے تو اللہ جنت کی خوشبو سے بھی نہ دیں گے، اور ریا کار عالم کو جہنم کا ایندھن بنائیں گے، اور علم حاصل کرلیا لیکن اس کو چھپایا تو اللہ آگ کی لگام پہنائیں گے، اور بلا سوچے سمجھے علم بیان کیا تو جہنم ٹھکانہ بنائیں گے۔

حضرات! اللہ نے ہمارا انتخاب فرمایا ہے: "ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ" اس انتخاب پر ہمیں شکر ادا کرنا چاہئے اور علم کی دولت سے مالا مال ہونے کے لیے دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، تاکہ ہم معاشرے کے لیے ہر اعتبار سے سودمند اور مفید ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیقات سے نوازے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

علم دین کا حاصل کرنا ہر ایک کے لئے ضروری

الحمد للّٰه ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد! فقد قال اللّٰه تعالى : "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ" (التوبة: ١٢٢) (اور مومنوں کو نہ چاہئے کہ آئندہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں، سو یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں ایک حصہ نکل کھڑا ہو، تاکہ یہ باقی لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں، اور تاکہ یہ اپنی قوم والوں کو جب وہ ان کے پاس واپس آجائیں ڈراتے رہیں، عجب کیا کہ وہ محتاط رہیں)

حضرات! اسلام ایک مکمل دین اور مکمل نظامِ حیات ہے، وہ اللہ کا بھیجا ہوا نظام ہے، ان کے اندر ایک خوبی تو یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ، ہر موقع کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے علماء پیدا ہوتے رہے ہیں، جو دینِ حق کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں۔

انسان روح وجسم کا مجموعہ ہے، اور دونوں کے الگ الگ تقاضے ہیں، جس طرح جسم کے لئے غذائی اشیاء کی ضرورت ہے، اسی طرح روح کے لئے اللہ تعالیٰ نے شعائر اللہ کا انتظام کیا ہے، ان کو دیکھ کر بے چین اور مضطرب روح تسکین حاصل کرتی ہے، انھیں شعائر اللہ میں مساجد و مدارس ہیں، یہ مدارس بجلی گھر یا پاور ہاؤس ہیں، جس سے ایمانی اور روحانی طاقت تقسیم ہوتی ہے۔

حضرات! یہ مدارس انسان کو زندگی کے اصل مقصد بتاتے ہیں، اگر یہ نہ رہے تو انسان کا اصل وجود خطرہ میں ہے، اسی وجہ سے امام غزالیؒ نے کہا تھا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک فرض عین اور دوسرے فرضِ کفایہ، فرضِ عین یہ ہے کہ حلال وحرام کا علم، جائز اور ناجائز کا علم، اور فرض کفایہ وہ ہیں جن سے صنعت وحرفت وابستہ ہو یا وہ کوئی دنیوی فن جیسے طبابت، انجینئرنگ، زراعت وغیرہ۔

حضرات! سورۂ توبہ میں آیا ہے کہ "وَمَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَافَّةً ، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ، وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَیْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ (التوبة: ١٢٢)، یہ آیت غزوہ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی، غزوۂ تبوک میں تمام مسلمانوں کو نکلنے کا حکم تھا، اسی وجہ سے جو لوگ اس موقع پر نہیں نکلے، ان کی بڑی سرزنش کی گئی، پھر جب کوئی اعلان ہوتا تو سب نکل کھڑے ہوتے، ایسے موقع پر یہ آیت نازل ہوگئی اور کہا گیا کہ ایمان والوں کو نہ چاہیے کہ آئندہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں، سو کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں ایک حصّہ نکل کھڑا ہو، تاکہ یہ باقی لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ اپنی قوم کو جب ان کے پاس واپس آجائیں ڈراتے رہیں، عجب کیا کہ وہ محتاط رہیں، اس آیت سے علمِ دین کا وجوب معلوم ہوتا ہے:

حضرات! مسندِ احمد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ مَثَلَ الْعُلَمَاءِ کَمَثَلِ النُّجُوْمِ فِی السَّمَاءِ یُهْتَدٰی بِهَا فِیْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، فَإِنِ انْطَمَسَتِ النُّجُوْمُ أَوْشَكَ أَنْ تَضِلَّ الْهُدَاةُ." (علماء کی مثال آسمان کے ستاروں کی طرح ہے، جن سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں روشنی حاصل کی جاتی ہے، اگر یہ ستارے بے نور ہوجائیں تو راہگیروں کو دشواری کا سامنا ہو) یہاں علماء کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے، اور ستاروں کے بارے میں آیا ہے کہ وہ آسمان کی زینت ہیں، شیاطین کو دور کئے جانے کا ذریعہ ہیں، اور راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علم کے ساتھ ذکر بھی ضروری ہے، جو نبوی ترتیب اور قرآنی ہدایت کے عین مطابق ہے کہ وہ تلاوتِ کتاب، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حدیث و سنت اور تزکیہ نفس کے ساتھ ہو، صرف کتاب کے حروف پڑھنا اور تزکیہ سے دور رہنا ناقص نیابت اور ادھوری وراثت ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم کو عام کرنے کا ذریعہ بنائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ ربّ العالمین

علم کا مقصد خشیت الٰہی ہے

الحمد للہ ربّ العالمین، والصلاة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعهم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد! فقد قال اللہ تعالی: "إِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ." (الفاطر: ٢٨) (اللہ سے ڈرتے تو وہی بندے ہیں جو علم والے ہیں)

حضرات! دینِ اسلام علم وتعلیم کا مذہب ہے، عقل وقلب، روح ومادّہ کا مذہب ہے، جس طرح روشنی اور تاریکی، رات اور دن، آسمان اور زمین برابر نہیں ہوسکتے، اسی طرح علم اور جہل برابر نہیں ہوسکتے: "قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ." (الزمر: ٩) (آپ کہہ دیجئے! اچھا بتاؤ، کیا جاننے والے، اور نہ جاننے والے برابر ہوسکتے ہیں)

اہل علم کو اللہ نے گواہ بنایا ہے: "شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِکَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِماً بِالْقِسْطِ (آل عمران: ١٨) (اللہ کی گواہی ہے کہ کوئی معبود نہیں بجز اس کے، فرشتوں اور اہل علم کی بھی یہی گواہی ہے کہ وہ عدل سے انتظام رکھنے والا معبود ہے)، "ترمذی شریف کی روایت ہے: "الدُّنْیَا مَلْعُوْنَةٌ، مَلْعُوْنٌ مَا فِیْهَا إِلَّا ذِکْرَ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ، وَعَالِماً وَمُتَعَلِّماً" (سنن ترمذی، بروایت ابوهریرة) (دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں اللہ کی رحمت سے دور ہیں، سوائے اللہ کے ذکر اور اس کی اطاعت وغیرہ کے، اور عالم اور متعلم کے)

علم انسان کو درجوں بلند کرتا ہے: "یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (المجادلة: ١١) (اللہ تم میں ایمان والوں کے اور ان کے جنہیں علم عطا ہوا ہے، درجے بلند کرے گا)

حضرات! علم ایک خزانہ ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ أُوْتِیَ خَیْراً کَثِیْراً. (جسے حکمت عطا ہوئی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا)۔

علم کی خصوصیات میں چند صفات قابل ذکر ہیں:

ا۔خشیت: اِنَّما یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ.(الفاطر : ۲۸)
(اللہ سے ڈرتے تو وہی بندے ہیں جو علم والے ہیں)

۲۔صحیح فیصلہ کرنا : قَدْ فَصَّلْنَا الْآیَاتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (الأنعام : ۹۸) (بے شک ہم نے دلائل کھول کر بیان کر دیئے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو خبر رکھتے ہیں)

۳۔بلاچوں چرا تسلیم کرنا: وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّکَ فَیُؤْمِنُوْا بِہٖ، فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُھُمْ (الحج : ۵۴) (اور یہ سب اس لئے بھی کہ جن لوگوں کو فہم عطا ہوا ہے، وہ یقین کریں کہ یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے، اور ان کے دل اس کی عظمت کے سامنے جھک جائیں)

حضرات! علم کی تاریخ ویسے ہی قدیم ہے، جیسے دنیا کی تاریخ۔علم کے ذریعہ انسان کو بلند مرتبہ بنائے جانے کا تذکرہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے مربوط ہے کہ ان کو فرشتوں پر فوقیت عطا کی گئی، ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا تھا، وہ علمِ کائنات تھا، قدیم وجدید کی بحثوں سے آزاد تھا۔

حضرات! تاریخ کے دو دور ایسے ہیں جن میں علم کی حکمرانی سے قوم ترقی کے بامِ عروج پر پہنچ گئی: ا۔جاہلی دور، اس میں علم کی کمی تھی، رسول اللہ ﷺ آئے تو آپ نے علم کو عام کیا، تو اس علم سے دنیا ترقی کی بلندیوں تک پہنچ گئی۔

۲۔یورپ کا عہد عروج: وہ پسماندگی کی آخری منزل پر تھا، لیکن اس نے اندلس کی علمی ترقی سے استفادہ کیا تو پھر آج اسے علمی لحاظ سے سبقت حاصل ہوگئی ہے، لیکن یورپ کا علم برائے علم ہے، معرفت الٰہی سے اس کا تعلق نہیں، علامہ اقبال نے کہا تھا:

ڈھونڈنے والے ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

حضرات! امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں ایک حدیث نقل کی ہے:"أُغْدُ

عَالِماً أَوْ مُتَعَلِّماً أَوْ مُسْتَمِعاً أَوْ مُحِبّاً، وَلَا تَكُنِ الْخَامِسَةَ فَتَهْلِك، وَالْخَامِسَةُ أَنْ تُبْغِضَ الْعِلْمَ وَأَهْلَهُ." (بیہقی،شعب الایمان:۱۷۰۹)(عالم بنو، یا علم سیکھنے والے بنو، یا سننے والے بنو یا علم سے تعلق رکھنے والے بنو، اور پانچویں نہ بنو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے، اور وہ یہ کہ تم علم اور علماء سے دشمنی رکھو)

حضرات! قرآن اور علم میں گہرا تعلق ہے، کیوں کہ اس کی ابتدائی آیات میں علم کے حاصل کرنے اور اس کے تحفظ وفروغ کے سب سے مؤثر ذرائع (قرأت اور قلم) کا ذکر ملتا ہے: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق : ۱ – ۵) (آپ پڑھیئے نام سے اپنے پروردگار کے، جس نے سب کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپ قرآن پڑھا کیجئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے، جس نے انسان کو وہ سکھایا، جو وہ نہیں جانتا تھا)

علم کی نسبت قرآن کا بنیادی نکتہ ہے کہ وہ اللہ کی عظیم نعمت یا عطیہ خداوندی ہے، اس لئے اس کے حاصل کرتے ہوئے سب سے پہلے اس کا نام لیا جائے اور اسے یاد کیا جائے۔

قرآن میں مختلف مقامات پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو جہاں اور بہت ساری نعمتیں عطا کی ہیں وہیں ایک نعمت یہ عطا کی کہ اس کو ایسی قوتیں اور صلاحیت بخشیں ہیں کہ جن سے کام لے کر وہ علم حاصل کرے، اور اسے محفوظ رکھ سکے۔

علم اس لیے ہے کہ انسان اللہ کو یاد کرے، اس کا شکر بجالائے، یہی معرفتِ الٰہی ہے، لیکن افسوس کہ انسان اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے اور اللہ کو بھی بھول جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ، اُولٰئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ." (الحشر: ۱۹) (اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، سو اللہ نے خود ان کی جانوں کو ان سے بھلا دیا، یہی لوگ تو نافرمان ہیں)

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

تربیت اولاد میں
عملی نمونہ پیش کرنے کی ضرورت

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا، وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ." (النحل: ۷۸)

(اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے، پھر اس نے تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں، اور دل دیئے، تا کہ تم شکر گزار بنو)

حضرات! اولاد اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا عظیم عطیہ ہیں، یہ ماں باپ کی دعاؤں کا عکس جمیل اور ان کی تمناؤں کا محور ہیں، مستقبل میں ان کی امیدوں کا مرکز ہیں، یہ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں، اور بڑھاپے میں ان کا بہترین سہارا ہیں، یہ دھلی دھلائی فطرت پر والدین کے حوالہ کئے گئے ہیں، والدین کی ذمہ داری ہے کہ ان جاندار کلیوں کی ایسی پرورش کریں کہ رنگ وبو کی دلآویزی میں فرق نہ آنے پائے، اسی تناظر میں کہا گیا ہے کہ "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَاراً، وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہلِ خانہ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے)

حضرات! اپنے آپ کو اور اہلِ خانہ کو بچانا دو طریقے سے ہوتا ہے:

(۱) ایک ظاہری خطرات اور مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچانا، ہر شخص اس کے لئے پوری جتن کرتا ہے، سرمایہ اکٹھا کرتا ہے، بینک بیلنس کرتا ہے کہ اگر کوئی پریشانی ہوئی تو

اس سے حفاظت ہوگی۔

(۲) معنوی بچاؤ یہ ہے کہ اپنے کو حقیقی سکون اور آرام دہ چیزوں کے قریب کرنا، اگر یہ ہوا تو پوری زندگی صحیح رُخ پر اپنا سفر کرتی ہے، یہ دنیا بھی جنت کا نمونہ پیش کرتی ہے، اور آخرت تو سنور ہی جاتی ہے، ظاہری بچاؤ کی فکر تو ہر ایک کو دامن گیر ہوتی ہے، لیکن معنوی بچاؤ کی فکر اللہ کے نیک بندوں ہی کو ہوا کرتی ہے، قرآن نے اس کی ایک مثال دی ہے: پہلے ہی پارے میں ہے: "اَمْ کُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" (البقرة: ۱۲۳) (بھلا کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کو موت آپہونچی اور اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے) حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہیں، ان کے والد اسحاق نبی اور ان کے دادا ابراہیم نبی ہیں، وہ آخر میں وصیت کرنے سے غافل نہیں ہوئے، لیکن وصیت اس کی کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے یعنی تمہارا عقیدہ کیا ہو، تمہارا دین کیا ہو، یہ وہ فکر ہے جو ہر صاحب ایمان کو بے چین کرنی چاہیے، اگر نسلِ نو کی تربیت اور ایمان کی فکر نہیں ہوئی، تو صدیوں اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

حضرات! قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ ہے، اس میں آیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کو پکڑا اور اس کی جان لے لی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا، چوں کہ حضرت خضر علیہ السلام تکوینی علوم کے ماہر تھے اور وہ لڑکا اپنے ایمان والے والدین کے لیے خطرہ بننے والا تھا، اس لئے اس کو راستے سے ہٹا دیا، یہ ایک واقعہ ہے، فقہی اعتبار سے اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اس طرح لڑکوں کو قتل کردیا جائے، حرام ہے۔ لیکن قرآن کریم میں اس کا تذکرہ ہے، اس کا پیغام یہ ہے کہ ایمان اتنی اہم چیز ہے کہ اس کے لیے جان بھی چلی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں۔

حضرات! والدین میں ہر دو فرد اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ وہ اپنے ماتحتوں کی فکر کریں، اور اس سلسلہ میں مشہور ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دربار میں ایک شخص آیا اور

اس نے اپنے لڑکے کی شکایت کی، حضرت عمر فاروقؓ نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تم اپنے والد کا حق نہیں ادا کرتے ہو، اس نے برجستہ کہا کہ امیر المؤمنین! انھوں نے میرا حق ادا نہیں کیا، میرے ان پر تین حق تھے: اچھا نام رکھنا، مجھے تعلیم دینا اور اچھی ماں کا انتخاب کرنا ہے، انھوں نے میرے نام گبریلا رکھا، اور ایک بداخلاق عورت سے شادی کی، وہی میری ماں ہے، اور تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی، حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی والد نے اپنی اولاد کو حسن ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا۔ (سنن ترمذی: ۴۹۷۷)

بچوں کی تربیت یہ ہے کہ جب وہ سات سال کے ہوں تو ان کو نماز کی تلقین کی جائے اور جب ۱۰ سال کے ہو جائیں اور کوتاہی کریں تو تنبیہ کی جائے، اور ان کے بستر الگ کیے جائیں (سنن ابوداود، بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاص: حدیث ۴۹۵)

حضرات! تربیت اولاد میں بنیادی بات یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کے لیے نمونہ بنیں، بچوں کو صرف ہدایت نہ کریں کہ نماز کی پابندی کرو، اور خود اس سے دور رہیں، اسی طرح ماں بچے سے کہے کہ جھوٹ نہ بولو اور دسیوں مرتبہ جھوٹ بولے، اور دوسری بات اولاد کے ساتھ والدین کی رفاقت وصحبت زیادہ ہونی چاہیے، ہوتا یہ ہے کہ صبح تڑکے بچہ اسکول جارہا ہے تو باپ سو رہے ہیں اور دوپہر میں بچہ گھر آتا ہے تو باپ آفس میں ہیں، تیسری بات یہ کہ اسلامی آداب اور اسلامی تعلیم کا انتظام کی جائے، اس کے بغیر بچہ صحیح رخ پر نہیں چل سکتا۔

اس وقت سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بچوں کے سامنے متضاد زندگی ہے، وہ گھر میں کچھ اور دیکھتے ہیں اور باہر کچھ اور، اگر یکسانیت ہو تو یہ مسائل دور ہوں، آج کل جب کہ اسکول اور کالجزوں کے نتائج آرہے ہیں اور ہم نے اپنے بچوں کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ اسکول کا انتظام کیا ہے، غور کیا جائے کہ کیا ہم نے ان کو جہنم سے بچانے کا انتظام کیا یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ توفیقات سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

اولاد کی تربیت: چند تدبیریں

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد ! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم : "الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَاباً وَّخَيْرٌ أَمَلاً ." (الكهف : ٤٦) (مال اور اولاد تو دنیوی زندگی کی زینت ہیں یعنی اگر انہیں خدا پرستی اور خدا طلبی کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو یہ مرنے کے بعد بھی کام نہیں آتے، اور نیکیاں باقی رہنے والی ہیں، وہی بہتر ہے آپ کے پروردگار کے یہاں اچھے بدلہ کے لحاظ سے، اور وہی بہتر ہے توقعات کے لحاظ سے بھی)

حضرات! اولاد اللہ کی نعمت اور اس کا عظیم عطیہ ہیں، وہ ماں باپ کی دعاؤں کا عکس ہیں، وہ ان کے مستقبل کا محور ہیں، ان کی دعاؤں کا مرکز ہیں، وہ دل کا نور اور دلوں کا سرور ہیں، وہ بڑھاپے کا بہترین سہارا ہیں، وہ گھر اور خاندان کی رونق وزینت ہیں، وہ دھلے دھلائے فطرت پر والدین کے سپرد کیے گئے ہیں، والدین کی ذمہ داری ہے کہ ان جاندار کلیوں کی ایسی تربیت کریں کہ ان کے رنگ و بو میں فرق نہ آنے پائے، صحیح بخاری میں ہے، حضرت ابوھریرہؓ راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا: ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اس کے والدین اس کو یا تو یہودی بنا دیتے ہیں، یا عیسائی بنا دیتے ہیں یا مجوسی آگ کا پجاری، اس حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ اولاد کے بگڑنے اور بننے کی ساری ذمہ داری والدین پر ہے، وہ اپنی تربیت سے نیک اور صالح بناتے ہیں اور وہی اپنی غفلت سے ان کی بربادی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

حضرات! تربیت اولاد کے سلسلہ میں اسلام نے پوری رہنمائی کی ہے، اس کا حکم ہے کہ بچہ کی جب پیدائش ہو تو اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے، اور ساتویں دن اس کی طرف سے عقیقہ کیا جائے، اور ساتویں دن ممکن نہ ہو تو چودھویں دن یا اکیسویں دن یا زندگی میں جب ممکن ہو تو عقیقہ کریں، عقیقہ کرنے سے بچہ ہر قسم کے شرور وفتن سے محفوظ ہو جاتا ہے، تیسرا کام یہ کہ ان کا اچھا نام رکھا جائے۔

حضرات! کائنات میں ہر چیز کا ایک نام ہے، اور یہ نام اس کی حقیقت اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جمادات، نباتات، حیوانات، انسان یہاں تک کہ فرشتوں کے بھی نام متعین فرما دیئے ہیں، خود اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جن کے متعلق یہ آیا ہے کہ ان ناموں سے پکارو، سورۂ اعراف میں ہے: "وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا، وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَائِهٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔" (الأعراف :۱۸۰) (اور اللہ کے بہترین نام ہیں، اللہ کو انہی ناموں سے پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اللہ کے نام میں کج روی اختیار کرتے ہیں، وہ اپنے کئے کی سزا پائیں گے)

حضرات! بچوں کا پیارا نام رکھنا اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے، قرآن کریم میں آیا ہے: "یٰا زَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ اسْمُهٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا" (مریم:۷) (اے زکریا! ہم تم کو بشارت دیتے ہیں ایک لڑکے کی اس کا نام یحیٰ ہوگا، ہم نے اس کے قبل کسی کو اس کا ہم نام نہیں بنایا) اور سنن ابوداود میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپ کے ناموں سے پکارا جائے گا، اس لئے تم اچھے نام رکھو۔

ناموں میں سب سے اچھے نام وہ ہیں جن میں اللہ کی تعریف اور اس کی بندگی کا اظہار ہوتا ہو، صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناموں میں بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں، حضور ﷺ نے اپنے صاحبزادے کا نام عبد اللہ

رکھا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کا نام عبد اللہ رکھا، حضرت انسؓ کے بھائی کا نام عبد اللہ تھا، علامہ ابن صلاح کہتے ہیں: ۲۲۰ر صحابہ کے نام عبد اللہ تھے۔

اس کے بعد وہ نام ہیں، جن کے نام انبیاء کرام کے نام پر ہوں، ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے انبیاء کرام کے ناموں پر نام رکھنے کی تاکید فرمائی، اپنے صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے بچے کا نام ابراہیم رکھا، حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کے بچے کا نام یوسف رکھا۔

حضرات! ماں باپ کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچے کی تربیت کی فکر کریں، جس طرح اس کی مادی ضروریات کی فکر کی جاتی ہے، اسی طرح اس کی معنوی ضروریات کی بھی فکر کی جائے، دیکھا جائے کہ وہ نماز کی عمر کو پہونچ گیا ہے اور وہ نماز پڑھ رہا ہے یا نہیں، اس سے بڑی بات یہ ہے کہ خود نمونہ پیش کریں، ماں باپ نماز کے پابند ہوں گے، تو اس کا اثر بچے پر پڑے گا، حدیث پاک میں آیا ہے: "مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَداً مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ۔" (کسی باپ نے اپنی اولاد کو حسن ادب سے زیادہ اچھی دولت نہیں دی)

اس تناظر میں قرآن کریم کی یہ آیت پڑھئے: "اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا، وَالْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَاباً وَخَیْرٌ اَمَلاً۔"

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ
املاک بھی، اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
باطل کے لئے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا نعرۂ تکبیر بھی فتنہ

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَاراً." (التحريم:٦)

(اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے)

حضرات! انسان اس کائنات میں اللہ کی ایک عظیم مخلوق ہے، خلاّق ازل نے اسے بے شمار خوبیوں کا مجموعہ بنایا اور خلافت ارضی کے منصب سے سرفراز فرمایا، اور علم ہی کو اس کا ذریعہ بنایا ہے، علم انسان کا زیور ہے، بلکہ اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے، علم کے ذریعہ آسمان وزمین کا رشتہ قائم ہوا، اور انسان نے کائنات کو تابع کرنے کا فن سیکھا، علم بحر ناپیدا کنار ہے، لیکن بنیادی علم وہ ہے، جس سے اللہ کی معرفت وابستہ ہے: توحید، رسالت، آخرت، علم کی وہ اساس ہیں، جن سے علوم کی شجر طوبیٰ نکلتی ہے۔

حضرات! بنیادی تعلیم کی مثال غذا کی طرح ہے، جس طرح غذا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح عقیدۂ توحید کے بغیر اس کا روحانی وجود نامکمل ہے، یہ تعلیم مکتب کے ذریعہ بآسانی عام ہو رہی ہے، موجودہ دور میں مکاتب کا وسیع پیمانہ پر تسلسل امید افزا امر ہے، جس سے نئی نسل کے ایمان کی حفاظت ہو رہی ہے، آج سے تقریباً ۶۰ رسال پہلے نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کے تحفظ کی ایک منصوبہ بند کوشش قاضی محمد عدیل عباسیؒ کے ذریعہ ہوئی تھی، اس کی سرپرستی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے تاحیات کی، جس کے اچھے نتائج سامنے آئے، اور نئی نسل کی بنیادی تعلیم کا نظام ''دینی تعلیمی کونسل'' کی شکل میں وجود میں آیا، یہ کارواں آج بھی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

العالی کی قیادت میں رواں دواں ہے، ضرورت ہے کہ شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ اس نظام کو عام کیا جائے، بحمد اللہ اس کوشش کا اثر یہ ہوا کہ اسی کام کو دوسرے حضرات نے مختلف عنوانات سے شروع کیا، اور آج بھی مسجدوں اور مکتبوں میں یہ کام بحسن وخوبی انجام پا رہا ہے، اللهم زد فزد.

حضرات! تعلیم کی افادیت اور اثر انگیزی ہر زمانہ میں تسلیم شدہ رہی ہے، ذہن سازی، نسل نو کی تشکیل اور افکار کی ترسیل واشاعت میں اس کا کردار بے مثال ہے، کہنے والے نے صحیح کہا ہے:

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مغرب نے اس حربہ کو بڑے زور وشور سے استعمال کیا، جس سے وہ فاتح قوم کی حیثیت سے آگے بڑھ رہا ہے۔

حضرات! لارڈ میکالے نے ایک تعلیمی نظام بنایا تھا، جس کا حاصل یہ تھا کہ جسم مشرقی ہو، لیکن ذہن مغربی، اس کے بالمقابل ہمارے اسلاف نے کتاب وسنت کی روشنی میں ایک جامع نظام تعلیم بنایا، اس کا ثمرہ یہ تھا کہ جسم مشرقی اور ذہن اسلامی اور مذہبی، اس طرح اسلاف کا نظام تعلیم انسان کو اس کی انسانیت پر لانے سے عبارت ہے، یہ نظام تعلیم دینی مدارس میں رائج ہے، کیونکہ وہ انسان کو اللہ سے وابستہ کرتا ہے، مقصد تخلیق سے جوڑتا ہے، اس طرح مدارس کا وجود انسان کی بنیادی ضرورت کی تکمیل ہے، جس طرح فرد کی خودکشی ہوتی ہے، اسی طرح جماعت کی خودکشی ہوتی ہے، اور جس طرح جسمانی موت ہوتی ہے، اسی طرح روحانی موت ہوتی ہے، اور یہ روحانی موت انسان کا اپنے مالک حقیقی کو بھول جانا ہے، ایمان کی اہمیت وعظمت کا اندازہ حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ایک بچہ کو والدین کے ایمان کے لئے فتنہ بننے کی وجہ سے مار ڈالا۔

ظاہر ہے کہ ایسا عمل ہمارے لئے جائز نہیں، لیکن قرآن میں اس کے ذکر کا مقصد

ایمان کی اہمیت وعظمت کو دلوں میں پیوست کرنا ہے، اور دوسری طرف والدین کے ایمان کی برکت یہ ہوئی کہ ضائع ہونے والا خزانہ بچالیا گیا، اور گرتی دیوار کی مرمت کی گئی۔

حضرات! انسان کا کمال یہ نہیں کہ وہ سمندروں میں سفر کرے، فضاؤں میں اڑے، نئی نئی ایجادات پیش کرے، بلکہ اس کا امتیاز اس میں ہے کہ وہ اپنی انسانیت کو باقی رکھتے ہوئے اللہ کے حکموں کے مطابق زندگی گزارے، اگر یہ بنیادی سبق اس کی زندگی کا جزوِ اعظم ہے تو اس کی ترقیات، ایجادات، نئی دنیا کے برق و بخارات اس کے لئے باعث رحمت ہیں، اسی کو قرآن مجید نے "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ" سے تعبیر کیا ہے، رب کے نام سے پڑھنے کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ دنیا وآخرت میں انسان کامیاب و بامراد ہوتا ہے۔

حضرات! اس وقت دنیا کے شر وفساد کا اہم سبب علم کو بنیادی علم سے منقطع کر کے حاصل کرنا ہے، اور جب تک یہ سلسلہ قائم رہے گا، فتنہ وفساد میں اضافہ ہوتا رہے گا، صحیح راستہ یہ ہے کہ خلافت ارضی کے مشن کو علم الٰہی کی روشنی میں جاری رکھا جائے، ظاہر ہے کہ مسجدوں، مدرسوں اور مکاتب کے نظام میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے، اس لئے مکاتب کا قیام، ان کا تعاون، ان کی ضروریات کی تکمیل صرف قومی ضرورت نہیں، بلکہ مذہبی اور ایمانی تقاضا ہے: "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَاراً" (اے ایمان والو! اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)۔ ایمان کی تکمیل مسجد، مدرسہ، مکتب اور اچھے ماحول سے ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

نیک لوگوں کی صحبت نیک بناتی ہے

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أمّا بعد! فقد قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ." (التوبة: ١١٩) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو)۔

حضرات! کامیاب زندگی گذارنے کے لئے عام طور پر لوگ تین چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں: صحت، دولت اور علم، لیکن ایک چوتھی چیز بھی ہے، اور وہ ہے اچھے لوگوں کی رفاقت، اگر کسی کو صحت، دولت، علم حاصل ہے، لیکن اچھے لوگوں کی رفاقت حاصل نہیں تو وہ زندگی کا پورا لطف اٹھا نہیں سکتا، قرآن کریم نے بھی اچھی رفاقت کی تائید کی ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچوں کے ساتھ رہو، اور قرآن نے برے لوگوں کی رفاقت سے دور رہنے کی تلقین کی ہے: "وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" (هود: ١١٣)، اس آیت سے معلوم ہوا کہ برے لوگوں کی صحبت سے بچنا واجب ہے، سوائے کسی مجبوری کے کہ ان سے ملنا پڑے، قیامت کے دن بری صحبت والے اپنی دوستی پر روئیں گے، اور کہیں گے کہ اے کاش! ہم نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا، جہنم میں جانے والے کہیں گے کہ اے اللہ! ہم سے پہلے جو تھے انہوں نے ہم کو خراب کیا، ان کو دوہرا عذاب دیجئے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: دونوں کے لئے دوہرا عذاب ہے، کیونکہ تم نے ان کی صحبت اختیار کر کے اپنے کو خراب کیا۔

مسند احمد، ترمذی، سنن ابی داود میں ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ فرمایا: کسی غیر مسلم کو اپنا دوست نہ بناؤ، اور تمہارا مال بطور دوستی صرف متقی کھائے، اور یہ بھی فرمایا: انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو اس کو دوست بنانے سے پہلے خوب غور کر لینا چاہئے کہ کس کو دوست بنا رہا ہے؟

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: جس کی رفاقت اختیار کی جائے اس میں پانچ چیزیں ہونی چاہئے: (۱) عقل مند ہو (۲) اس کے اخلاق اچھے ہوں (۳) گنہگار نہ ہو (۴) بدعتی نہ ہو (۵) دنیا کمانے کا حریص نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے مجلسی دوستوں میں کون بہتر لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: مَنْ ذَكَّرَكُمْ بِاللّٰهِ رُؤْيَتُهُ، وَزَادَ فِيْ عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ، وَذَكَّرَكُمْ بِالْآخِرَةِ عَمَلُهُ (شعب الایمان، بیھقی: ٩٤٤٦) (جن کو دیکھنے سے اللہ یاد آئے، جن کی گفتگو سے علم میں اضافہ ہو، اور جن کا عمل آخرت کی یاد دلائے) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر عرض کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تیاری کی ہے؟ اس نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کی محبت۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کے ساتھ ہوگے، جس سے تم کو محبت ہوگی (صحیح مسلم)

حضرات! صحبت کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ اچھے لوگوں کے پاس بیٹھنے والوں کی مثال عطر فروش کی طرح ہے، اور برے لوگوں کے پاس بیٹھنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بھٹی والے کے پاس بیٹھے، یا تو اس کی آگ کپڑے جلائے گی یا اس کا دھواں ملے گا (صحیح بخاری، وصحیح مسلم)۔ اس لئے اچھا بننے کے لئے اچھے لوگوں کی صحبت میں رہنا ضروری ہے، کیونکہ صالح رفقاء ذکر وعبادت میں بھی مددگار رہتے ہیں، قرآن میں حضرت موسی علیہ السلام کی دعاء میں آیا ہے: وَأَشْرِكْهُ فِيْ أَمْرِيْ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْراً وَنَذْكُرَكَ كَثِيْراً (طہ:۳۲-۳۴) (اے اللہ! ہارون کو میرا شریک بنادے، تاکہ ہم آپ کی

تسبیح زیادہ کریں اور ذکر بھی زیادہ کریں)، بزرگوں سے منقول ہے کہ صلحاء کی قربت حسن خاتمہ کی دلیل ہے۔

حضرات! صحبت اتنی اہم چیز ہے کہ صحابہ کرامؓ کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے، صحبت کی دو شرطیں ہیں: ایک عقیدت، دوسرے مرشدِ کامل کا اتباع اور اس کا پورا مطیع ہونا، کیونکہ کسی بڑے کے پاس بھی انسان رہے اور خودرائی سے باز نہ آئے تو سوائے محرومی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، اس لئے دل کو آباد رکھنے کے لئے صحبت محبت کے ساتھ ہونا ضروری ہے، کثرت ذکر بھی ہونی چاہئے اور خودرائی سے پرہیز ہونی چاہئے۔ کسی صاحب دل کا شعر ہے:

اللہ اللہ ہے تو یارو جان ہے
ورنہ یارو جان بھی بے جان ہے

حضرات! میں نے شروع میں قرآن کریم کی آیت پڑھی تھی، وہ آیت غزوۂ تبوک کے موقع پر اتری، اس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کو اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے نہ کہ منافقین کی، یہ ایک عمومی حکم ہے، کیونکہ انسان پر صحبت اور ہمنشینی کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے، جو لوگ اچھے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان میں دین کی طلب پیدا ہوتی ہے، برائیوں سے نفرت ہوتی ہے، مال کی محبت کم ہوتی ہے، اور جو گنہگاروں کے ساتھ رہتے ہیں دنیا ہی ان کی منزل مقصود بن جاتی ہے، اور برائیاں ان کو ہلکی لگنے لگتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سچوں کی صحبت نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

لقمان علیہ السلام کی نصیحتیں اوران کا تربیتی پہلو

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد ، فقد قال الله تعالى : ولقد آتينا لقمان الحكمة أن اشكر لله (لقمان : ۔۱۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے حضرت لقمان کو حکمت دی کہ اللہ کا شکر ادا کریں۔

محترم حضرات ! سورہ لقمان قرآن مجید کے اکیسویں پارے میں ہے ،اس میں چار رکوع اور چونتیس آیتیں ہیں ،اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے مضامین کو کھول کھول کر بیان کردیا گیا ہے، شرک کی حقیقت، والدین کے ساتھ حسن سلوک، ہر چھوٹی بڑی چیز پر اللہ کی نظر، نماز قائم کرنا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، تواضع اختیار کرنا، تکبر سے بچنا، اور درمیانی چال چلنا، آواز ہلکی رکھنا بھی ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ پانچ چیزوں کا علم صرف اللہ کے پاس ہے: قیامت کب آئے گی، باش کب ہوگی، ماں کے کے پیٹ کیا ہے؟ کل کیا ہوگا، اور کس کی موت کہاں آئے گی (لقمان:٣٤)

محترم حضرات! لقمان علیہ السلام کون تھے؟ قرآن تو اس سلسلہ میں خاموش ہے، لیکن تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے، بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ آزر کی اولاد میں تھے، لقمان بن باعورا نام ذکر کیا جاتا ہے، ان کی عمر ایک ہزار سال بتائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت و دانائی عطا فرمائی تھی، وہ نبی نہیں تھے، لیکن ان کا دانائی ضرب المثل ہے، تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے آقا نے ان کو ایک بکری دی اور کہا کہ لقمان اس کو ذبح کرو اور اس کی سب سے اچھی چیز لے کر آؤ، وہ گئے اور ذبح کیا اور دل اور زبان لے کر آئے، پھر کچھ دنوں کے بعد ان کے آقا نے ان کو بکری دی اور کہا کہ سے سب سے خراب چیز لے کر آؤ، وہ گئے، ذبح کیا اور زبان اور دل

کے کے آئے، ان کے آقا نے کہا کہ تم سے اچھی لانے کو کہا تو تم زبان اور دل لے کر آئے اور اچھی چیز لانے کو کہا تو زبان اور دل لے کر آئے تو انہوں نے جواب دیا کہ زبان اور دل اگر دونوں پاک ہوں کو ان سے اچھی کوئی چیز نہیں، اور اگر زبان اور دل گندے ہوں تو ان سے خراب کوئی چیز نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر) ،عربی شاعر کہتا ہے: إنما المرء بأصغريه وكل امرء رهن بما لديه (انسان اپنی دو چھوٹی چیزوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے، اور ہر شخص ہو وہی ملے گا جو اس نے کیا ہے) ، تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ نے حکمت و دانائی کہاں سے سیکھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ سچائی، امانت داری، لغو باتوں سے اجتناب اور خاموشی سے۔

حضرات! لقمان علیہ السلام کی جو نصیحتیں قرآن میں مذکور ہیں: ان کی دو قسمیں ہیں: (١) اللہ کا حق، (٢) دوسرے بندوں کا حق ۔ جہاں تک اللہ کے حق کا تعلق ہے تو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ اللہ کو ایک ماننا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا ، کیونکہ شرک کرنا ایک بڑا ظلم ہے، اسی عقیدہ کو حضرت لقمان میں دوسرے الفاظ میں اس طرح سمجھایا، کہ دیکھو دنیا میں ہر چیز اللہ کے کرنے سے ہوتی ہے، ایک پتہ ہل نہیں سکتا، ایک ذرہ اڑ نہیں سکتا، ایک قطرہ ٹپک نہیں سکتا، جب تک اللہ کا اشارہ نہ ہو، اگر زمین تہوں میں، آسمان کی بلندیوں میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر اگر کوئی چیز ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی واقف ہے: مسند احمد کی روایت ہے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لو أن أحدكم يعمل عملا في صخرة صماء ليس لها باب ولا كوة ، لخرج عمله للناس كائنا ما كان (مسند احمد بروایت ابوسعید خدری)، اگر کوئی شخص بند چٹان میں بھی کوئی کام کرے جس میں کوئی دروازہ اور روشن دان نہ ہو تو بھی اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو ظاہر کردیں گے) یہ بنیادی عقیدہ ہمارے ذہنوں میں ہونا چاہئے، ہم اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھیں اور تعلیم کریں، مذاکرہ کریں اور واقعات کی روشنی میں اس عقیدہ کو مضبوط کریں، خدا کی قسم! اگر ہم نے اپنے بچوں کو وقت دیا اور ایسی باتوں کی تلقین کی تو ان شاء اللہ وہ بچہ ایسا

ہوگا کہ اللہ کی وحدانیت پر قائم رہے گا اور شرک وبت پرستی اور الحاد سے دور ہوگا۔

حضرات! دوسرا حق اللہ کے حق کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے، یاد رکھیں یہ تمام حقوق میں سب سے بڑا حق ہے، والدین جو دنیا میں ہمارے آنے کا ذریعہ ہیں، ان کی خوشی میں اللہ خوشی پوشیدہ ہے اور ان کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی پوشیدہ ہے، ان کا خیال رکھنا، اگر کافر ومشرک ہوں تب بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے، بخاری ومسلم میں ہے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میری رضاعی والدہ مکہ سے آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرسکتی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی خاطر کرو، اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ زندگی میں ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دیں اور موت کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا اور ان کے نام سے نفلی صدقات کرنا یہ دینی وا ایمانی فریضہ ہے۔ یہ دونوں حق بہت ضروری ہیں، لقمان علیہ السلام نے خاص طور پر ان دونوں حق ادا کرنے کی تلقین کی، اور ان کا اثر بیٹے پر یہ ہوا کہ بیٹا جو مشرک تھا وہ فرمانبردار ہوگیا، اور اپنے والد کا تابعدار ہوگیا ہوتو اللہ تعالی نے کہا کہ شکر ادا کرو، حضرت سفیان بن عیینہ کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ جو پانچوں نمازیں پڑھتا ہے تو گویا اس نے اللہ کا شکر ادا کیا، اور جس نے والدین کے لئے نمازوں کے بعد دعا کی تو اس نے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔

حضرات! حضرت لقمان کی نصیحتوں میں نماز قائم کرنا ہے، نماز قائم کرنے کا لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے، نما پڑھنے کا نہیں، اس کا مطلب یہ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں، اطمینان کے ساتھ نماز پڑھیں، نماز کی تلقین کرکے نماز پڑھیں تو یہ نماز پڑھنا معتبر ہے، ماشاء اللہ اس مسجد میں بڑی تعداد میں لوگ نما پڑھنے آتے ہیں، اور جمعہ کی نماز کو جامع کبیر ہی میں پڑھنے کا حکم ہے، اس سے اتحاد واتفاق کا بھی اظہار ہوتا ہے، آپس کی دوریاں ختم ہوتی ہیں، اور دلوں سے رنج وعداوت دور ہوتی ہے، لیکن صفوں کو درست کرنا یہ بھی نماز کا بنیادی حصہ ہے۔ تو نماز قائم کرنے میں یہ بھی ہے کہ صفوں کی درستگی کا اہتمام کیا جائے۔

حضرات! حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں میں یہ بھی ہے کہ اچھی بات کا حکم

دینا اور بری بات سے روکنا، یاد رکھئے، امر بالمعروف کا سب سے اچھا عمل ہے کہ انسان عملی نمونہ پیش کرے، عملی نمونے سے جس قدر مؤثر انداز میں دعوت کا کام ہوتا ہے، اس سے بہتر کسی اور ذریعہ سے وہ نہیں سکتا، دعوت اور تبلیغ کا کام گھر ہی سے کرنا چاہئے، سیرت کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشتہ داروں کو کھانے پر مدعو کیا اور پھر اپنی بات پیش کی، گھر میں بچوں کو لے کر بیٹھنا اور تعلیم کرنا اور ان کو وقت دینا اور عملی نمونہ کے ذریعہ ان کی تربیت کرنا یہ سب امر بالمعروف میں داخل ہے، اور خوش اسلوبی سے ان کو غلط کام سے روکنا بھی ضروری ہے، ابھی میں تفسیر دیکھ رہا تھا تو اس میں سورہ مائدہ کی اس آیت لو لا ينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الاثم، لبئس ما كانوا يصنعون (المائدة) کی تفسیر میں البحر المحیط کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یوشع بن نون کی قوم میں ایک لاکھ ہلاک کئے گئے، چالیس ہزار وہ تھے، جو اپنے طور پر تو ٹھیک تھے، لیکن لوگوں کو صحیح بات کی تلقین نہیں کرتے تھے، امر بالمعروف میں ترتیب ہے کہ اگر برائی ہاتھ سے دور کرسکتا ہے تو ہاتھ سے دور کرے، زبان سے کرسکتا ہے تو زبان سے دور کرے اور آخری درجہ ہے کہ دل سے تو برا تو سمجھے ورنہ ایمان ہی نہیں ہوگا۔

حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں میں یہ ہے ناگوار باتوں پر صبر کرنا، (انما يوفى الصابرون أجرهم بغير حساب) خوش اخلاقی سے ملنا (تبسمك فى وجه أخيك صدقة) ، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا (متکبرانہ چال اللہ کو سخت ناپسند ہے، (تین لوگ ایسے ہیں، جن پر اللہ رحمت کی نظر نہیں کریں گے، جھوٹی قسم کھا کر سامان کو بیچنے والا، احسان جتانے والا، ٹخنوں سے نیچے اپنے لباس کو لٹکانے والا) اور آواز کو پست رکھنا، یہ سب امور ایسے ہیں جن سے ایک پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ معاشرہ میں ان امور پر توجہ دی جائے اور اپنے حقوق کو پورے طور پر ادا کیا جائے، غرض یہ تمام باتیں اور نصیحتیں قرآن کریم میں مذکور ہیں، ان پر عمل کرنا ہی ہماری زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

اصلاح معاشرہ

اسلامی آداب: کتاب وسنت کی روشنی میں

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و صحبہ أجمعین، أمّا بعد! فقد قال اللّٰہ تعالی: أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم: "کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ." (الأعراف : ۳۱)
(کھاؤ، پیو، لیکن اسراف سے کام نہ لو، بے شک اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا)

حضرات! اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے مذاہب کی بنیاد اخلاق پر ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے آج تک جتنے نبی اور رسول آئے سب کی تعلیم یہ تھی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے، چونکہ آپ ﷺ کی بعثت تکمیلی تھی، یعنی نبیوں کے سلسلہ کو مکمل کرنے والی تھی، اس لئے آپ نے زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی جامع تعلیمات سے بھر دیا۔

رسول پاک ﷺ کے تذکرے میں آتا ہے کہ وہ حکمت کی باتیں بتاتے ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ حکمت سے اخلاق حسنہ اور اچھی عادتیں مراد لیتے ہیں، اخلاق کے باب میں کچھ نیکیاں میں ہیں، تو کچھ حقوق بھی، کچھ آداب بھی ہیں تو کچھ وہ عادتیں بھی جن سے بچنے کی تاکید آئی ہے۔

حضرات! اسلام دین فطرت ہے، اس نے زندگی کے ضروری آداب بتائے ہیں، اور تمام انبیاء نے ان کی پیروی کی ہے، سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار چیزیں انبیاء کرام کی سنت ہیں: حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، نکاح کرنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی بنیادی علامتوں میں مہمان نوازی بھی ہے، رسول

اکرم ﷺ نے دس چیزوں کو فطرت میں شمار فرمایا ہے: ۱۔ مونچھ کٹوانا ۲۔ داڑھی بڑھوانا ۳۔ ناخن ترشوانا ۴۔ بغل کے بال کاٹنا ۵۔ زیر ناف بال صاف کرنا ۶۔ مسواک کرنا ۷۔ کلی کرنا۔ ۸۔ ناک میں پانی ڈالنا۔ ۹۔ انگلیوں کے درمیان خلال کرنا ۱۰۔ پانی سے استنجا کرنا۔ دینی کتابوں میں اسلامی آداب کا پورا باب ہے: مجلس کا ادب، ملاقات کا ادب، گفتگو کا ادب، چلنے کا ادب، سفر کا ادب، سونے کا ادب، لباس کا ادب، خوشی کا ادب، ماتم کا ادب، انہیں آداب میں کھانے پینے کے بھی آداب ہے۔

حضرات! کھانا پینا ایک انسانی ضرورت ہے، اس سے کوئی شخص جدا نہیں ہوسکتا، ایک مسلمان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کھانا پینا اصل نہیں، بلکہ کھانا ایک ذریعہ ہے، جس سے صحت حاصل ہوتی ہے، تاکہ اللہ کی بندگی ہوسکے، صحابہ کرام کا قول منقول ہے: نَحْنُ قَوْمٌ لَا نَأْكُلُ حَتَّى نَجُوعَ، فَإِذَا أَكَلْنَا فَلَا نَشْبَعُ (ہم ایسی قوم ہیں اُس وقت تک نہیں کھاتے، جب تک بھوک نہ لگے، اور جب کھاتے ہیں تو سیر ہو کر نہیں کھاتے) اسی کو فارسی محاورہ میں کہا گیا ہے: خوردن برائے زیستن (یعنی زندگی باقی رکھنے کے لئے کھانا) نہ کہ زیستن برائے خوردن (کھانے اور عیش کرنے کے لئے زندہ رہنا)۔

ایک صاحب نے مکان بنوایا اور اس میں کھڑکیاں لگوائیں، پوچھا گیا کہ کھڑکیاں کیوں لگوائیں آپ نے؟ انہوں نے کہا: تاکہ تازہ ہوا آئے، انہوں نے کہا: اے اللہ کے بندے! یہ کہنا چاہئے کہ کھڑکیاں اس وجہ سے لگوائی ہیں تاکہ اذان کی آواز آئے، ہوا تو آئے گی ہی ان شاء اللہ، مقصد اعلیٰ رکھنا چاہئے، اسی طرح کھانے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی بندگی ہوسکے، لذت کام و دہن تو اس میں ہے ہی۔

حضرات! سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حلال اور پاکیزہ غذا کا اہتمام کرے، ناجائز اور حرام کھانے کا نہیں، کیونکہ حدیث میں آیا ہے: جس جسم کی پرورش حرام سے ہوئی ہو تو جہنم کی آگ بہت تیز پکڑے گی، اور یہ بھی یاد رکھئے کہ جب تک حلال اور پاکیزہ

کھانے کا اہتمام نہیں ہوگا اس وقت تک عبادتوں میں مزا بھی نہیں آئے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا چاہئے، سنن ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جس کے ہاتھ میں چکنائی رہ جائے اور کوئی کیڑا اور جانور اسے کاٹ لے تو اسے اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہئے۔

کھانے سے پہلے بسم اللہ کہنا چاہئے، یعنی شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، اور اگر بھول جائے تو بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَ آخِرَهُ پڑھے، یعنی کھانے کے شروع اور آخر میں اللہ کا نام لیتا ہوں، بغیر بسم اللہ کے کھانا کھانا شیطان کا کھانا ہوتا ہے، اور بسم اللہ کے ساتھ کھانا ایمان والے کا کھانا ہوتا ہے، اور اس میں برکت ہوتی ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کے مہمان ہوئے، وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، چنانچہ سات بکریوں کا دودھ پی لیا، لیکن جب اسلام قبول کیا، اور بسم اللہ کے ساتھ کھانا کھانے کا طریقہ معلوم کیا اور اس کے مطابق ایک پیالہ دودھ پیا تو سیراب ہوگئے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کافر سات آدمیوں کا کھانا کھاتا ہے، اور ایمان والا صرف ایک کا۔

کھانے کے آداب میں ہے کہ کھانے سے پہلے دسترخوان بچھائے، اور اس پر کھانا رکھے، اور ٹیک نہ لگائے، اور جس طرح غلام کھانا کھاتا ہے، اس طرح کھانا کھائے، کھانا سامنے سے کھائے، اور اجتماعی طور پر کھائے، سنن ابوداود کی روایت ہے: اِجْتَمِعُوا عَلَى طَعَامِكُمْ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيهِ. خواہ مہمان ہو یا لڑکے یا خادم ان کو کھانے میں شریک کرے۔

کھانے کے آداب میں یہ بھی ہے کہ داہنے ہاتھ کی تین انگلیوں سے کھائے، چھوٹے چھوٹے لقمے بنائے، اور چبا کر کھائے، اور پلیٹ کو صاف کرے، صحیحین کی روایت ہے: اِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِيْ أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ (تمہیں نہیں معلوم کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے)

کھانے کے دوران اگر لقمہ گر جائے تو اس کو صاف کر کے کھالے، اور شیطان

کے لئے نہ چھوڑے، کھانے کے ساتھ پانی پینے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے آداب میں ہے: پانی ٹھہر ٹھہر کر پیئے، دو یا تین سانسوں میں، اس میں سیری ہوتی ہے اور اندر سے نکلنے والی گندگی پانی میں نہیں لگے گی۔

دوسرے یہ کہ بے ضرورت کھڑے ہو کر نہ کھائے اور نہ پیئے، آج کل بفے سسٹم کا رواج ہے، دعوت دینے والوں سے شرط لگانی چاہیے کہ اگر بفے سسٹم رہے گا تو ہم آپ کے یہاں آنے سے معذور ہیں۔

حضرات! میں نے شروع میں قرآن کریم کی سورۂ اعراف کی ایک آیت پڑھی تھی، اس کا مطلب یہی ہے کہ کھاؤ اور پیؤ اور اعتدال سے آگے نہ بڑھو، بے شک اللہ اعتدال سے بڑھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انسان نے اپنے پیٹ سے بری کوئی چیز نہیں بھری، اس کے لئے تو چند لقمے کافی ہیں، پیٹ کے تین حصے ہونے چاہئے: ایک کھانے کے لئے، ایک پانی کے لئے، اور ایک سانس کے لئے۔

کھانے پینے میں احتیاط اور سنت کی رعایت ان شاء اللہ انسان کو صحت مند رکھے گی، اور اس کی خلاف ورزی متعدد امراض کا ذریعہ ہوگی، اللہ تعالیٰ ہمیں سنت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

حقوق العباد: معنویت اور پیغام

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ، وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ، اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ، يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ." (المطففين: ۱۔۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ گھٹا کر دینے والوں کے لیے تباہی ہے کہ جب اوروں سے لیں تو ناپ کر پورا لیں، اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ان کو ایک بڑے بھاری دن کے لیے کھڑا کیا جائے گا، جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لئے کھڑے ہوں گے)

حضرات! دین اسلام صرف عقائد اور عبادات کا نام نہیں، بلکہ اخلاق اور معاملات سے بھی عبارت ہے، اسلام کا مطالبہ ہے کہ انسان جس طرح عقیدہ اور عبادات کی ادائیگی میں نشیط ہو، اسی طرح معاملات کو بھی بہتر بنائے۔

معاملات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت معاملات ہی سے متعلق نازل کی ہے، اور وہ سورۂ بقرہ کے اخیر میں ہے: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ" (البقرة: ۲۸۲) (جب ادھار کا معاملہ کسی مدت متعین تک کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو)

مالی معاملات کی نزاکت واہمیت ترمذی شریف کی اس روایت سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لَا تَزُوۡلُ قَدَمَا ابۡنِ آدَمَ يومَ الۡقِيَامَةِ حَتَّى يُسۡأَلَ عَنۡ خَمۡسٍ: عَنۡ عُمُرِهِ فِيۡمَا أَفۡنَاهُ، وَعَنۡ

جَسَدِهٖ فِيمَا أَبْلَاهُ، وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ، وَفِيمَا أَنْفَقَهُ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ.'' (سنن ترمذی:۲۴۱۶)(ابن آدم کے پاؤں قیامت کے دن اپنی جگہ سے نہیں ٹل سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے: عمر کس کام میں صرف کی، جسم کس کام میں استعمال کیا، مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، اور علم پر کیا عمل کیا)

حضرات! میں نے قرآن کریم کی آیت پڑھی، اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''گھٹا کر دینے والوں کے لیے تباہی ہے کہ جب وہ کسی دکان سے خریدیں، تو پورا پورا لیں، لیکن جب وہی سامان اپنی دکان پر لا کر دیں اور تولیں تو اس میں کوتاہی اور کمی کریں''، یہ ناپ تول میں کمی بیشی جس سے ہر شخص کو ہر وقت سابقہ پڑتا ہے، اس میں عام طور پر تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور اس میں غریبوں کا نقصان ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے، یہی وہ ترازو اور میزان ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم کردی ہے، ناپ تول میں کمی دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے، اور یہ بھی چوری کی ایک قسم ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم سوداگر تھی، ان کے یہاں ناپ تول میں کمی بیشی تھی، اسی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے بار بار اپنی دعوت میں اس کی تاکید کی: "اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ" (الشعراء: ۱۸۱) یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ تول میں کمی سے ایمان کی خیر و برکت جاتی رہتی ہے، اور ظاہری طور پر ایسے لوگوں کی معاشرہ میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو دس احکامات دیئے گئے تھے ان میں بھی ناپ تول میں کمی نہ کرنا تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ اسراء میں جو احکامات حکمت کے عنوان سے دیئے گئے ہیں ان میں بھی ناپ اور تول کو پورا پورا کرنا ہے۔

حضرات! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مرض کا سبب کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ ایسے لوگوں کے ذہن میں اللہ کا یقین ختم ہو جاتا ہے، اور یہ بات ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اللہ کے یہاں حساب دینا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اَلَا

يَظُنُّ أُولٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ." (کیا ان کو خیال نہیں کہ ان کو ایک بڑے بھاری دن کے لئے اکٹھا کیا جائے گا)

حضرات! تطفیف صرف یہی نہیں کہ مال اور ناپ تول میں کمی کی جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو حقوق بندوں سے متعلق کیے ہیں ان میں بھی کمی نہ کی جائے:

☆ باپ اگر اپنی اولاد کی تربیت نہیں کرتا، ان کی تعلیم کی فکر نہیں کرتا تو ویل للمطففین

☆ بیٹا اگر اپنے باپ کا کہنا نہیں مانتا تو ویل للمطففین

☆ شوہر اگر اپنی بیوی کے حقوق پامال کرتا ہے تو ویل للمطففین

☆ بیوی اگر اپنے حقوق تو خوب یاد رکھتی ہے، لیکن شوہر کے حقوق بھول جاتی ہے تو ویل للمطففین

☆ رشتہ دار ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھتے ہیں تو ویل للمطففین

☆ یتیموں، بیواؤں محتاجوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے تو ویل للمطففین

یہی وجہ ہے کہ صحیحین میں ہے: "أَتَدْرُونَ مَنِ الْمُفْلِسُ"؟ (جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا: جس کے پاس دینار و درہم نہ ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن مفلس وہ ہوگا جس نے خوب نماز پڑھی ہوگی، روزے رکھے ہوں گے، لیکن کسی کی غیبت کی ہوگی، کسی کے ساتھ بدسلوکی کی ہوگی، کسی کا مال ناجائز لیا ہوگا، کسی پر الزام لگایا ہوگا تو اس کی نیکیاں دوسروں کو دے دی جائیں گی (صحیح مسلم: ۲۵۸۱ بروایت ابوھریرۃ)

یہی وجہ ہے کہ بزرگانِ دین حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد پر بھی خصوصی توجہ دلاتے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے خاندان کے لوگوں کو تین اہم وصیتیں کی: (۱) مظلوم بن جانا، ظالم نہ بننا۔ (۲) حرام مال سے ہمیشہ بچتے رہنا، مشتبہ مال سے بھی بچتے رہنا۔ (۳) صلہ رحمی کرتے رہنا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو صراطِ مستقیم پر استقامت نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین

اصلاحِ معاشرہ

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! قال الله تعالى: "سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاها وَاَنْزَلْنَا فِيْهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ." (النور: ۱)

(یہ ایک سورت ہے کہ ہم ہی نے اس کو نازل کیا ہے اور ہم ہی نے اس کو مقرر کیا ہے، اور ہم نے اس میں کھلی ہوئی آیتیں نازل کی ہیں، تاکہ تم سمجھو)

حضرات! یہ آیت سورۂ نور کی پہلی آیت ہے، سورۂ نور مدنی سورت ہے، اس میں معاشرتی زندگی کی اہم تعلیمات آگئی ہیں، مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے مردوں کو سورۂ مائدہ اور خواتین کو سورۂ نور کی تعلیم دیا کرو، کنز العمال میں سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے بعض رفقاء کو خط لکھا کہ وہ سورۂ نساء، احزاب اور سورۂ نور کو اچھی طرح پڑھیں، وجہ ظاہر ہے کہ ان تینوں سورتوں میں معاشرتی زندگی سے متعلق بہت سے احکام آگئے ہیں۔

اس سورت میں زنا اور بدکاری کی سزا، تہمت لگانے کی شرعی سزا، زنا کی وجہ سے لعان کا حکم، گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت لینے کا حکم، نگاہ کو پست رکھنے کا حکم، عزت وآبرو کی حفاظت کا حکم، عورتوں کو غیر محرم کے سامنے زیب وزینت اختیار کرنے کا حکم، شادی کرنے کا حکم، اسی طرح خادموں اور بچوں کو تین اوقات میں گھر کے اندر داخل ہوتے وقت اجازت لینے کا حکم، معذوروں اور مجبوروں کو جہاد سے مستثنیٰ رکھنے کے احکامات ذکر کئے گئے ہیں۔

حضرات! ہم میں ہر شخص کی تمنا ہے کہ ہم اچھے ہوں، ہماری اولاد اچھی ہو، ہمارے گھر والے اچھے ہوں، ہمارا معاشرہ اچھا ہو۔ ظاہر ہے کہ صرف تمناؤں اور ارادے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا، بلکہ شرعی بنیادوں پر اس کے لیے انتھک کوشش کرنی پڑتی

ہے، سورۂ نور نے اصلاحِ معاشرہ کے بنیادی اصول ہمارے سامنے ذکر کردیئے ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ ہم اپنے مخاطبین کو نیکی کا شوق دلائیں اور برائی سے نفرت ان کے دلوں میں پیدا کریں، کیوں کہ ترغیبی عمل یہ معاشرہ کی اصلاح میں بہت معاون ہے، اسوۂ رسول اکرم ﷺ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے خوف اور شوق کو موضوع بنایا، مسند احمد میں ہے، حضرت ابو مالک اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ جنت میں ایسے بالاخانے ہوں گے جن کا اندرونی منظر باہر سے نظر آئے گا اور بیرونی منظر اندر سے نظر آئے گا، ایک اعرابی کھڑا ہوا، اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ کس کے لیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "لِمَنْ أَطَابَ الْكَلَامَ، وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ، وَأَدَامَ الصِّيَامَ، وَصَلَّى بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَام" (سنن ترمذی: ۲۱۱۲) (جس نے اچھے انداز میں گفتگو کی، اور لوگوں کو کھانا کھلایا، اور روزہ رکھے اور رات میں نفلی عبادتیں کی) اور سنن ترمذی کی وہ مشہور حدیث ہے کہ کیا میں تم کو بڑے بڑے گناہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: بَلَىٰ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! (ضرور اے اللہ کے رسول)، آپ نے فرمایا: "الاشراك باللّٰه وعُقوقُ الدين" (اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا)، اور ترمذی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ جنت میں داخل کرنے والی خصلتیں کون سی ہیں؟ پھر آپ نے خود ہی بتایا: تقوى اللّٰه وحُسْنُ الخُلق (اللہ کا ڈر اور اچھے اخلاق) اور پھر پوچھا گیا کہ جہنم میں لے جانے والی چیزیں کیا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا: الفم والفرج (زبان اور شرم گاہ کی بے احتیاطی)

حضرات! اصلاحِ معاشرہ کا دوسرا اصول یہ ہے کہ نیکیوں کے کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں اور برائیوں کے ذرائع ختم کردیئے جائیں، ظاہر ہے کہ نیکیوں کے کرنے کے مواقع ہوں گے تو خود بخود ذہن نیکی کی طرف مائل ہوگا۔

اس سلسلہ میں ایک مثال مدنی معاشرہ سے دی جاسکتی ہے کہ ایسا ماحول پیدا کردیا گیا کہ ہر شخص نیکی کی طرف مائل تھا، اور برائی سے دور، شراب جب حرام ہوئی تو شراب کے ساتھ ساتھ شراب کے برتنوں اور اس کے استعمال پر پابندی لگادی گئی: "نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُزَفَّتِ وَالنَّقِيْرِ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۱۹۳۵) (رسول اللہ ﷺ نے

ہم کو شراب کے مختلف برتنوں (دباء، حنتم، مزفت اور نقیر) کے استعمال سے منع فرمایا"۔

اصلاحِ معاشرہ کا ایک اصول سزائیں ہیں، جن کے ذریعہ برائیوں پر کنٹرول پایا جاسکتا ہے، انبیاء کرام کا اسلوبِ دعوت انداز تبشیر کا ہے: انہوں نے مرحلہ وار معاشرہ کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہے، اس سلسلہ میں بہترین مثال شراب کی حرمت سے دی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے شراب یک بارگی حرام نہیں کی، بلکہ اس میں تدریجی مرحلہ اختیار کیا، اس سلسلہ کی پہلی آیت ہے: "يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا" (سورۂ البقرۃ:۲۱۹) (لوگ آپ سے شراب اور جوئے کی بابت دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں، اور ان کا گناہ ان کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے)، دوسری آیت سورۂ نساء میں ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ" (النساء: ۴۳) (اے ایمان والو! تم نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو) اور تیسری آیت سورۂ مائدہ میں ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ، فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ." (مائدۃ: ۹۰) (اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس بڑی گندی باتیں ہیں، شیطان کے کام، سو اس سے بچے رہو، تاکہ فلاح پاؤ)

حضرات! ان اصولوں کی روشنی میں اگر سورۂ نور کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں (۱) ترغیبی پہلو بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكٰوةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ، الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ، يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ، يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ، ولَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ، نُورٌ عَلَى نُورٍ، يَهْدِي اللّٰهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ، وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ." (النور: ۳۵) (اللہ ہی آسمان اور زمین کا نور ہے، اس کے نور ہدایت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے، اس میں ایک چراغ ہے، چراغ ایک قندیل میں ہے، قندیل گویا ایک چمک دار ستارہ ہے، (چراغ) روشن کیا جاتا ہے ایک نہایت مفید درخت یعنی زیتون سے جو نہ

پورب رخ ہے، نہ پچھم رخ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے، اگر چہ اسے نہ چھوئے، نور ہی نور ہے، اللہ اپنے اس نور تک جس کو چاہتا ہے، ہدایت دے دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے)

حاصل یہ ہے کہ اللہ کے نور اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کی روشنی ایسی واضح ہے کہ کسی کو ذرا بھی ہدایت کی طلب ہو تو وہ ہدایت سے محروم نہ رہ جائے۔

(۲) اسباب ووسائل اختیار کرنا:

کسی کے گھر میں بغیر اجازت اور سلام کئے داخل نہ ہو۔

اپنی نگاہوں کو پست رکھو۔

اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرو۔

وقت پر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کراؤ۔

بے پردہ عورتوں کو باہر نہ نکلنے دو۔

گھر میں جو بچے اور ملازم کام کرتے ہیں ان کو تین اوقات میں گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینی چاہیے۔

یہ ایسے آداب ہیں جن کی پابندی سے معاشرہ صالح ہوگا اور چھوڑنے سے معاشرہ خراب ہوگا۔

(۳) تیسری چیز سزائیں۔

اس سورت میں سزاؤں کا تذکرہ ہے، غیر شادی شدہ کے لیے زنا کی سزا ہے، تہمت لگانے کی سزا، وہ یہ ہے کہ اپنی بیوی کو انسان غلط عمل میں دیکھے اور اس کے پاس گواہ بھی نہ ہوں تو اس کو چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہنا پڑے گا: وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو

ظاہر ہے کہ یہ سزائیں اسلامی حکومت کے زیر سایہ ہی ہوسکتی ہیں، ہم کم سے کم دو کام ضرور کرسکتے ہیں: ترغیبی ذہن بنانا، دوسرے ایسے اسباب اور وسائل اختیار کریں جس سے معاشرہ صالح ہو اور اس میں برائیاں نہ پائی جائیں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیقات سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

لایعنی باتوں سے کیسے بچیں

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد ، فقد قال الله تعالى : قد أفلح المؤمنون الذين هم فى صلاتهم خاشعون ، والذين هم عن اللغو معرضون (المؤمنون : ١-٣) یقیناً فلاح پا گئے، وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، اور جو لغویات اور فضول باتوں سے دور رہتے ہیں۔

محترم حضرات! قرآن کریم میں ایمان والوں کے تعارف میں یہ بنیادی بات ذکر کی گئی ہے کہ وہ لغو باتوں سے دور رہتے ہیں، لغو سے مراد وہ بات اور کام ہے جو بے سود اور بے مطلب ہو، جو زندگی کے اصل مقصد سے غافل کرنے والا ہو، لغو وہ کام یا کلام ہے، جس کا کوئی دینوی فائدہ نہ ہو، لغویات کی سب سے بدترین شکل ہے کہ پوری زندگی بے مقصد گذاری جائے، اللہ تعالی کی مرضیات اور اس کی پسند و ناپسند کا کوئی خیال نہ ہو، اگر معاشرہ پر ایک نگاہ ڈالی جائے اور بغور ایک ایک فرد کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی ایک فرد نہیں، بلکہ نسلوں کی نسلیں زندگی سے دور لغو والی زندگی گذار رہی ہے، ایسی زندگی کی ترجمانی قرآن کریم نے اس طرح کی ہے: والذين كفروا يتمتعون و يأكلون كما تأكل الأنعام والنار مثوى لهم (محمد:١٢) (اور جو لوگ کافر ہیں وہ لطف اٹھاتے ہیں اور ایسے کھاتے پیتے ہیں، جیسے جانور کھاتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانہ ہے، ایک دوسری جگہ ہے: أفحسبتم أنما خلقناكم عبثا وأنكم إلينا لا ترجعون (المؤمنون:١١٥) (کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو یوں نہی پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے)۔

لغویات کی ایک شکل ہے کہ انسان جان بوجھ کر یا بلا سوچے سمجھے لغویات اور بے کار کاموں میں پڑا رہے، یہ عمل بھی اللہ کی نگاہ میں بہت زیادہ قبیح اور برا ہے، قرآن کریم کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمان کے بندے وہ ہوتے ہیں کہ إذا مروا باللغو مروا كراما (الفرقان:٧٢) (اور جب وہ کسی لغو چیز پر گذرتے ہیں تو شریف آدمیوں کی طرح گذر جاتے ہیں)، اور سورہ قصص میں ہے: وإذا سمعوا اللغو أعرضوا عنه وقالوا: لنا أعمالنا ولكم أعمالكم ، سلام عليكم لا نبتغي الجاهلين (اور جب وہ کوئی فضول بات سنتے ہیں تو وہ روگردانی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے، تم کو سلام، ہم جاہلوں کو پسند نہیں کھاتے)، جنت میں جنتی جب داخل ہوجائیں گے تو یہی آواز ہوگی کہ لا يسمعون فيها لغوا ولا تأثيما (وہ لوگ نہ لغو بات سنیں گے اور نہ گناہوں پر اکسانے والی بات) (الواقعہ:٢٥) لا يسمعون فيها لغوا ولا كذابا (النبأ:٣٥) (وہ لوگ وہاں کوئی لغو نہیں سنیں گے اور نہ کوئی جھوٹی بات)، اور سورہ غاشیہ میں ہے: لا تسمع فيها لاغية (الغاشية:١١) (وہاں کسی طرح کی لغویات نہیں سنیں گے)

حضرات! ایک مسلمان، کلمہ پڑھنے والا کبھی حرام کام اور فحش باتوں میں نہیں پڑتا، لیکن لغویات کے ذریعہ وہ آسانی سے حرام میں پڑ سکتا ہے، اس وقت لغویات کے بہت سے مظاہر سامنے آگئے ہیں: موبائل گیموں میں مصروف رہ کر کئی کئی گھنٹے ضائع کرنا، سوشل میڈیا پر کوئی پھلجھڑی چھوڑ دینا کہ لوگ اس میں ہفتوں الجھے رہتے ہیں، یہ بھی ضرورت ہے کہ حتی الامکان لغو اور فضول باتوں سے بچا جائے اور اپنے اپ کو محفوظ رکھا جائے، سنن ابن ماجہ میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه (انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے)

حضرت علی زین العابدین نے اپنی مجلسوں کو لغو سے بچانے کا ایک قیمتی اصول ذکر کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ آدمی اس کے پاس بیٹھے جو اس کے لئے دینی فائدے کا سبب بنے، یا جس کے لئے وہ دینی فائدے کا سبب بنے، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت میں ان کے پاس کچھ پرانے دوست آئے اور کہنے لگے کہ کچھ وقت ہمارے لئے

خالی کیجئے، انہوں نے بے قراری سے کہا کہ خالی وقت، خالی وقت اب کہاں ہے، خالی وقت تو اللہ کے یہاں جا کر ملے گا۔

ہارون رشید کے دربار کا مشہور واقعہ ہے، ایک مداری آیا، اس نے ایسا کرتب دکھایا کہ لوگ حیران رہ گئے، اس نے ایک سوئی زمین میں گاڑی، اور اس کے ناکے سے دس سوئیاں گزار دیں، لوگوں نے بہت تعجب کیا، اور ہارون رشید کو بھی تعجب ہوا، ہارون رشید نے اعلان کیا کہ اس کو سو دینار دیئے جائیں اور سو کوڑے لگائے جائیں، لوگوں کے پوچھنے پر ہارون رشید نے بتایا کہ سو دینار اس لئے کہ اس نے غیر معمولی کرتب اور فن کا مظاہرہ کیا، اور سو کوڑے اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو لغو اور لایعنی کام میں صرف کیا ہے۔

حضرات! قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امت محمدیہ سے پہلے اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو امامت وقیادت کو منصب عطا فرمایا تھا، اور ان کو غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، اور ان کے زمانے کی تمام قوموں پر ان کو فضیلت عطا فرمائی تھی، ایک مرتبہ ان کے یہاں قتل کا واقعہ پیش آیا، لوگوں نے حضرت موسی علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ قاتل کا پتہ چلنا چاہئے، حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تو حکم آیا کہ ایک جانور ذبح کرکے اس کے گوشت کو مقتول کے جسم پر مارا جائے تو مقتول ایک لمحہ کے لئے زندہ ہوگا، اور قاتل کی نشاندہی کردے گا، بنو اسرائیل چونکہ قیل وقال والی قوم تھی، اور وہ مطالبہ میں مخلص بھی نہ تھے، اس لئے انہوں نے جانور کے متعلق سوال پر سوال کرنا شروع کردیا، پہلے پوچھا اس کی عمر کیا ہو، اس کا رنگ کیسا ہو، اس کے اوصاف کیا کیا ہوں، لایعنی بحثوں میں پڑ گئے، جس کی وجہ سے معاملہ مشکل ہوگیا، اگر وہ قیل وقال میں نہ پڑتے اور ایک جانور ذبح کردیتے تھے تو ان کا کام آسان ہوجاتا۔ تفسیر کی کتابوں میں آیا ہے کہ بڑی مشکل سے وہ جانور ملا، اور اس کے ایک پارچے سے مقتول کے جسم پر مارا گیا اور قاتل کا پتہ چلا۔ یہ ہے کہ امت محمدیہ کے افراد کو جہاں ایک طرف سوال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ضروری دینی، شرعی باتوں کے لئے سوال کرنے کا حکم

دیا گیا ہے: فاسألوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون (الأنبياء:۴۳) اگر تمہیں حقائق نہیں معلوم ہیں تو تم علماء سے پوچھو کی تلقین کی گئی ہے وہیں دوسری طرف لایعنی سوالات اور لغویات سے بچنے کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ لوگو! اللہ نے حج فرض کیا ہے، اس کو ادا کرو، ایک صاحب بول پڑے: کیا ہر سال؟ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے، اس کے بعد فرمایا: اگر میں کہہ دیتا کہ ہر سال تو حج ہر سال فرض ہوجاتا، پھر رسول اللہ ﷺ پر یہ آیات نازل ہوئی: يأيها الذين آمنوا لا تسألوا عن أشياء إن تبد لكم تسؤكم، وإن تسألوا عنها حين ينزل القرآن تبدلكم، عفا الله عنها، والله غفور حليم (المائدة: ۱۰۱) اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر تم ان کے بارے میں اس وقت پوچھو گے جس وقت قرآن نازل ہورہا ہے تو ظاہر کردی جائیں گی، اللہ نے ان کے سوال کرنے کو معاف کردیا ہے، اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور بردبار ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ما نهيتكم عن شيئ فاجتنبوه، وما أمرتكم به فأتوا منه مااستطعتم، فإنما أهلك من كان قبلكم كثرة مسائلهم واختلافهم على أنبيائهم (جس سے میں منع کروں اس سے رک جاؤ، اور جس کا کرنے کا حکم دوں اس کو بجالاؤ، تم سے پہلے لوگوں کو اسی لئے ہلاک کیا گیا کہ انہوں نے کثرت سے سوالات کرنا شروع کیا، اور اپنے انبیاء سے بے جا اختلاف کیا۔

حضرات! لغویات سے بچنے کا سب سے آسان نسخہ ہے کہ وقت کی اہمیت اور اس کی قدر وقیمت کو پہچانا جائے، اور چوبیس گھنٹے کے عمل کو مرتب کیا جائے، اعتدال کا خیال رکھتے ہوئے اپنے کاموں کو آگے بڑھایا جائے، اور برابر محاسبہ عمل بھی جاری رہے، تاکہ کوئی کمی نہ آنے پائے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم کو اپنی مرضیات کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

اسلام کا خاندانی نظام

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، أمّا بعد : فقد قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم :

"يَآيُّهَا النَّاسُ! اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ، وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا، وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَاءً، وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهِ وَالْاَرْحَامَ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً." (النساء:۱) (اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقوی اختیار کرو، جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بکثرت مرد وعورت پھیلا دیئے، اور اللہ سے تقوی اختیار کرو، جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو، اور قرابتوں کے باب میں بھی تقویٰ اختیار کرو، بے شک اللہ تمہارے نگراں ہیں)

حضرات! اسلام کے جن پہلوؤں پر سب سے زیادہ اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں ایک اس کا نظام خاندان ہے، پورے زور وشور کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ مسلمان عورت کے لئے خاندان ایک قید خانہ ہے، وہ شوہر کی محکوم اور زیر نگیں رہتی ہے، اس کے حقوق اس سے چھین لئے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خاندان اجتماعی زندگی میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے، اس کی تشکیل مرد وعورت کے صنفی تعلق سے ہے، دنیا میں دو نظریئے پائے جاتے ہیں: ایک رہبانیت کا، دوسرے اباحیت کا، رہبانیت کا مطلب ترک دنیا، گیان دھیان کو اپنا مطمح نظر بنانا، اور اباحیت کا مطلب ہے: جنسی تسکین کے لئے مکمل آزادی کی روش، ظاہر ہے کہ اسلام شاہ راہِ اعتدال ہے، وہ نہ رہبانیت کا قائل ہے، اور نہ اباحیت کا، اس لئے اس

نے نکاح کا نظام جاری کیا ہے، تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ قانونی دائرہ میں ہوتے ہوئے اپنی زندگی گذارے :. مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (اس طرح کہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کرو، یہ نہیں کہ علانیہ زنا کرو، یا پوشیدہ بدکاری کرو) اور حدیث پاک میں آیا ہے کہ اے نوجوانو! تم میں سے جو بھی شادی کی استطاعت رکھتا ہو، اسے شادی کر لینی چاہیے۔

حضرات! نکاح کے دو مقصد بیان کئے گئے ہیں: ایک مقصد یہ ہے کہ زوجین کو ایک دوسرے سے سکون اور طمانیت حاصل ہوتی ہے اور فطری طور پر ان کے درمیان محبت و مودت اور رحم دلی وہمدردی پیدا ہوجاتی ہے: "وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً." (سورة الروم:۲۱) (اور اسی کی نشانیوں میں ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان محبت وہمدردی پیدا کردی)

دوسرا مقصد: نسل انسانی کا سلسلہ جاری رہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ." (البقرة:۱۸۷) (ازدواجی تعلق کے ذریعہ اللہ نے جو اولاد تمہارے حصہ میں رکھ دی ہے وہ طلب کرو)

اسلام نے خاندان کے دائرہ میں مرد وعورت کے یکساں مساوی حقوق دیئے ہیں اور ان کے لئے مساوی اجر کا وعدہ کیا ہے، لیکن مساوات کا مطلب کاموں میں یکسانیت نہیں ہے، بلکہ صلاحیتوں کے لحاظ سے ذمہ داریاں اور حقوق ہیں، قرآن کریم میں مرد اور عورت کو سورج اور چاند سے تشبیہ دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ سورج کا الگ کام اور دائرہ ہے اور چاند کا الگ، اسی طرح اگر مرد عورت کے دائرہ میں جائے اور عورت مرد کے دائرہ میں آئے تو خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجائے گا اور ایسا ہونا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی ادارہ کو چلانے کے لئے کاموں کی تقسیم کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ کام تقسیم نہ ہو تو اس کی سرگرمیاں ٹھپ پڑ جائیں

گی، ایک کارخانہ ہوتا ہے، اس میں کچھ لوگ کام کرتے ہیں، کچھ باہر تو کچھ اندر، اگر سارے افراد ایک ہی کام کرنے لگیں تو وہ کارخانہ چل نہیں سکے گا، اسلام نے خاندان کا نظام چلانے کے لئے گھر کے کام عورت کے حوالے کئے ہیں اور باہر کے کام مرد کے حوالے۔

حضرات! کسی بھی ادارہ کو چلانے کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کا سربراہ ہو، جو اس کے کاموں کی نگرانی کرے، اور ادارے کے افراد اس کی ماتحتی میں اپنی ذمہ داری ادا کریں، اگر ایک سے زیادہ افراد یکساں اختیارات رکھیں گے تو ہر ایک آزادانہ اپنا حکم چلائے گا، اسی لئے اسلام نے بعض مصالح کی وجہ سے نظام خاندان کی سربراہی مرد کو تفویض کی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ." (النساء: ۳۴) (مرد عورتوں کے محافظ ہیں)، لفظ قوّام کا ترجمہ حاکم سے کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اسلام میں مردوں کو حاکمانہ اختیارات حاصل ہیں، اور عورت محکوم ہے، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت میں نہ کسی کی حاکمیت ہے اور نہ محکومیت، عربی میں ''قام علیٰ'' کے معنی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے کے ہیں، قوام کا مطلب حفاظت کرنے والے، نگہبانی کرنے والے، کفالت کرنے والے، ضرورت پوری کرنے والے ہیں، یہاں عورتوں کے حقوق کی نفی نہیں کی گئی ہے، بلکہ محض انتظامی لحاظ سے ایک بڑی ذمہ داری دی گئی ہے: "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (البقرۃ:۲۲۸) (عورتوں کے اُسی طرح حقوق ہیں مردوں پر جس طرح کے اُن پر عائد ہیں مردوں کے، اور ہاں مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے) نظام خاندان میں شوہر اور بیوی کا تعلق حاکم اور محکوم کا نہیں ہوتا ہے، بلکہ شوہر کی حیثیت نگراں کی ہوتی ہے، جو بچوں اور بیوی کو تحفظ فراہم کرتا ہے، اور ان کی کفالت کرتا ہے، اسی لئے عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ شوہروں کی اطاعت کریں اور اپنی ماتحتی کو سبکی اور شرم کی بات نہ سمجھیں: "فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ." (النساء: ۳۴) (پس نیک عورتیں اطاعت شعار ہوتی ہیں، اور مردوں کے پیچھے

اللہ کی حفاظت میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں)، دوسری طرف مردوں کو حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کریں: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گذارو)

حضرات! انسان ایک دوسرے کے ساتھ رہتا ہے تو کچھ نہ کچھ ناچاقی اور اتفاق ہو ہی جاتی ہے، اگر میاں بیوی میں کوئی اَن بن ہوجائے، تو سب سے پہلے سمجھانا، دوسرے نمبر پر بستر الگ کرنا، تیسرے نمبر پر مارنا، لیکن ہلکی مار مارنا، یہ ظالمانہ اور وحشیانہ نہ ہو، یہ تینوں باتیں گھر کے اندر ہیں، اگر یہ تینوں کارگر اور مفید نہیں ہیں تو چوتھا طریقہ یہ ہے کہ دونوں طرف سے دو فیصلہ کرنے والوں کی خدمات حاصل کی جائیں اور دونوں صلح کرائیں، اور اگر یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہو تو طلاق کی نوبت آتی ہے اور طلاق بھی تین مرحلہ میں، اور اضطراری صورت میں ہی طلاق صحیح ہے، اور ہر طلاق کے بعد غور وخوض کرنے کا حق ہوتا ہے، لیکن تیسری طلاق دے دی تو واپسی کا کوئی حق نہیں۔

حضرات! اسلام سے ناواقف حضرات طلاق کے مسئلہ کو بھیانک بنا کر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طلاق مرد کے ہاتھ میں عورت کو ستانے اور دھمکانے کا ایک ہتھیار ہے، جب کہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ اسلام نے طلاق کو آخری مرحلہ میں رکھا ہے، اس سے پہلے سمجھانے، بستر الگ کرنے، ہلکی مار مارنے، دوحکموں کے ذریعہ فیصلہ کرانے کے مرحلے رکھے ہیں، پھر طلاق اور وہ بھی تین مرحلوں میں، تاکہ قانونی دشواری نہ پیش آئے۔

اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے، اس کی کئی حکمتیں ہیں: اسلامی شریعت میں نکاح کے ہر مرحلہ میں مرد کو خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے، مہر وہی ادا کرتا ہے، ولیمہ وہی کرتا ہے، اسی لئے طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، اور عورت کو بھی ایک اختیار حاصل ہے کہ مرد کے ساتھ اگر وہ رہنا نہیں چاہتی تو خلع کے ذریعہ علیحدہ ہوسکتی ہے۔

اسی طرح اسلام کو نشانہ بنایا جاتا ہے کہ میراث میں عورتوں کا حق آدھا ہے اور مرد

کا پورا، یہ بھی عورتوں کے ساتھ زیادتی ہے، اس سلسلہ میں یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں میراث سے بالکل محروم تھی، اسلام نے ان کا حصہ مقرر کیا، دوسرے یہ ہے کہ اسلام نے جن لوگوں کو میراث کا مستحق قرار دیا ہے، ان میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، چنانچہ اولین تقسیم اصحاب الفرائض کی ہے جن کے حصے متعین ہیں ان میں چار مرد ہیں (باپ، داد، اخیافی بھائی، شوہر) اور آٹھ عورتیں ہیں (ماں، دادی، بیٹی، پوتی، حقیقی بہن، علاتی بہن، بیوی)۔

میراث میں مرد اور عورت میں جو فرق رکھا گیا ہے وہ کفالت کی بنیاد پر ہے، چونکہ مرد پر زیادہ ذمہ داری ہے، اس لئے اس کا حصہ کچھ زیادہ ہے، مثال کے طور پر مرد پر اپنی بیوی، بچے، ماں، باپ کی کفالت ہے اور بیوی پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

غرض یہ کہ اسلام نے خاندان کے بارے میں جو تعلیمات دی ہیں اور افراد کے جو حقوق اور فرائض بیان کئے ہیں، اگر ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے تو بہترین خطوط پر خاندان پروان چڑھے گا، پورا قرآن اس طرح کی تعلیمات سے بھرا ہوا ہے، خاص طور سے سورۂ نساء، سورۂ احزاب، سورۂ نور، سورۂ حجرات، سورۂ طلاق کا مطالعہ اس موضوع کو اچھی طرح واضح کرے گا۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

اسلامی طرز معاشرت

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد!

"خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ." (الأعراف: ۱۹۹)

(عفو و درگزر سے کام کیجئے، بھلائی اور نیکی کی بات کہئے، اور جہالت کرنے والوں سے نہ الجھئے)

حضرات! اس آیت میں تین باتیں آگئیں، اور یہ آیت اخلاقیات کی جامع ہیں، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ، اخلاق کا دین میں کیا مرتبہ ہے، خود زبان رسالت نے گواہی دی، دین معاملات کا نام ہے، اور فرمایا: کامل ایمان والا وہ ہے، جس کے اخلاق اچھے ہوں، (سنن ابوداؤد)، اور انسان اپنے حسن خلق کی وجہ سے روزہ دار اور تہجد گزار کے درجہ کو پالیتا ہے (مسند احمد)، اور مجھ سے زیادہ قریب قیامت کے دن اچھے اخلاق والے ہوں گے۔

حضرات! دین کے دو حصے ہیں، عبادات اور اخلاق:

عبادات کا تعلق اللہ سے ہے، اور اخلاق کا تعلق بندوں سے ہے۔

اس آیت میں تین باتیں اخلاق سے متعلق ہیں، پہلا حکم عفو و درگزر کیجئے، عفو و درگزر میں حسنِ معاملہ، رحم کرنا، رواداری برتنا وغیرہ داخل ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک ایجابی اور دوسرے سلبی، اور ایک مثبت اور دوسرے منفی، اس لئے ہمیں حکم ہے کہ ہم مثبت پہلو کو اختیار کریں، اور اس کو ترجیح دیں، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد مبارک فرمایا: لَا

يَفۡرَكُ مُؤۡمِنٌ مُؤۡمِنَةً إِنۡ كَرِهَ مِنۡهَا خُلُقاً، رَضِيَ مِنۡهَا خُلُقاً آخَرَ (صحیح مسلم، بروایت ابوہریرۃ) (کوئی ایمان والا کسی ایمان والی کو علیٰحدہ نہ کرے، اگر اس کی ایک عادت ناگوار محسوس ہوتی ہے تو دوسری پسندیدہ محسوس ہوگی)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ میں اپنی شریکِ حیات کو کیوں ماروں، جب کہ وہ میرے کپڑے دھوتی ہے، میرے لئے کھانا پکاتی ہے، اور میرے بچوں کی تربیت کرتی ہے وغیرہ۔

لیکن اگر شریعت کا استہزا کیا جائے، اور عقیدہ کو کھیل بنایا جائے، تو حکمت سے اسلامی شریعت کی روشنی میں حل کرنا ضروری ہے۔

دوسرا حکم اس آیت میں یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کی بات کہیں، اس میں دو باتیں ہیں: حکمت، نصیحت، اور ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے کام کیا جائے، دوسرے یہ کہ جو بات کہی جائے شریعت کے بالکل مطابق ہے، اسی کو الدینُ النَّصیحۃُ کہا گیا ہے۔

تیسری بات: نادانوں سے اور جہالت کی بات کرنے والوں سے نہ الجھا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جب اللہ کے راستے میں مشغول رہے گا، تو ہر قسم کے لوگوں کا سامنا ہوگا، ایسے موقعوں پر حکم ہے کہ نادانوں سے نہ الجھئے۔

اس سے متعلق رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کئی واقعے ہیں:

ایک یہودی سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین مدت کے لئے قرض لیا، ابھی وقت پورا نہیں ہوا کہ وہ آیا، اور کہا کہ میرا مال دیجئے، اور ردائے مبارک اتنی زور سے کھینچا کہ گردن پر اس کا اثر پڑ گیا، اور کہا: تم عبد المطلب کی اولاد ٹال مٹول کرتے ہو، حضرت عمرؓ یہ منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اجازت دیجئے، میں اس کی گردن اڑا دوں، تو اللہ کے رسول ﷺ نے یہودی کو مسکرا کر دیکھا، حضرت عمرؓ سے کہا کہ عمر! مجھے توقع تھی کہ تم یہ کہو گے: آپ قرض دیدیجئے اور یہودی سے کہو گے کہ ادب سے مطالبہ کرو، پھر حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ اس کے قرض کی متعینہ رقم واپس کی جائے، اور بیس صاع مزید

دیئے جائیں، اس یہودی نے کہا: ہم نے تورات میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ آپ بہت حلیم اور برداشت کرنے والے ہیں، اس لئے اپنا ہاتھ بڑھایئے، پھر وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

غزوۂ حنین کے موقع پر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے اسلام قبول کرنے والوں کو سو سو اونٹ دئے، حضرت اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہما کو بھی سو سو اونٹ دیئے، ایک اعرابی آیا اور سخت لہجے میں کہا: "یَا مُحَمَّدُ! اِعۡدِلۡ فَإِنَّكَ لَمۡ تَعۡدِلۡ" (ابن ماجہ: مقدمہ، ۱۷۷) (محمد! انصاف کرو، کیوں کہ تم انصاف نہیں کر رہے ہو) اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم غصہ ہوتے، تو فطری بات تھی، لیکن حلم اور بردباری سبقت لے گئی، اور محبت بھرے لہجے میں فرمایا: اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو کون کرے گا، اس کو بھی مال دینے کا حکم دیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک قبیلہ کے سردار عیینہ بن حصن مدینہ اپنے بھتیجے حُر بن قیس کے یہاں آئے، حر بن قیس ان لوگوں میں تھے، جن کو حضرت عمر فاروقؓ سے قربت حاصل تھی، راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قریبی وہ ہوتے تھے، جو اچھے حفاظ ہوتے تھے، ایک دن عیینہ بن حصن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لئے گئے، عیینہ نے کہا: اے خطاب کے بیٹے: وہ شکایت جو میں یہاں کرنے آیا ہوں، وہ یہ کہ تم ہم کو زیادہ نہیں دیتے ہو، اور تم حق میں انصاف نہیں کرتے ہو، فاروقِ اعظم اس الزام تراشی پر سخت غصہ ہوئے، اور قصد کر لیا کہ عبرتناک سزا دیں، لیکن حضرت حر بن قیس رضی اللہ عنہ نے یہی آیت خُذِ الۡعَفۡوَ وَأۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَأَعۡرِضۡ عَنِ الۡجَاهِلِينَ پڑھی، اور کہا کہ میرے چچا جاہلوں میں سے ہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور قرآن کریم کی آیت سے سرِ مو انحراف نہیں کیا، سچ کہا ہے سیرت نگاروں نے: "كَانَ وَقَّافاً عِنۡدَ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالىٰ" (وہ اللہ کے حکم پر بہت سختی سے عمل کرنے والے تھے)

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

حیا ایمان کا ایک حصہ ہے

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال النبي ﷺ: "الإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيْمَانِ." (صحيح مسلم) (ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، سب سے افضل شعبہ لا إلـه إلاّ اللّٰہ کہنا ہے، اور سب سے کم تر شعبہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا ہے، اور حیا ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے)

حضرات! ہمارا دین چار باتوں پر قائم ہے: عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق وآداب۔ اخلاق میں حیا اور شرم کو خاص اہمیت حاصل ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ہر دین میں حسن اخلاق کی صفات میں سے ایک اہم صفت ہوتی ہے، اسلام کے حسنِ اخلاق کی اہم ترین صفت حیا ہے اور دوسری حدیث میں حیا ہی کو پورا دین کہا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر ایک انصاری آدمی کے پاس سے ہوا، جو اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، کیوں کہ حیا ایمان میں سے ہے، حیاء اور ایمان دونوں اکٹھا رہتے ہیں، اگر ان میں سے ایک ختم ہوجائے تو دوسرا بھی ختم ہوجاتا ہے۔

حضرات! حیا کسے کہتے ہیں؟ حیا اچھے اخلاق کی وہ صفت ہے، جو انسان کو قبیح، گھٹیا اور بے حیائی کے کاموں سے روکے اور اچھی باتوں پر ابھارے۔

حیا دو طرح کی ہوتی ہے: ایک فطری حیا، جو ہر انسان میں ہوتی ہے، حتی کہ چھوٹے بچوں میں ہوتی ہے، مثلاً ستر کو چھپانا، یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام نے جنت کے ایک ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا تو ان کا ستر کھل گیا اور وہ دونوں اپنے ستر کو چھپانے لگے، نئی لڑکی کا نکاح ہوتا ہے تو یہ کہا گیا کہ اس سے اجازت لی جائے، صحابہؓ نے عرض کیا: وہ تو شرماتی ہے تو کیسے اجازت لی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا خاموش رہنا ہی اجازت ہے۔

دوسری حیا: ایمانی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے حرام کاموں سے بچے، یہ حیا اس طرح آئے گی کہ انسان اللہ کا استحضار رکھے کہ اللہ دیکھ رہا ہے: "إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً" (النساء: ١) (بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے) "وَأَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ أَوِاجْهَرُوْا بِهٖ، إِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" (الملك: ١٣) (اور تم لوگ اپنی بات خواہ چھپا کر کہو یا پکار کر کہو، وہ دلوں تک کی باتوں سے خوب آگاہ ہے) "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (ق: ١٦) (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں ان وسوسوں تک کو جو اس کے جی میں آتے رہتے ہیں، اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی بڑھ کر اس کے قریب ہیں)، ترمذی شریف کی روایت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ" صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے، آپ نے فرمایا: میرا مقصد یہ نہیں جو تم لوگوں نے کہا، بلکہ اللہ سے کما حقہ حیا کرنے سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے سر، کانوں، آنکھوں، اور زبان کی حفاظت کرو۔ پیٹ اور وہ جس چیز کو جمع کرے اس کی حفاظت کرو، یعنی حرام لقمہ نہ جائے اور دل اور شرم گاہ کی حفاظت کرو، اور موت اور بوسیدگی کو یاد کرو، اور جو آخرت کو چاہتا ہے وہ دنیا کی رنگ رلیوں میں نہیں رہتا ہے، جو ایسا کرے گا تو اس نے گویا اللہ سے اس طرح حیا کی جیسا اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔

حضرات! حیا کی صفت اللہ تعالیٰ میں بدرجۂ اتم موجود ہے، جامع ترمذی میں ہے: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ سِتِّيْرٌ، يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالسِّتْرَ، فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ." (سنن ابی داود) (اللہ تعالیٰ بہت شرم کرنے والے اور پردہ پوشی کرنے والے ہیں، جب تم میں کوئی غسل کرے تو اپنے جسم پر کپڑے لپیٹ لے) اور "إِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِيْ إِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ إِلَيْهِ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْراً بِهِمَا خَائِبَتَيْنِ" (سنن ترمذی، کتاب الدعوات: ٣٩٠٤) (اللہ تعالیٰ بڑے شرم والے ہیں، جب بندہ اپنے دونوں ہاتھ

اس کے سامنے اٹھاتا ہے تو ان کو شرم آتی ہے کہ خالی واپس کردیں)، حیا کی صفت امام الانبیاء رسول اللہ ﷺ میں موجود تھی، حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گھر کے کونے میں پردے میں بیٹھی ہوئی کنواری لڑکی سے زیادہ باحیا تھے، حضرت عثمانؓ کی منقبت میں آیا ہے کہ فرشتے ان سے حیا کرتے ہیں۔

قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دو صاحبزادیاں جو اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لیے کنویں سے دور کھڑی تھیں، وہ بہت باحیا اور شرمیلی تھیں، حیا اور شرم یہ عورتوں کا بھی لازمہ اور خاصہ ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ "مَنْ جَرَّ ثَوْبَهَ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (سنن ابوداؤد، کتاب اللباس: ۴۰۸۷) (جو شخص اپنا کپڑا تکبر کے ساتھ گھسیٹے، اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرے گا)، یہ سن کر عورتوں نے کہا: عورتیں اپنی چادروں کے کناروں کا کیا کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، وہ لٹکا سکتی ہیں۔

حضرات! موجودہ دور میڈیا کا دور ہے، الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعہ بے حیائی کو عام کیا جارہا ہے، فلموں، ڈراموں اور ٹاک شوز اور نیوز پروگرامس کے ذریعہ فحاشی پھیل رہی ہے، ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِىْ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لهم عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِىْ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ." (النور: ١٩) (یقیناً جو لوگ چاہتے ہیں کہ مؤمنین کے درمیان بے حیائی کا چرچا رہے، ان کے لئے سزائے دردناک ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اللہ علم رکھتا ہے، اور تم علم نہیں رکھتے)

اہلِ ایمان مرد و عورت سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنی نگاہ اور شرم گاہ کی حفاظت کریں۔

حضرات! ایسے ماحول میں حیا کو باقی رکھنے اور گناہوں سے بچنے کے دو راستے ہیں: ایک اللہ کا ڈر، دوسرے اس کا دَر، ان صفات کے حاملین قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوں گے، اللہ توفیقات سے نوازے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

سلام اور اس کے شرعی طریقے

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد: فقد قال الله تعالى: "وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بَاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ حَسِيْباً." (النساء: ٨٦) (اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کرو، یا اسی کو لوٹا دو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے)

حضرات! دنیا کی تمام قوموں میں آپسی ملاقات کے وقت کچھ نہ کچھ کہنے کا رواج رہا ہے اور آج بھی ہے، یورپ والوں کے یہاں بھی کچھ انگریزی کے جملے ہیں، برصغیر میں بھی کچھ جملے رائج ہیں، عربوں میں اسلام سے پہلے ملاقات کے وقت أَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْناً يا أَنْعِمْ صَبَاحاً کے جملے رائج تھے، (خدا آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب کرے، تمہاری صبح خوشگوار ہو)

حضرات! مذہب اسلام کی تعلیم ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملیں تو السلام علیکم کا جملہ دہرائیں، اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم کو ہر طرح کی سلامتی نصیب فرمائے، یہ چھوٹوں کے لئے محبت و پیار کا کلمہ ہے، اور بڑوں کے لئے بھی اکرام و تعظیم ہے، اور السلام تو اللہ تعالیٰ کے بہترین ناموں میں سے ہے، قرآن مجید نے یہ کلمہ انبیاء و رسل کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور اکرام و بشارت استعمال فرمایا ہے: "سَلَامٌ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ، سَلَامٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعَالَمِيْنَ، سَلَامٌ عَلٰى إِدْرِيْسَ، سَلَامٌ عَلٰى الْمُرْسَلِيْنَ، سَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ، أُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ آمِنِيْنَ، سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ."

الغرض ملاقات کے وقت کے لئے السلام علیکم سے بہتر کوئی جملہ نہیں ہوسکتا، ترمذی شریف

کی روایت ہے :رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :لوگو!اللہ کی عبادت کرو، بندگان خدا کو کھانا کھلاؤ،اور سلام کو خوب پھیلاؤ،تم جنت میں پہونچ جاؤگے سلامتی کے ساتھ۔

صحیحین کی روایت ہے: ایک شخص نے پوچھا کہ اسلامی اعمال میں کون سا عمل زیادہ اچھا ہے؟ آپ نے فرمایا:تم اللہ کے بندوں کو کھانا کھلاؤ،اور جن سے جان پہچان ہو ان کو اور جن سے نہ ہو ان کو بھی سلام کرو۔

حضرات!جامع ترمذی کی حدیث ہے،حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا،اور اس نے کہا:السلام علیکم،آپ نے اس سلام کا جواب دیا، پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا،آپ نے فرمایا:اس کے لئے دس نیکیاں لکھی گئی ہیں،دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا:السلام علیکم ورحمۃ اللہ،آپ ﷺ نے فرمایا:اس کے لئے بیس نیکیاں لکھی گئیں،تیسرا آیا اور اس نے کہا:السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،آپ نے فرمایا:اس کے لئے تیس نیکیاں لکھی گئیں۔

مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں اللہ کے قرب اور اس کی رحمت کا زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے،اور یہ بھی فرمایا کہ سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا:ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں، پھر فرمایا:جب ملاقات ہو تو سلام کرے، جب دعوت کرے تو دعوت قبول کرے، جب نصیحت چاہے تو نصیحت کرے، جب چھینک آئے تو الحمد للہ کہے، جب مریض ہو تو عیادت کرے، جب انتقال ہو تو جنازہ کے ساتھ جائے۔

حضرات! سلام کے آداب میں یہ ہے: ۱۔جب گھروں میں داخل ہو تو سلام کرے،اور جب نکلے تو وداعی سلام کرے۔

سلام کے علاوہ ملاقات کے وقت مسرت ومحبت کے اظہار کا ذریعہ مصافحہ

ہے، جو عموما سلام کے ساتھ اور اس کے بعد ہوتا ہے؛حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سلام کا تکملہ مصافحہ ہے،اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے: جب دو مسلمانوں کی ملاقات ہو،اور وہ مصافحہ کریں اور اس کے ساتھ اللہ کی حمد اور اپنے لئے مغفرت طلب کریں تو ان کی مغفرت ہو جاتی ہے،مؤطا امام مالک میں ہے کہ تم مصافحہ کیا کرو،اس سے کینہ کی صفائی ہوتی ہے۔

لیکن مصافحہ میں یہ یاد رہے کہ دونوں طرف سے رضا مندی ہو تبھی مصافحہ صحیح ہے،ورنہ سلام پر ہی اکتفاء کیا جائے،بعض دفعہ عقیدت میں انسان مصافحہ کرتا ہے،اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے،اور تکلیف دینا حرام ہے۔

محبت وتعلق کے اظہار کے لئے معانقہ بھی ہے،سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ جب حبشہ سے آئے تو آپ ﷺ ان سے لپٹ گئے،معانقہ کیا اور دونوں آنکھوں کے درمیان ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام میں سلام ایک رواجی اور روایتی عمل نہیں ، بلکہ ایک دعا اور پیغام ہے،ہم کو اس مشن کو آگے بڑھانے میں پوری کوشش صرف کرنی چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

کامیابی کا راز

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد ! فقد قال الله تعالى: "فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ، وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ." (آل عمران : ١٨٥) (جوجہنم سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہی کامیاب ہے، اور دنیوی زندگی تو دھوکہ کا سودا ہے)

حضرات ! اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہر مؤمن کی آخری خواہش ہوتی ہے، وہی اس کی کامیابی کا رمز اور علامت ہے، یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے، جو عقل وشریعت کے بالکل مطابق ہے، اسلام میں کامیابی کا معیار مال ومنال، جاہ وحشم، عہدے اور مناصب کو نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے مطابق عمل کر کے جنت حاصل کرنا ہی کامیابی کی کسوٹی اور اس کی میزان ہے: "فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ، وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ." (آل عمران : ١٨٥) (جوجہنم سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہی کامیاب ہے، اور دنیوی زندگی تو دھوکہ کا سودا ہے) اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے دین وشریعت کا نظام بنا، دین وشریعت اللہ کا عطا کردہ عظیم انعام ہے، اس میں ہر مشکل کا حل، اور ہر درد کی دوا موجود ہے۔

حضرات ! دین وشریعت کے اصل سرچشمہ قرآن کریم نے دو چیزوں کو بقاء و دوام کا ذریعہ (قِيَاماً لِلنَّاسِ) قرار دیا ہے، ان کے ذریعہ سے یہ سلسلہ روز وشب قائم ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جسم وروح سے مرکب ہے، جسم کے الگ تقاضے ہیں، جو

نامیاتی اشیاء سے متعلق ہیں یعنی آگ، پانی، ہوا وغیرہ، سورۂ نساء میں ہے: "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَاماً." (نساء : ٥) (اور نا سمجھوں کو اپنے مال حوالہ نہ کرو، جس کو اللہ نے تمہارے لئے گذر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے)، اگر مال نہ ہوتو انسان کا نظام جسمانی متأثر ہو اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے۔ دوسری طرف انسان روح سے زندہ ہے، اور روح کی غذا اور مطالبات جسم سے مختلف ہیں، سورہ مائدہ میں ہے: "جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِلنَّاسِ." (اور اللہ نے عظمت والے گھر 'کعبہ' کو لوگوں کے لئے قیام کا ذریعہ بنایا ہے (مائدہ: ٩٧)، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے تھے: نظام عالم بیت اللہ سے قائم ہے، یہ حقیقت ہے کہ اگر بیت اللہ کا پیغام (توحید ورسالت وآخرت وغیرہ) نہ ہوتو اس نظام کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہ عقلاً ہے اور نہ قانوناً، یہی پیغام روح کی غذا اور اس کا اصل سرمایہ ہے، اسی سے روح زندہ، متحرک، اور حرارت سے پر رہتی ہے، جسم وروح کے دونوں تقاضے (کسب مال اور اصلاح عقائد) ان کے لئے کلیدی کردار رکھتے ہیں، بلکہ انہیں پر ان کی موت وزیست کا انحصار ہے، اس لئے دونوں کی اصلاح کی فکر ہر باشعور افراد کی ذمہ داری ہے۔

مال کا حصول انسانی زندگی کے بقاء کے لئے ضروری ہے، قرآن کریم نے مال کا تذکرہ کہیں "فضل" اور کہیں "خیر" کے لفظ سے کیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ جب اللہ کے ذکر سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کے فضل کو تلاش کرو (جمعہ: ١٠) اور ایک حدیث میں فرمایا گیا: الكَاسِبُ حَبِيْبُ اللّٰه (مال کمانے والا اللہ کا محبوب ہے) کیوں کہ وہ اپنے اہل وعیال کی کفالت کے لئے روزی کا انتظام کر رہا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب صحیح اصولوں پر ہو، اس کو بغیر شریعت کی گہری واقفیت کے نہیں سمجھا جا سکتا۔

شریعت میں حلال وحرام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسی پر اعمال کی قبولیت کا انحصار اور جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے نجات پانے کا دار ومدار ہے، قرآن کریم میں

حلال وحرام کی بے شمار آیتیں موجود ہیں، ان کو آیات احکام کہا جاتا ہے اور وہ علم علم تشریع کے نام سے متعارف ہے، حدیث شریف میں اس کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، لیکن اسی کے ساتھ حدیث میں آیا ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہوگی کہ وہ حلال کھا رہا ہے یا حرام، جب کہ حلال وحرام اس کے سامنے واضح ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ اور ایمان والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : "يَآاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً (مؤمنون:۵۱) (اے رسولو! پاکیزہ مال کھاؤ اور نیک عمل کرو)، اور "يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ." (بقرہ: ۱۷۲) (اے ایمان والو! ہمارے دئے پاکیزہ مال کو کھاؤ)

حضرات! ہر غذا کی ایک تاثیر ہوتی ہے، حرام غذا سے جو گوشت اور خون تیار ہوتا ہے، اس میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں، اس سے اخلاق خراب ہوتے ہیں، گناہوں کی طرف میلان ہوتا ہے، دل میں ظلمت پیدا ہوتی ہے، اولاد پر اس کا غلط اثر پڑتا ہے، عبادت میں طبیعت نہیں لگتی ہے، اور سب بڑی بات یہ ہے کہ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِيَ بِالْحَرَامِ (وہ جسم جنت میں داخل نہیں ہوگا، جس کی حرام مال سے پرورش ہوئی ہے)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پاک ہیں، اور پاک مال کو قبول کرتے ہیں، اللہ نے ایمان والوں کو اسی کا حکم دیا ہے، جس کا رسولوں کو حکم دیا ہے، پھر آپ ﷺ نے ایک شخص کا تذکرہ فرمایا کہ دور دراز علاقے سے پراگندہ حال اور پراگندہ بال مکہ مکرمہ کا سفر کرتا ہے، غلاف کعبہ کو پکڑ کر دعا کرتا ہے، اور کہتا ہے اے رب! اے رب! اور اس کا کھانا حرام، اور پینا حرام، اور اس کا لباس حرام، تو اس کی دعا کہاں قبول کی جائے گی؟ (صحیح بخاری)۔

حرام کھانے کی بہت سی صورتیں اور شکلیں ہیں، ان میں سودخوری، رشوت، قرض لے کر نہ دینا اور غاصبانہ مال لینا، ناپ تول میں کمی کرنا، اور خیانت کرنا ہے، ان تمام کی

حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو: شرک، جادو، ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد سے بھاگنا، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا (متفق علیہ)

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا"، (بقرہ:۱۷۵) (اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ہے)، اسلام سے پہلے تمام مذاہب میں سود کو حرام کیا گیا، لیکن قرآن نے بڑی شدومد کے ساتھ اس کی حرمت کا اعلان کیا، سورۂ بقرہ کی کئی آیتوں میں سود کی حرمت کا تذکرہ ہے۔

سود ان برائیوں میں ہے، جن کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی عذاب نازل کرتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کسی قوم میں زنا اور سود کی کثرت ہوگی تو گویا اس آبادی والوں نے اپنے اوپر عذاب الٰہی کو اتار لیا (طبرانی بروایت عبداللہ بن عباس) اور مسند احمد کی روایت ہے کہ جب کسی قوم میں سود عام ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر قحط سالی بھیجتے ہیں۔

سود کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کم دے اور زیادہ وصول کرے، اسی حدیث میں بیان کیا گیا ہے: كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعاً فَهُوَ رِبَا (ہر وہ قرض جو نفع کا پیش خیمہ ہو وہ ربا ہے) اس میں ایک آدمی کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہوتا ہے، اور اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا کہ انسان خود نقصان اٹھائے اور دوسرے کو پہونچایا جائے (لاضرر ولاضرار)۔

ایک کل ایک فیشن یہ ہوگیا ہے کہ بینک میں ساری رقم رکھ دی جاتی ہے، وہ بظاہر اس میں محفوظ ہوتی ہے، اس سے جو منافع بشکل سود حاصل ہوتے ہیں، اسی پر پورا گذر بسر ہوتا ہے، یہ بڑے خطرہ کی بات ہے، بعض بزرگوں نے سود کو غلاظت سے تشبیہ دی ہے، اور یہ تشبیہ بجا ہے۔

دو چیزوں پر اعلان جنگ:

دو چیزیں ایسی ہیں جن پر خالق کائنات نے جنگ کا اعلان کیا ہے، ایک یہی سود

خوری، جب انسان سودخوری کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کے حکم کے خلاف بغاوت کر رہا ہے، اسی لئے اللہ کی غیرت جوش میں آتی ہے اور اس کے لئے وبال جان ہوتی ہے: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (بقرہ: ۲۷۹) (اگر یہ لوگ سود سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار رہیں)، اور اللہ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ (بقرہ: ۲۷۵) (جو سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اس طرح اٹھیں گے، جس طرح وہ اٹھتا ہے جو شیطان کے مس کرنے سے خبطی ہو گیا ہو)، علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

دوسری چیز اولیاء اللہ کو تکلیف پہونچانا، یہ بھی ایسا سنگین گناہ ہے کہ اللہ کی طرف سے اعلان جنگ ہے: مَنْ عَادىٰ لِىْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ (جس نے میرے ولی سے دشمنی کی، میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں) (صحیح بخاری)۔

دوسری چیز جس پر نظام کائنات کا انحصار ہے، وہ عقائد ہے، علماء عقائد کے حامل، شارح اور ترجمان ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ علماء عقائد کی روشنی میں لوگوں کو صحیح بات بتاتے ہیں، چنانچہ ان کا وجود اس کائنات کی بقاء کا ذریعہ ہے، ایک حدیث میں علماء کو ستاروں کے مشابہ قرار دیا گیا ہے، (مسند احمد بن حنبل) اور ستاروں کو اللہ تعالی نے کائنات کی زینت (سورہ ملک: ۵) مسافروں کو راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ (نحل: ۱۶) اور شیاطین کو رجم کرنے کے لئے بنایا ہے (ملک: ۵)، اس طرح اللہ والے، شریعت کے واقف کار دنیا میں جمال و خوبصورتی کا باعث، بھٹکے لوگوں کو راستہ دکھانے والے اور باطل کے سخت مخالف ہیں، ان کی شان میں گستاخی، بے ادبی اور بے قیری سے صرف اعمال کے اکارت جانے کا خطرہ نہیں، بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے گستاخ افراد کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

تین عبرت انگیز واقعات:

حضرت سعید بن زیدؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ایک عورت نے جس کا نام اروی بنت اوس ذکر کیا گیا ہے، اس نے دعوی کیا کہ سعید نے میری زمین ہڑپ لی ہے، حضرت سعید کو سخت صدمہ ہوا، انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں کسی کی زمین ہڑپ کرلوں، جب کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے ایک بالشت زمین بھی ہڑپ لی، تو اللہ تعالی قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں پہنائیں گے، پھر انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کی بینائی سلب کرلے، اور اسی زمین میں اس کی موت ہو، دعا قبول ہوئی، وہ عورت اندھی ہوگئی، ایک مرتبہ وہ اسی زمین پر چل رہی تھی، اور اس میں ایک کنواں تھا، ناگاہ اسی میں گری اور مرگئی، یہ ہے انجام اللہ والوں کو تکلیف پہونچانے کا (مشکاۃ المصابیح)۔

باطل طریقہ سے کسی کا مال کھانا اللہ کے نزدیک بہت معیوب عمل ہے، سوید بن غفلہؓ ایک صحابی ہیں، وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اور مجھے راستے میں دینار کی ایک تھیلی گری ہوئی ملی، جب میں نے اس کا تذکرہ آپ ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ سال بھر اس کا اعلان کرو، چنانچہ میں نے ایسا کیا، پھر آپ ﷺ کے پاس لے کر آیا، تو دوسرے اور تیسرے سال رسول اللہ ﷺ نے اعلان کرنے کے لئے کہا، یعنی آپ ﷺ نے مسلسل اس کے مالک تک پہونچانے کی تاکید فرمائی، تاکہ انسان غلط مال اپنے جسم میں غذا کے ذریعہ داخل کرنے والا نہ ہوجائے، اخیر میں فرمایا کہ اگر نہ ملے تو استعمال کرسکتے ہو (مسلم شریف، بروایت سلمہ بن کہیل)۔

مسلم شریف میں ایک قصہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے ایک زمین خریدی، خریدنے والے نے اس میں سونا بھرا مٹکا پایا، وہ بیچنے والے کے پاس آیا، اور کہا کہ یہ سونے

کا مٹکا آپ کا ہے، لے لیجئے، میں نے آپ سے زمین خریدی ہے، یہ سونا نہیں خریدا ہے، بیچنے والے نے کہا کہ میں نے زمین اور زمین کی تمام چیزیں آپ سے بیچ دی ہیں، دونوں قاضی کے پاس گئے، قاضی نے پوچھا کہ کیا تم دونوں کی اولاد ہے؟ ایک نے کہا کہ میرا لڑکا ہے دوسرے نے کہا کہ میری لڑکی ہے، قاضی نے کہا کہ دونوں کا نکاح کرا دیتا ہوں، اور ان دونوں پر یہ سونے کا مٹکا خرچ کردو، (بروایت ابوھریرہ، باب استحباب اصلاح الحاکم بین الخصمین)، دونوں کو اللہ کا خوف اس قدر تھا کہ ناجائز مال کو استعمال کرنا ممکن نہیں تھا۔

موجودہ دور کا المیہ:

حضرات! اس دور کا المیہ یہ ہے کہ انسان نیکیوں کے حاصل کرنے کا بڑا شوقین ہے، لیکن اس کی فکر اس جانب نہیں جاتی کہ نیکیوں کو بچانا بھی ضروری ہے، اگر نیکیوں کو بچانا پیش نظر رہا، تو اللہ کی رحمت ہر آن ہمارے ساتھ رہے گی، صحابۂ کرامؓ زیادہ نفلی روزوں اور نمازوں والے نہیں تھے، چونکہ ایمان ان کے رگ وریشے میں سرایت کر چکا تھا، اس لئے وہ حلال وحرام کا خوب علم رکھتے تھے، اور اس کے مطابق زندگی گذارتے تھے، ناجائز طریقہ پر کسی کا مال کھانا اللہ کے نزدیک بہت برا عمل ہے، اور جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔

جسم وروح کے تقاضوں پر عمل کرنے سے صرف دونوں کا نظام ہی صحیح نہیں رہتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اور یہی ایک مؤمن کی معراج اور ترقی کا ذریعہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

عدل وانصاف
معاشرہ کی اہم ترین ضرورت

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! وقال الله تعالى: "وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقاً وَعَدْلاً." (الأنعام:١١٥) (تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی)۔

حضرات! عدل وانصاف معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت ہے، جسم انسانی میں ریڑھ کی ہڈی جو مرکزی حیثیت رکھتی ہے وہی حیثیت عدل وانصاف کی بھی ہے، یہ پورا نظام کائنات، یہ کارخانۂ قدرت اسی عدل وانصاف ہی کے بل بوتے پر قائم ہے، اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں ایک نام ہے: العدل، یعنی انصاف والا، عدل والا، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، اور وہی بات کہتا ہے جو حق ہے، سورۂ انعام میں ہے: "وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقاً وَعَدْلاً." (تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی)۔

عام طور پر معاشرہ میں عدل وانصاف کا خون صرف دو وجہوں سے ہوتا ہے، یا تو انسان بغض وعداوت میں اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ عدل وانصاف کو چھوڑ دیتا ہے، سورۂ مائدہ میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے: "وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى." (مائدہ:٨) (اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ انصاف کرو، انصاف کرتے رہو کہ وہ تقویٰ سے بہت

قریب تر ہے) دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان محبت میں عدل وانصاف کو خیر باد کہہ دیتا ہے، سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے اس تعلق سے فرمایا ہے: "وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ." (نساء:۱۳۵) (چاہے وہ تمہارے والدین یا عزیز کے خلاف ہی ہو)

حضرات! سیرت رسول میں عدل وانصاف کے بے شمار نمونے ملتے ہیں، فتح مکہ کا موقع ہے، اللہ کے رسول ﷺ عثمان بن طلحہ سے چابی لے کر خانہ کعبہ میں داخل ہوتے ہیں، اور شرک و بت پرستی کے آثار کو گرا کر اس میں دو رکعت نماز پڑھتے ہیں، اور باہر آتے ہیں، اس موقع پر حضرت علی مرتضیٰؓ درخواست کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! یہ چابی ہمیں عنایت فرمادیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: أَيْنَ عُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ؟ عثمان بن طلحہ کہاں ہے؟ ان کے آنے کے بعد وہ چابی ان کے حوالے کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ یہ ذمہ داری قیامت تک تمہارے خاندان میں رہے گی، ظالم و جابر کے علاوہ کوئی تم سے اس کو نہیں لے سکے گا۔ عثمان بن ابی طلحہ اس وقت حالت شرک میں تھے، وہ سوچ رہے تھے کہ آج ہمیں سخت ترین سزا ملے گی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کریمانہ برتاؤ اور عدل وانصاف پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کا دل اسلام کی طرف مائل ہوا، اور اسی لمحہ انہوں نے کلمہ شہادت پڑھا اور اسلام میں داخل ہوگئے۔

مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے، صحیح بخاری کتاب احادیث الانبیاء میں آیا ہے کہ مکہ کی ایک عورت فاطمہ بنت اسود نے چوری کی اور چوری ثابت ہوگئی، اس بات سے قریش غمگین ہوئے کہ ایک معزز خاتون کو سزا دی جائے گی، انہوں نے مشورہ کیا کہ اس سلسلہ میں حضور ﷺ سے کون سفارش کرے گا؟ سب نے متفقہ طور پر اسامہ بن زیدؓ کو سفارشی بنایا، اسامہ بن زید نے جیسے ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اللہ کے طے کردہ حدود میں سفارش کررہے ہو؟ اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کے ہاتھ بھی کاٹے جاتے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عدل دیکھئے کہ اہلیہ کو شیرینی کھانے کی خواہش ہوئی تو سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے بیت المال سے کچھ لینے سے انکار کردیا، کیونکہ وہ مسلمانوں کی امانت ہے، چند دنوں کے بعد اہلیہ نے روزینہ سے کچھ بچا کر شیرینی لانے کی فرمائش کی تو اس زائد حصہ کو بیت المال میں جمع کردیا، اور کہا کہ آل ابوبکر کو بیت المال سے اتنی رقم زیادہ ملتی تھی، اس سے کم میں بھی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ خلافت ہے، جبلہ بن ایہم غسانی نے اسلام قبول کیا، اور خانہ کعبہ کا طواف کرنے مکہ مکرمہ گیا، دوران طواف اس کی تہبند پر ایک بدو کا پیر پڑ گیا، اس نے اس زور سے گھونسہ مارا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور کہا: اگر بیت اللہ کی حرمت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کردیتا، مقدمہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں آیا، انہوں نے جبلہ سے کہا: یا تو تم اس سے معافی مانگو، ورنہ میں تم کو سخت سزا دوں گا، جبلہ راتوں رات مدینہ سے بھاگ کھڑا ہوگیا، لیکن حضرت عمرؓ نے عدل وانصاف کو نہیں چھوڑا۔

حضرت عثمانؓ نے ایک مرتبہ اپنے غلام کی کان مروڑ دی، اس کے بعد خوف خدا کا ایسا غلبہ ہوا کہ غلام سے کہا کہ تو مجھ سے قصاص لے لے، کیونکہ دنیا کی سزا آخرت کی سزا کے مقابلہ میں معمولی ہے۔

حضرت علیؓ کی زرہ غائب ہوگئی، بہت دنوں کے بعد ایک یہودی کوفہ کے بازار میں اس کو فروخت کررہا تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہوا تو زرہ دیکھنے گئے، دیکھ کر پہچان لیا، اور یہودی سے کہا: یہ میری ہے، یہودی نے کہا کہ یہ برسوں سے میرے پاس ہے، مقدمہ قاضی شریحؒ کی عدالت میں گیا، مدعی نے گواہ پیش کیا، لیکن لڑکے اور غلام کے گواہ ہونے کی وجہ سے قاضی شریح نے اس کو مسترد کردیا، اور یہودی سے کہا: اگر تو قسم کھائے گا تو تیرے حق میں فیصلہ کردیا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہودی نے قسم کھائی اور فیصلہ اسی کے حق میں ہوگیا، حضرت علیؓ ہشاش وبشاش تھے کہ اسلامی طریقہ کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، یہودی کو

اپنی غلطی معلوم تھی، وہ اس واقعہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً اسلام کا کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔

عدل وانصاف کی اسی اہمیت کے پیش نظر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جمعہ کے خطبہ میں "اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى، وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ." (نحل: ۹۰) (اللہ تعالیٰ تم کو عدل، احسان اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتے ہیں، اور بے حیائی، بری بات اور ظلم سے منع کرتے ہیں) کو شامل کیا ہے، جمعہ کے دوسرے خطبہ میں یہ آیت دہرائی جاتی ہے۔

حضرات! عدل کے لغوی معنیٰ یہ ذکر کئے جاتے ہیں کہ کسی بوجھ کو دو برابر حصہ میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ان میں سے کسی میں بھی کمی بیشی نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ہم جو بات کہیں یا جو کام کریں، اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہ اس کی کسوٹی پر پورا اترے، اس لئے عدل وانصاف کو ہر سطح پر عام کرنے کی ضرورت ہے جس طرح سے کائنات عدل وانصاف پر قائم ہے اور حسن وخوبی کے ساتھ چل رہا ہے اسی طرح ہمارا معاشرہ بھی بہتری کے ساتھ اچھی راہ پر گامزن ہو۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

دنیا کی حقیقت: قرآن کی نظر میں

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ، وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى، وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا." (النساء: ۷۷) (آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا سامان بہت ہی تھوڑا ہے، اور آخرت اس کے لئے کہیں بہتر ہے، جو تقویٰ اختیار کرے، اور تم پر دھاگے کے برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا)۔

حضرات! یہ عالم رنگ وبو دنیا کے نام سے متعارف ہے، اللہ ربّ العزت نے اس کو میدان عمل بنایا ہے، اس میں انسان کو خیر وشر کا اختیار دیا گیا ہے، مزید برآں اس کو قوت تمیز بھی عطا کی ہے، تاکہ وہ آخرت کے لئے ذخیرہ چھوڑ سکے جو کہ آخری منزل اور جائے قرار ہے، دنیا کے معنی قریب ترین شئی کے ہیں، آخرت کی بنسبت یہ انسان کے ساتھ ہے، اس لئے اس کو دنیا کہا گیا ہے، قرآن میں دنیا کا لفظ ۱۱۵/مرتبہ آیا ہے، قرآن کا عددی اعجاز ہے کہ آخرت کا ذکر بھی ۱۱۵/ بار آیا ہے، دنیا کا تعارف قرآن میں اس طرح آیا ہے: دھوکہ کا سودا، لہو ولعب کی جگہ، امتحان کی جگہ، مصائب کا گھر، مسافرت کی منزل، عبادت وعمل کا مقام وغیرہ۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیوی زندگی کے دو پہلو ہیں: مثبت اور منفی، مثبت کے سلسلہ میں قرآن گیا ہے: "وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا" (یعنی دنیا کے اندر اپنے حصے کو فراموش نہ کرو) (القصص: ۷۷) اور ارشاد باری ہے: "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً، وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" (البقرة: ۲۰۱) (اے اللہ! دنیوی زندگی میں ہمیں بہتری عطا فرما، اور اخروی میں بھی، اور جہنم کے آگ سے ہم کو محفوظ فرما)، دنیا کی بہتری کا مطلب یہی ہے کہ انسان کو اللہ کی مرضیات کے مطابق زندگی

گزارنے کی توفیق مل جائے۔

منفی پہلو یہ ہے کہ یہ دھوکہ کا سودا ہے، چنانچہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر مسافرانہ زندگی گذارے اور اس کو قید خانہ سمجھے، کیونکہ ارشاد باری ہے: دنیا کی زندگی لہو ولعب، زیب وزینت اور فخر ومباہات سے عبارت ہے (الحدید: ۲۰)، انسان اپنے بچپن میں کھیل کود میں مگن رہتا ہے، اس کی جوانی تراش وخراش میں گذرتی ہے، اور بڑھاپے میں اس کے اندر فخر کے جذبات امنڈتے ہیں، پھر دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے، یہ دنیا کی اصل حقیقت ہے، ایک حدیث میں دنیا کی تشبیہ ایک کالی کلوٹی، بدصورت عورت سے آئی ہے کہ جس طرح وہ عورت انسان کی نگاہ میں خوش منظر نہیں ہوتی ہے، اسی طرح دنیا کی محبت اس کے اندرون میں پیوست نہیں ہونا چاہئے۔

حضرات! دنیا کی بے ثباتی کا اندازہ اس تمثیل سے بخوبی ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ان کے سامنے دنیا کی مثال بیان کرو، جیسے پانی، جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں، اس سے زمین کا سبزہ ملا جلا نکلا ہے، پھر وہ آخر کار چورا چورا ہوجاتا ہے، جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (الکہف: ۴۵)، یہ مثال سورۂ یونس (۲۵)، سورۂ زمر (۲۱)، اور سورۂ حدید (۵۰) وغیرہ میں بھی وضاحت کے ساتھ موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا: میری مثال دنیا کے اندر اس سوار کی سی ہے جو کسی سایہ میں تھوڑی دیر دم لے اور چلتا بنے (سنن ترمذی: ۲۳۵۳) کسی اللہ والے نے کہا ہے:

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے، تماشہ نہیں ہے

حضرات! آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، سورۂ نساء (۷۷) میں فرمایا گیا: دنیا کا سودا بہت معمولی ہے، اور آخرت ہی متقیوں کے لئے بہترین سوغات ہے، لیکن مقام افسوس ہے کہ لوگ اس کھوٹی پونجی کے حصول کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں، چنانچہ سورۂ بقرہ (۲۰۱) میں فرمایا گیا ہے: کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب!

دنیا کی زندگی میں ہم کو خیر کثیر عنایت فرما، ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کچھ بھی نہیں ہے، اور کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے میرے پروردگار! دنیا کی زندگی میں بھی ہم کو نعمتوں سے سرفراز فرما اور آخرت میں بھی، اور جہنم کی آگ سے محفوظ فرما، ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں انعام ہے یعنی ان کے اعمال کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

حضرات! دنیا دار مادہ پرست ہوتا ہے، اس کو صرف اپنے پیٹ کی فکر دامن گیر رہتی ہے، اس کا اعلان ہوتا ہے کہ روٹی، کپڑا، مکان، وہ ناؤ ونوش کا پجاری ہوتا ہے، چنانچہ وہ دنیا کے پیچھے چلتا ہے، اور دنیا اس سے دور رہتی ہے، جب کہ خدا پرست انسان وحدانیت کا قائل ہوتا ہے، اس کا اندرون ذکر الٰہی سے روشن ہوتا ہے، وہ معدہ کا غلام نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کا بندہ اور اس کے حکم کے سامنے سرافگندہ ہوتا ہے، ایسے ہی لوگوں کے قدموں میں دنیا آکر اپنی پیشانی رگڑتی ہے اور ذلیل وخوار ہوتی ہے، انہی دو نظریات کے حاملین کا تذکرہ سورۂ کہف کی آیت ۳۲ تا ۳۹ میں آیا ہے: دو آدمی تھے، ان میں سے ایک کو اللہ نے کھجور اور انگور کے باغات کے علاوہ قابل کاشت زمین بھی دی تھی، ایک مرتبہ اپنے دوست (جو خدا شناس تھا) سے مارے فخر کے کہتا ہے کہ دیکھو، میں تم سے زیادہ مالدار ہوں، پھر وہ اپنے باغ میں دولت کے نشہ میں چور ہوکر داخل ہوا، اور ڈینگیں مارنے لگا، اس کو اس کے دوست نے سمجھایا، لیکن اس نے اس کی کچھ بھی نہ سنی، جب کہ اس کے دوست نے اللہ کی دی ہوئی نعمت پر تشکر کے کلمات کہے، یہ مثال ہے ایک خدا پرست اور مادہ پرست انسان کی۔ خلیفۂ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ دنیا کی حقیقت سے واقف تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ اے دنیا! کیا تو میرے پیچھے پڑی ہے، چل ہٹ، کسی اور کو دھوکہ دینا، مجھے معلوم ہے کہ تیری عمر بہت مختصر ہے، اور تیرے مسائل بیشمار ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ ہم کو ایمان والوں کی طرح دنیا میں اچھی زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

غیروں کی نقالی ایک شیطانی عمل

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد ! فقد قال الله تعالى : "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ." (البقرة: ۱۰۴) (اے ایمان والو: راعنامت کہا کرو، اور انظرنا کہا کرو، اور سنتے رہا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے)

حضرات! قرآنِ کریم نے جن فرقوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں یہود بھی ہیں، یہود حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے کی طرف منسوب ہیں، قرآن نے کہیں ان کو الیہود اور کہیں بنی اسرائیل کہہ کر پکارا ہے، یہ ایسی قوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نبیوں اور عظیم بادشاہوں سے نوازا، اور دنیا میں فضیلت اور برتری دی۔

لیکن انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ناشکری کی تو موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے درخواست کی کہ میرے رب مجھے اور میرے بھائی کے درمیان جدائی پیدا کردیجئے، چنانچہ چالیس سال صحراء میں بھٹکتے رہے۔

آخر میں حضرت داؤد، حضرت یرمیاہ، حضرت حزقیل اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلاۃ والسلام نے ان کو لعنتی، منحوس، بدبخت، بے حس، نبیوں کا قاتل، اور سانپوں کی اولاد اور سانپوں کے بچے کہا۔

قرآن نے ان کو بندر، سور، طاغوت کے چیلے، ملعون، غضب الٰہی میں گھرے نبیوں کے قاتل، گناہ گار، مجرم وبدکار کہا، تورات وانجیل کے صفحات ان کی مذمت سے

بھرے ہوئے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ الزامات ہیں، لیکن اگر یہودیت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہودیوں کے یہاں ایک دینی تہوار ہے، وہ ہر سال غیر یہودی بچے کو مار کر تازہ خون سے تہوار کی روٹی تیار کرنے کے لئے آٹا اس سے گوندھتے ہیں، ان کے تہواروں میں دو مشہور ہیں: ایک پوریم، دوسرے فصح، پوریم مارچ میں ہوتا ہے اور فصح اپریل میں، یہود اپنی انہی خونریزیوں کی وجہ سے انسانی تاریخ میں دوبار ملک بدر کئے گئے، ذلیل و رسوا ہوئے، ایک مرتبہ بختِ نصر کے ہاتھوں، دوسری بار ٹائیٹس کے ہاتھوں، اور اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر تم دوبارہ ایسا کروگے تو یہی صورتِ حال دوبارہ پیش آئے گی۔

حضرات! میں نے قرآنِ کریم کی آیت پڑھی، اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ایمان والو! راعنا نہ کہو، بلکہ انظرنا کہو، یعنی ہماری طرف دیکھئے، اور سنتے رہا کیجئے، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہودیوں کو اسلام سے جو بغض وعدوات ہے، وہ اظہر من الشمس سے ہے، اس لئے اگر کبھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں وہ آتے تو "راعنا" کا لفظ بگاڑ کر "راعینا" کہتے تھے، اے چرواہے! اے احمق! اسی طرح السلام علیکم جس کے معنی سلامتی کے ہیں، کہتے تھے: السام علیکم (تم پر موت ہو)۔

حضرات! یہودیوں کی نظر میں وہ خود برگزیدہ قوم ہیں، ان کے علاوہ دوسرے انسان حیوانات وجمادات کی سطح کے ہیں، وہ عرب کے امیوں کے بارے میں کہتے تھے: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّيْنَ سَبِيْلٌ (ہم سے امیوں کے بارے میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا)۔

اس آیت میں جہاں ایک طرف ایسے الفاظ استعمال نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، وہیں دوسری طرف کفار کے اعمال واقوال کو اختیار کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے۔

ایک ایک لفظ کے بارے میں احتیاط کی تعلیم دی جارہی ہے، اس لئے غیر

مسلموں اور جاہلی اقوام کے شعائر ورسوم کے اختیار کرنے اور ان کی نقالی اور ریس کرنے میں اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں کیوں نہیں آئے گی۔

حضرات! ہندوستانی معاشرہ میں اگر ہم غور کریں تو ہم مسلمانوں کے یہاں بے شمار غیر اسلامی روایات موجود ہیں، آج کل شادیوں کا موسم ہے، بارات کی رسم، تلک کی رسم، جہیز کی رسم، اسراف کی رسم، بینڈ باجے اور ڈی جے سسٹم، درگاہوں پر سجدہ کرنا، منتیں ماننا وغیرہ یہ سب شامل ہیں۔

بعض لوگ تو یہاں تک کہنے لگے ہیں: اگر ہندو مندر جاتے ہیں تو مسلمان بھی درگاہ جاتے ہیں، ہندو اگر چڑھاوے چڑھاتا ہے تو مسلمان بھی نذرانے پیش کرتے ہیں، اس لئے ہم کو اس مسئلہ میں سوچنا چاہیے، اور غیر اسلامی شعائر سے دور رہنا چاہیے۔ قرآن کریم میں ہے: "وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ، وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ اَوْلِيَاءَ، ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ." (هود: ١١٣) (اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو، جو ظالم ہیں اپنے حق میں، ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ چھو جائے گی، اور اس وقت اللہ کے سوا کوئی تمہارا رفیق نہ ہوگا، پھر تمہاری مدد بھی نہ کی جائے گی)

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

اسراف

زندگی کا بدنما داغ

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ، وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ." (إبراهيم: ٣٤)

(اور تم کو اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگی، اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں شمار نہ کر پاؤ گے، بے شک انسان بڑا ہی ناانصاف ہے، بڑا ہی ناشکرا ہے)

حضرات! انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، ظاہری بھی، باطنی بھی، جسمانی بھی، معنوی بھی، اعضاء وجوارح کی شکل میں بھی اور آب وہوا اور مال ودولت اور اسبابِ زندگی کی شکل میں، گویا ہر لمحہ انسان پر خدا کی نعمتوں کی بارش کا سلسلہ جاری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کے تعلق سے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے کہ شکر گذاری سے وہ نعمتوں میں اضافہ فرماتے ہیں اور ناشکری سے عذاب میں گرفتار کر لیتے ہیں، نعمتوں کی شکر گذاری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس نعمت کو جہاں خرچ کرنے کا حکم ہے وہیں خرچ کیا جائے، اور ضرورت کے مطابق خرچ کیا جائے، ناجائز مقامات پر نعمتوں کو خرچ کرنے کا نام تبذیر ہے، اور جائز مقامات میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کو اسراف کہتے ہیں، بعض حضرات مال میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کو تبذیر اور مال کے علاوہ جتنی نعمتیں ہیں ان کو غلط استعمال کرنے کو اسراف کہتے ہیں۔

اردو میں اسراف کے معنی فضول خرچی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اسراف اور فضول خرچی کا تعلق صرف مال سے نہیں ہے، بلکہ زندگی کے تمام گوشوں سے ہے، حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے: كُلُّ مَا أُنْفِقَ فِيْ غَيْرِ طَاعَةِ اللّٰهِ فَهُوَ إِسْرَافٌ (جو اللہ کی مرضی کے خلاف خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے)۔

اسراف کئی طرح کا ہوتا ہے:

۱۔ عبادات میں اسراف یہ ہے کہ کثرت نماز کا اتنا اہتمام ہو کہ حقوق تلف ہو جائیں۔

۲۔ وضو اور غسل میں اسراف یہ ہے کہ پانی زندگی کی ایک نعمت ہے، آدھے لیٹر میں وضو اور تین لیٹر میں غسل آرام سے ہوسکتا ہے اور یہی حدیث سے ثابت ہے کہ ایک مد میں وضو اور پانچ مد میں غسل کیا جائے، لیکن اس میں اسراف کیا جائے۔

۳۔ صدقات اور وصیت میں اسراف یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کے ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہائی خرچ کرنا بھی زیادہ ہے، پورا مال راہِ خدا میں خرچ کرنا بہتر نہیں ہے کہ انسان خود محتاج ہو اور اس کے بچے فقیر ہوں۔

سزا میں اسراف یہ ہے کہ شریعت میں اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کے سدِ باب کی اجازت ہے، دوسرا کوئی ظلم کرے تو اُس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، لیکن حد سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے: "وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهِ ." (النحل:۱۲۶) (اور اگر تم بدلہ لینا چاہو تو تم انہیں اتنا ہی دکھ پہونچاؤ، جتنا دکھ تمہیں پہونچایا گیا ہے)

حضرات! دورِ حاضر میں سب سے زیادہ اسراف کھانے پینے اور لباس میں ہو رہا ہے، مال کی فراوانی نے لوگوں کو اسراف کا عادی بنا دیا ہے جب کہ قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے: "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا، إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ" (کھاؤ، پیو، لیکن اسراف سے کام نہ لو، بے شک وہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا) اور بخاری

شریف کی روایت ہے: "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَالْبَسُوْا، وَتَصَدَّقُوْا فِيْ غَيْرِ إِسْرَافٍ وَلَا مَخِيْلَةٍ." (کھاؤ، پیؤ اور پہنو، اور بغیر اسراف اور اظہار تکبر کے صدقہ کرو) ابنِ ماجہ کی روایت میں ہے کہ پیٹ کے تین حصے کئے جائیں: ایک کھانے کے لئے، اور ایک پینے کے لئے، اور ایک سانس کے لئے، ابنِ آدم نے پیٹ سے زیادہ کسی بدترین برتن کو نہیں بھرا۔ اس کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھی رکھ سکیں۔

حضرات! مجھے معاف کیا جائے کہ میں کہوں کہ اب دسترخوان پر رکھے جانے والے میووں کو مختلف پرندوں کی شکل میں تراشا جانے لگا ہے، کھانے میں اسراف یہ ہے کہ کھانے کے دوران گرنے والے لقموں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے، اور وہ ضائع ہوتا ہے، اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔

مال میں اسراف: شادی بیاہ میں مال کا جو اسراف ہوتا ہے وہ ناقابل بیان ہے، ابھی خبروں میں آیا ہے کہ ایک صاحب نے جہیز میں سونے کے پائخانہ کی سیٹ دی ہے۔

گفتگو میں اسراف: بلاضرورت بات کرنا، اس سے منع کیا گیا ہے، بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ یا تو بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔

حضرات!

اسراف کے اسباب میں ہے: ۱۔ دین سے ناواقفیت ۲۔ آخرت سے غفلت ۳۔ مغرب کی اندھی تقلید۔ اسراف کے نقصانات تو بے شمار ہیں، ان میں چند یہ ہیں:

گناہوں سے انسان قریب ہوتا ہے، مہنگائی میں اضافہ ہو رہا ہے، طلاق وغیرہ کی نوبت آجاتی ہے، موٹاپا، شوگر اور ہارٹ ٹیک یہ سب کھانے پینے کی وجہ سے ہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ دینی تعلیم کو عام کرنا اور آخرت کی فکر کرنا۔ اللہ تعالیٰ توفیق سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

تکبر اور اس کی تباہ کاریاں

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و صحبہ أجمعین، فقد قال اللّٰہ تعالی: أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم : "وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ، وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ." (الجاثیۃ: ۳۷) (آسمانوں اور زمین میں بڑائی اسی کے لئے ہے،اور وہ زبردست اور بہت ہی حکمت والا ہے)۔

حضرات! اللہ رب العزت کے ننانوے نام ہیں،ان میں ایک الکبیر ہے،جس کے معنی ہیں:بہت بڑا،اور ایک نام ہے:المتعالی،جس کے معنی ہیں:بلندوبالا،بلند شان والا، جس طرح دیگر ناموں میں کوئی اللہ کا شریک نہیں،اسی طرح اللہ تعالی اس صفت میں بھی اکیلا ہے،وہی اس کا مستحق ہے،اور ہر قسم کی بڑائی اسی کے ساتھ خاص ہے،حدیث میں ہے:اللہ تعالی فرماتا ہے:بڑائی میری چادر ہے،اور عظمت میرا ازار ہے،جو شخص دونوں میں سے کسی ایک کو مجھ سے کھینچنے کی کوشش کرے گا،میں اس کو توڑ دوں گا(سنن ابی داود:۴۰۹۰)۔

حضرات!انسان میں جب کوئی وصف اور کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اُس کا خیال پیدا ہوتا ہے،اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں،لیکن یہ خیال جب اس قدر ترقی کرجاتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو یہ معیوب ہوجاتا ہے،اس لئے انسان کا اپنے کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کی باتوں پر توجہ نہ دینا تکبر کہلاتا ہے،تکبر بدبختی کی علامت ہے،اور اس کی ابتداء شیطان سے ہوئی،اس نے اللہ کے حکم کو نہیں مانا اور تکبر کیا،اور کافروں میں شامل ہوگیا:

"اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ، وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ." (البقرة : ٣٤)

حضرات!پچھلی قوموں میں بھی یہ مرض پایا جاتا تھا،خواہ وہ قوم ہود ہو یا قوم ثمود،یا

قوم مدین،قرآن نے ان کے حالات بیان کئے ہیں:"قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهِ"،(ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا)،افراد میں جن لوگوں نے تکبر کیا ان میں قارون،فرعون،ہامان کے نام ہیں:"وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوْسٰى بِالْبَيِّنَاتِ، فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ، وَمَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ." (العنکبوت: ۳۹)(اور قارون،فرعون،ھامان کو بھی ہم نے ہلاک کیا،جن کے پاس موسی واضح معجزات لے کر آئے،مگر انہوں نے زمین میں تکبر کیا،حالانکہ وہ ہم سے آگے نہیں جاسکے)،قارون کو اللہ نے زمین میں دھنسایا،اور فرعون اور ھامان کو اللہ نے سمندر میں غرق کیا۔

حضرات!کفار مکہ کو رسول اللہ ﷺ نے دعوت اسلام پیش کی،تو انہوں نے تکبر کیا،قرآن کریم کہتا ہے:"اِنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ، وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ." (الصافات:۳۵)(ان سے جب یہ کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں،تو وہ تکبر کرتے ہیں،اور کہتے ہیں کہ کیا ہم ایک مجنون شاعر کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ سکتے ہیں)،اور رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں منافقوں کا سامنا کرنا پڑا:"وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ، وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ." (المنافقون :۵) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ،رسول تمہارے لئے استغفار کردیں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں،اور آپ انہیں دیکھیں گے بے رخی کرتے ہیں تکبر کے ساتھ)

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر کافروں،مشرکوں اور منافقوں کا شعار ہے،اس لئے ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ تکبر میں مبتلا ہو،ایک مسلمان اپنے رب کے سامنے عاجزی اور انکساری اختیار کرتا ہے،وہ لوگوں کے سامنے فخر وغرور کا اظہار نہیں کرتا ہے،بلکہ ہمیشہ تواضع سے کام لیتا ہے،تو ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کا یہ انعام سنئے:"فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ." (الم السجدۃ: ۱۷) (تو کوئی نہیں جانتا کہ اللہ تعالی نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے کیا چیز تیار کررکھی

ہے، یہ ان کاموں کا بدلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے)۔

حضرات! تکبر کی ایک شکل یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ سے بڑا خیال کرے اور اس کے احکامات ماننے سے انکار کردے، جیسا کہ فرعون اور نمرود نے کیا۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ سے بہتر تصور کرے، اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

اس کے کئی اسباب ہیں:

کچھ لوگ رنگ ونسل کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں
کچھ لوگ جاہ ومنصب کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں
کچھ لوگ مال ودولت کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں
کچھ لوگ حسن وجمال کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں
کچھ لوگ طاقت وقوت کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں
کچھ لوگ ذہانت کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں
کچھ لوگ اعلی ڈگری کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں
کچھ لوگ اچھی خطابت کی بنیاد پر تکبر کرتے ہیں

تکبر کی وجہ کوئی بھی ہو، ہر حال میں تکبر برا ہے، اور اس کا انجام ذلت ورسوائی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا يَدخُلُ الجَنَّةَ مَن كَانَ فى قَلبِهِ مِثقَالُ ذَرَّةٍ مَن كِبر. (صحیح مسلم:۹۱) (وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا، جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو)، رسول اللہ ﷺ کا یہ قول سن کر ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! بے شک ایک آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اور اس کا جوتا خوبصورت ہو تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی خوبصورت ہے، اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے، تکبر حق کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے (صحیح مسلم)۔

حضرات! تکبر کی صورتوں میں زمین پر اکڑ کر چلنا بھی ہے، کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا بھی ہے، خود پسندی میں مبتلا ہونا اور یہ پسند کرنا کہ اسے دیکھ کر لوگ کھڑے ہو جائیں۔

تکبر کے مقابلہ میں تواضع ہے، یہ ایک اچھی صفت ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالی یقینی طور پر بلندی اور رفعت عطا فرماتے ہیں، تواضع کا رسول اللہ ﷺ نے جو اعلی نمونہ پیش کیا ہے، وہ ہمارے لئے دلیل ہے، احادیث میں آیا ہے: آپ ﷺ غریب اور کمزور صحابہ کی دعوت قبول فرماتے تھے۔

آپ ﷺ گھریلو کاموں میں اپنے گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

آپ ﷺ اپنی تعریف میں غلو کو ناپسند کرتے تھے۔

آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہتے تھے کہ نیا آنے والا شخص آپ کو پہچان نہیں سکتا تھا۔

آپ ﷺ مریضوں کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور تدفین میں شرکت کرتے تھے۔

آپ ﷺ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے
آپ ساتھیوں کی حتی الامکان مدد کرتے تھے

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں اہل جنت کی خبر نہ دوں؟ ہر کمزور اور اللہ کی خاطر عاجزی اختیار کرنے والا، اگر وہ اللہ کے سامنے قسم کھا لے تو اللہ اس کی قسم پوری کردے (أَلَا أُخبِرُكُم بِأَهلِ الجَنَّةِ: كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعِّفٍ، لَو أَقسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ)۔

اللہ تعالی ہم کو تکبر سے دور رکھے اور ہمارے اندرون کو تواضع سے مزین فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

حسد ایک مہلک بیماری

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، قال الله تعالى: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم: "اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ، فَقَدْ آتَيْنَا آلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالنُّبُوَّةَ، وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكاً عَظِيْماً." (النساء: ٥٤) (کیا یہ لوگوں پر حسد کررہے ہیں، ان چیزوں کے باعث جو اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھی ہے، اور ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب وحکمت دی ہے، اور انہیں بڑا اقتدار بھی دیا ہے)

حضرات! انبیاء کرام کی بعثت کا بنیادی مقصد عقائد کی اصلاح، معاملات اور اخلاق کا فروغ ہے، اور ان کا مقصد رضائے الٰہی ہے کہ نہ دنیا کا جاہ وحشم، منصب اور اقتدار، اخلاقیات کا باب بہت وسیع وعریض ہے، لیکن بنیادی طور پر اچھے اخلاق اور برے اخلاق میں انہیں تقسیم کیا جاتا ہے، اچھے اور برے اخلاق کے درمیان فرق کا تھرمامیٹر وہ ہے، جس کو حضرت نواس بن سمعانؓ نے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور بدی کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: نیکی وہ ہے، جس پر دل مطمئن ہو، اور بدی وہ ہے جو دل میں کھٹکے (صحیح مسلم حدیث: ١٩٨٠، بروایت نواس بن سمعان)

حضرات! ہمارا معاشرہ جن اخلاقی امراض سے زار ونزار ہے، بلکہ دم توڑ رہا ہے، ان میں حسد بھی ہے، حسد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا احسان کریں، یعنی علم وفضل، عزت وشہرت یا اور کوئی دینی اور دنیوی نعمت عطا فرمائیں، تو اس کو دیکھ کر کسی کے دل میں یہ احساس پیدا ہو کہ یہ نعمت اس سے چھین لی جائے، تو اس کو حسد کہتے ہیں، یہی وہ بات ہے جو آیت

بالا میں بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آل اسحاق میں بے شمار انبیاء اور رسول بھیجے، مصلحین اور ریفامرس آئے اور آتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل کی اولاد میں نبوت ورسالت رکھنے کا فیصلہ فرمایا: یعنی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو نبی بنایا گیا، اس پر یہودیوں کو حسد ہوا، اور انہوں نے کہا کہ نبوت تو ہماری جاگیر ہے، قرآن کریم میں آیا ہے: وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِكُمْ كُفَّاراً حَسَداً مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ (البقرۃ:١٠٩) (مسلمانو! اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تم کو کافر بنادیں)۔

حضرات! حسد ایسی رذیل عادت اور خطرناک حرکت ہے، جو انسان کو ذلیل ورسوا کردیتی ہے، افراد ہی نہیں، خاندانوں کے چراغ گل کردیتی ہے، اور انسانی وجود کو کھوکھلا کردیتی ہے، قرآن کریم میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں:

١۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا، سب نے کیا، ابلیس نے انکار کردیا، حسد کی بنا پر، اس نے اپنے تفوق کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت سے نکال دیا، اور قیامت تک کے لئے مردود ومطرود گردانا گیا۔

٢۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے: ھابیل اور قابیل، ھابیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ملی، وہ اس پر خوش تھا، لیکن ہابیل کی یہ برتری قابیل کو پسند نہ آئی، اس نے اس سے حسد کیا، اور اس کی بنیاد پر اس کو قتل کرڈالا، پھر اسے پچھتاوا ہوا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ سزادی کہ قیامت تک جتنے قاتل ہیں، ان کا وبال اسی پہلے قاتل (قابیل) پر پڑے گا۔

٣۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے ان کے چھوٹے لڑکے حضرت یوسف سے حسد کی، آخر کار ان کو کنویں میں ڈالا، اور بہانہ کیا کہ بھیڑیا کھا گیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کا سردار بنایا، اور حسد کرنے والے بھائی ذلیل ورسوا

ہوکران کے پاس بھیک مانگنے پہونچے، قرآن کریم نے پوری سورۂ یوسف کا خلاصہ تقوی اور صبر بتایا ہے: ”اِنَّهُ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ.“ (جو تقوی اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ تعالی نیک عمل کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا)

۴۔ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے حسد کیا، اور آپ ﷺ کی دعوت کے چراغ کو گل کرنے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالی نے دشمنوں کی ہزار کوششوں اور حسد کے باوجود دین محمدی کو غالب کیا، اور ”جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ“ کا منظر سامنے آیا۔

حضرات! حسد کے بہت سے اسباب ہیں: ایک بنیادی سبب ذاتی فخر کا غلط استعمال ہے، دوسرا سبب جاہ پرستی اور ریا طلبی ہے، اسلام نے ان تمام چیزوں کی بیخ کنی کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حسد سے بچو، کیونکہ یہ نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے، جس طرح آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے، مصنف عبد الرزاق میں ہے کہ کوئی شخص تین چیزوں سے خالی نہیں رہ سکتا: شگون، بدگمانی، اور حسد، اس لئے جب شگون پیدا ہو تو اس کو منحوس سمجھ کر نہ چھوڑے، بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچا نہ سمجھے، اور حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو۔

حضرات! انسانی دل گھر کی طرح ہے، جس طرح روشن دان سے گھر میں ہوا، روشنی آتی ہے، اسی طرح دل پر اندرونی بیماریوں کا اثر پڑتا ہے، اس لئے گرد وغبار کو صاف کرتے رہنا چاہئے، حسد کے دور کرنے کا سب سے کارگر نسخہ یہ ہے کہ انسان اللہ کے فیصلے پر راضی ہو، کہا جاتا ہے کہ ”اللہ گنجے کو ناخن نہ دے“، کیونکہ اگر اس کے پاس ناخن ہوں گے تو وہ اپنے کو زخمی کرلے گا، اس طرح اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی نعمت سے محروم رکھا ہے تو انسان کی بھلائی اسی میں مضمر ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ نعمت اس کی تباہی کا ذریعہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اس رذیل حرکت سے دور رکھے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

زبان رحمت ہے نہ کہ زحمت

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالىٰ: أعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم. ”مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ.“ (ق: ۱۸) (وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا، مگر یہ کہ اس کے آس پاس ہی ایک تاک میں لگا رہنے والا تیار رہے)

حضرات! انسان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں ایک عظیم نعمت زبان ہے، زبان قدرت کا شاہکار ہے، زبان ایک معصوم آلہ ہے، اس سے دونوں کام لئے جاسکتے ہیں: مثبت بھی اور منفی بھی، اگر اچھے کاموں میں زبان استعمال ہو تو اچھے نتائج اور اگر برے کام میں استعمال ہو تو برے نتائج، زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ کفر سے اسلام کی طرف لے آتا ہے، اور انسان تمام گناہوں سے پاک وصاف ہوجاتا ہے، اور زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ غضبِ الٰہی اور لعنتِ الٰہی کا موجب ہوا کرتا ہے، اور قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

حضرات! قرآن کی ایک عظیم سورت ہے سورۃ الرحمٰن، اس کے بارے میں زبانِ رسالت نے فرمایا: ”لِكُلِّ شَيءٍ عَرُوسٌ، وعَرُوسُ القُرآنِ سُورَةُ الرَّحمن“ (بیہقی، والاتقان فی علون القرآن مؤلفہ سیوطی) (ہر چیز کی ایک زینت اور جمال ہے، اور قرآن کی زینت سورۂ رحمٰن ہے)، اس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کا تذکرہ کیا ہے، اور چاروں چیزیں اعلی درجہ کی ہیں: الرحمنُ، علم القرآنَ، خلقَ الإنسانَ، عَلّمه البَيَانَ۔ (رحمان نے قرآن کی تعلیم دی، اور انسان کو پیدا کیا، اور اس کو قوت گویائی دی)، قوت گوئی انسان کا امتیازی وصف ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے

انسان کو ممتاز فرمایا ہے، اسی وصف کی حفاظت وصیانت کی حدیث پاک میں بار بار تاکید آئی ہے، ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: كُفَّ لِسَانَكَ (اپنی زبان کی حفاظت کرو)، اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ رسول ﷺ سے سوال کیا گیا کہ فتنوں کے زمانہ میں نجات کا راستہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "اِمْلِكْ لِسَانَكَ وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ." (سنن ترمذی، کتاب الزھد: ۲۵۸۶) (اپنی زبان قابو میں رکھو، اور تمہارا گھر وسیع ہونا چاہئے، تاکہ زیادہ تر وقت گھر ہی میں گذارو، اور تم اپنے گناہوں پر روؤ) (سنن ترمذی بروایت عقبہ بن عامر: ۲۴۰۶) حضرت معاذ بن جبلؓ کی طویل حدیث میں ہے کہ یا رسول اللہ! کیا ہمارا مؤاخذہ ہوگا ہماری زبان کی بے اعتدالیوں پر، فرمایا کہ بے اعتدالیاں جہنم تک لے جانے والی ہیں) (هَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلَى وُجُوهِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ (سنن ترمذی: ۲۶۱۶)

حضرات! زبان کے جو بول انسان سے نکلتے ہیں، وہ یا تو سچے ہوتے ہیں یا جھوٹے، سچائی ایمان کی علامت اور جھوٹ نفاق کی علامت ہے، صحیحین کی روایت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہیں سچائی کو لازم پکڑنا چاہیے، کیوں کہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت میں پہنچاتی ہے، اور انسان برابر سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے نزدیک سچا لکھا جاتا ہے، امام مالکؒ نے مرسلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا کہ ممکن ہے، پھر سوال کیا گیا کہ کیا وہ بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر پوچھا گیا کہ وہ جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا: نہیں! سنن ابی داؤد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ ہمارے گھر تشریف فرما تھے، میری والدہ نے مجھے بلایا، اور کہا آؤ، میں تم کو کچھ دیتی ہوں، حضرت رسول پاک ﷺ نے پوچھا کہ کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: کھجور، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر ان کو کھجور نہ دیتیں تو آپ کا شمار جھوٹوں میں ہوتا۔

تفسیر عزیزی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے کتب سیر کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں: ایک بدکار ہوں، دوسری چوری کرتا ہوں، تیسری شراب پیتا ہوں اور چوتھی جھوٹ بولتا ہوں، ان میں جس ایک کو فرمایئے چھوڑ دوں، آپ ﷺ نے فرمایا: جھوٹ نہ بولو، چنانچہ اس نے عہد کیا، جب رات ہوئی تو اس کو شراب پینے کا خیال آیا، پھر بدکاری کا، پھر احساس ہوا کہ کل اگر رسول اللہ ﷺ پوچھیں گے کہ کیا تم نے شراب پی اور بدکاری کی تو کیا جواب دوں گا؟ چنانچہ اس سے باز رہا، دوسری رات چوری کا خیال آیا، اور احساس ہوا کہ کل اگر آنحضرت ﷺ نے پوچھا تو کیا جواب دوں گا؟ چنانچہ وہ اس سے بھی باز رہا، صبح خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں، یہ سن کر آپ ﷺ مسرور ہوئے۔

حضرات! زبان رحمت ہے نہ کہ زحمت، ان کا اختلاف بھی ایک فطری حقیقت ہے: وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ (الروم: ۲۲) زبان اس لئے ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑے، اس سے نکلا ہوا جملہ مردوں میں جان ڈال دے، محبت کے پھول برسائے، بیگانے کو یگانہ، دور کو نزدیک اور دشمن کو دوست بنائے، اس کا کام نفرت پھیلانا، انگارے برسانا، بھائی کو بھائی سے جدا کرنا، نفرت کا زہر پھیلانا نہیں، اگر زبان سے یہی کام لیا جائے تو اس کے مقابلہ میں گونگا اور بے زبان ہونا ہزار درجہ بہتر ہے، تاریخ شاہد ہے کہ خلافت عثمانیہ کا الغاء، اس کے حصہ بخرے کرنا اسی زبان کی عصبیت کا نمونہ ہے۔

زبان ایسی خطرناک چیز ہے کہ قیامت میں اس کے غلط استعمال سے انسان نیکیوں سے محروم ہوگا اور جہنم میں داخلہ کرنے والی چیزیں میں زبان اور شرم گاہ تو بنیادی رول ادا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

دل کی عبادتیں اور بیماریاں

الحمد لله رب العالمین ، والصلاة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آله و صحبه ، ومن تبعهم باحسان الی یوم الدین، أما بعد ، فقد ورد فی الصحیحین عن النعمان بن بشیر رضی الله عنه قال قال النبی ﷺ :۔ ألا وإن فی الجسد مضغة ، إذا صلحت صلح الجسد کله ، وإذا فسدت فسد الجسد کله ، ألا ھی کله (متفق علیه)

حضرات! میں نے ابھی صحیح بخاری وصحیح مسلم کی ایک حدیث پڑھی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ سنو! جسم میں ایک گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتو پورا جسم درست رہتا ہے ،اور اگر وہ خراب ہوتو پورا جسم خراب ہوجاتا ہے، سنو، وہ دل ہے۔ دل کی غیر معمولی اہمیت ہے، پورے جسم انسانی میں اس سے اہم کوئی حصہ نہیں ہے، روحانی اعتبار سے اور جسمانی اعتبار سے زندگی کی بقاء اسی پر ہے، دل کے لغوی معنی الٹنے پلٹنے کے ہیں، چونکہ یہ برابر دھڑکتا رہتا ہے، اس لئے اس کو دل کہا جاتا ہے، دل کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا، مختلف قسم کی کیفیات آتی رہتی ہیں، کبھی غم زدہ ہے، اور کبھی خوش ہوتا ہے، کبھی منشرح ہوتا ہے اور کبھی انقباض میں ہوتا ہے، اللہ کی توفیق کے بغیر اس کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہے، صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إن القلوب بین أصابع الرحمن یقلبها کیف یشاء (رواہ مسلم) بے شک دل اللہ تعالی کی دو انگلیوں کے درمیان ہے وہ جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے دعا سکھائی ہے کہ یا مقلب القلوب ! ثبت قلبی علی دینك (مسلم) (اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر پھیر دے)

حضرات ! قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کی تین قسمیں ہیں :

قلب سلیم وہ دل جو مکمل یکسو اور اطاعت گذار ہو، ایسے ہی دل کو اللہ تعالی نے قلب منیب کہا ہے: رجوع کرنے والا، نافرمانیوں سے توبہ کر اللہ کی طرف پلٹنے والا، اللہ تعالی قرآن میں فرماتا ہے: یوم لا ینفع مال ولا بنون إلا من أتی الله بقلب سلیم (قیامت کے دن نہ مال فائدہ دے گا نہ اولاد، ہاں جو قلب سلیم تمام بیماریوں سے پاک دل لے کر آئے تو وہی کامیاب ہے (الشعراء: ۸۸)، دل کی دوسری قسم قلب مریض ہے یعنی بیمار دل جس کی علامتوں میں غفلت، شک وشبہ میں مبتلا، نفاق کا شکار ہے، منافقین کے تذکرہ میں آیا ہے : فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا ، ولهم عذاب ألیم بما کانوا یعملو (البقرۃ: ۱۰) (ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے، جسے اللہ نے اور بڑھا دیا، اور جو جھوٹ وہ بول رہے ہیں، اس کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ دل کی تیسری قسم قلب میت ہے یعنی مردہ دل، جو روحانی اعتبار سے مردہ ہے، اور شیطان کا گھر ہے، اس پر نصیحت کا کچھ بھی اثر نہیں ،اسی دل کے حاملین کے بارے میں آیا ہے: ختم الله علی قلوبهم (البقرۃ: ۷) یعنی اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ یعنی ہدایت کی پوری صلاحیت ختم ہوچکی ہے۔

حضرات ! دل کی روحانی اعتبار سے تین قسمیں ہوئی: سلیم ، مریض اور میت ۔ رمضان کا مہینہ اسی لئے آتا ہے کہ انسان کے اندر تقوی کی صفات پیدا کرے، اور قلب سلیم یعنی تمام بیماریوں سے آزاد دل ہم کو دے، جس طرح ظاہری عبادات ہم کرتے ہیں، اور ان کی بڑی اہمیت ہے یعنی نماز ، روزہ ، زکاۃ اور حج ، یہ ظاہری عبادات ہیں، ان کے نہ ادا کرنے سے انسان مسلمان نہیں ہوسکتا ہے، اسی طرح کچھ دل کی عبادتیں ہیں، ان کے نہ کرنے سے انسان کا دل بیماریوں سے پاک نہیں رہ سکتا ہے۔

قلب سلیم کی پانچ اندرونی عبادتیں ہیں، ان میں اخلاص، تقوی، صبر، شکر، توکل ہے۔

(۱) پہلی اندرونی عبادت اخلاص ہے، اس کے بغیر دل سلیم نہیں ہوسکتا، اخلاص کہتے ہیں کہ جو بھی کام کریں اللہ کی رضا کے واسطے کریں، کوئی دنیوی مقصد اس میں شامل حال نہ ہو، قرآن میں آیا ہے: فاعبد الله مخلصا له الدین ، ألا لله الدین الخالص (الزمر: ۲) رمضان کا مقصد بھی اخلاص پیدا کرنا ہے، دوسری اندرونی عبادت تقوی ہے، اور تقوی نام

ہے اللہ کے احکامات کو ماننا اور اس کے منع کی ہوئی چیزوں سے رک جانا، احتیاط کی زندگی گذارے، اور اللہ کا استحضار رکھنا، اللہ تعالی قرآن کریم میں فرماتا ہے: فاتقوا اللہ ما استطعتم (التغابن:۱۶) رمضان کا مقصد بھی تقوی پیدا کرنا ہے، تیسری عبادت صبر ہے، اور صبر کے معنی جمنا ہے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا: یـأیها الذین آمنوا اصبروا ، و صابروا و رابطوا، واتقوا الله لعلکم تفلحون (آل عمران: ۲۰۰) اور رمضان کا مہینہ بھی صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کرنے والوں کو اللہ بے حد وحساب اجر عطا فرمائیں گے، چوتھی عبادت شکر ہے: اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکرادا کرنا، اللہ تعالی فرماتا ہے: ما یفعل الله بعذابکم إن شکرتم و آمنتم ، وکان الله شاکر علیما (النساء:۱۴۷) اور پانچویں عبادت توکل ہے، اور توکل کہتے ہیں اللہ پر بھروسہ کرنا اور اس کے وعدوں پر یقین پیدا کرنا، اللہ تعالی فرماتا ہے: وعلی الله فلیتوکل المؤمنون (التغابن : ۱۵) (اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے)

حضرات! اب آیئے دیکھتے ہیں کہ دل کو بیمار، بلکہ اس کو مردہ کرنے والی صفات کیا ہے: روحانی لحاظ سے دل کو مردہ رکرنے والی بیماری تکبر ہے، تکبر تمام برائیوں کی ہے، اللہ تعالی کبریائی اپنی شان بتائی ہے ولـه الکبریاء فی السموات والأرض ،وهو العزیز الحکیم (الجاثیة : ۳۷) ابلیس نے آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں تکبر کیا تو اللہ نے اس کو تمام نعمتوں سے محروم کردیا، اور جنت سے نکال دیا، دل کو مردہ کرنے والی چیز حسد ہے، اور حسد کا مطلب ہوتا ہے کہ انسان دوسرے کی اچھائیوں کو برداشت نہ کر سکے، اور تمنا کرے کہ وہ ختم ہو جائے، حدیث میں صاف آیا ہے کہ جو حسد کرتا تو اس کی نیکیاں اس طرح ختم ہو جاتی ہیں، جس طرح آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے، دل کو مردہ کرنے والی بیماری بدگمانی ہے، بدگمانی ایسی خطرناک بیماری ہے جو بڑے بڑے واقعات کو پیش خیمہ ہوتا ہے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ایـأیها الـذیـن آمنوا اجتنبوا کثیرا مـن الـظـن (الحجرات:۱۲) اے ایمان والو! بدگمانی سے بچو) اور صحیح بخاری میں آیا ہے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، دل کو بیمار کرنے والی چیزوں میں دلوں میں دشمنی پالنا ہے

، ہمیشہ دشمنی کی آگ میں جلنا ہے، اللہ تعالی نے صحابہ کرام کی صفات میں فرمایا ہے کہ وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے دلوں میں کینہ اور دشمنی نہ رکھ، ربـنـا اغـفـر لنا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا(الحشر : ۱۰) ، حدیث میں آیا ہے کہ جمعرات اور دوشنبہ کو بندوں کے اعمال اللہ کے حضور پیش کئے جاتے ہیں، انسان کی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ بغض وعداوت اور دشمنی سے اپنے سینے کو پاک و صاف رکھے اور آخری بیماری ریا کاری ہے، ریا کاری شرک ہے، اور شرک کو اللہ تعالی کبھی برداشت نہیں کرسکتے، اللہ تعالی صاف فرماتے ہیں: جو شخص کوئی اچھا عمل کرے اور میرے ساتھ کسی کو شریک کرے تو میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں (مسلم) اور تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو نماز سے غافل رہتے ہیں، اور دکھاوا کرتے ہیں۔

یہ دل کی پانچ عبادتیں تھیں، اور پانچ بیماریاں ہے، ضرورت ہے کہ رمضان کے مہینہ میں ہم اپنے دلوں کو ان کی اندرونی عبادتوں سے آباد کریں اور ان کے بیماریوں سے دور رکھیں، صحیح مسلم میں آیا ہے کہ ان اللـه لا ینظر إلی أجسامکم ولا إلی صورکم ، ولکن ینظر إلی قلوبکم و أعمالکم (اللہ تمہارے جسموں اور تمہارے صورتوں کو نہیں دیکھتا ہے، بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو آباد کیجئے، عبداللہ بن بسر نامی ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، اور عرض یا رسول اللہ! اسلام کے احکامات تو زیادہ ہیں، کوئی ایسا حکم بتایئے جس کو میں مضبوطی سے پکڑلوں، دیکھو، تمھاری زبان اللہ کے ذکر سے تر وتازہ رہے، سیدنا حسن بصریؒ نے فرمایا: ایمان کی حلاوت، مٹھاس تین چیزوں مین تلاش کرو: نماز میں، ذکر میں اور قرآن کی تلاوت میں، اور قرآن کہتا ہے: اَلا بذکر اللہ تطمئن القلوب، سن لو اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی رمضان کے اس مہینے میں دلوں کو اللہ کے ذکر سے اور اس کی یاد سے آباد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

گناہوں کی سنگینی اوران کے اثرات

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد فقد قال اللّٰہ تعالی: أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم: "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيماً." (النساء: ۳۱) (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جن باتوں سے تم کو منع کیا گیا ہے، اگر ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو معاف کردیں گے)۔

حضرات! دنیا میں ہر مادّی چیز کے کچھ خواص اور اثرات ہوتے ہیں، جن سے انسان متأثر ہوتا ہے، اور اس کو خوشی اور غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً آگ میں گرمی اور جلانے کی صفت ہے، پانی میں ٹھنڈک اور پیاس بجھانے کی صفت ہے، کھانے میں آسودگی اور سیرابی کی صفت ہے، بالکل اسی طرح انسان کے اچھے اور برے اعمال کے بھی کچھ نہ کچھ اثرات اور نتائج رکھتے ہیں، جن سے انسان دوچار ہوتا ہے، اگر انسان اچھے اعمال کرتا ہے، تو انسان کو خوشی ہوتی ہے، طبیعت میں انشراح ہوتا ہے، اس پر سکینت نازل ہوتی ہے، اور اگر وہ بداعمالیاں کرتا ہے تو اس سے بے چینی ہوتی ہے، پریشانی بڑھتی ہے، اور ذہنی ٹینشن میں انسان مبتلا ہوتا ہے۔

حضرات! اللہ تعالیٰ نے ہم کو دو باتوں کا حکم دیا ہے: (۱) ہم اس کے احکامات (فرائض، واجبات، سنتیں، مستحبات، نوافل، صدقات، حلال وحرام) پر عمل کریں، اگر ہم ان پر عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہم کو شایان شان بدلہ دیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا." (الکهف: ۱۰۷)

(۲) دوسرے یہ کہ ہم اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں (حرام، مکروہ وغیرہ) سے بچیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّآتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ." (العنکبوت: ۲۹) (جو لوگ ایمان لائے، اور انہوں نے نیک کام کئے تو ہم ضرور بالضرور ان کے گناہ معاف کردیں گے، اور انہیں ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیں گے)، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے احکامات پر عمل کرنے کا ثواب ملتا ہے اور اللہ تعالی کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔

گناہ دراصل نام ہے اللہ کے حکم کی نافرمانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے روگردانی کرنے کا، گناہ کی مثال کینسر کے زخم کی ہے، جب زخم ہوتا ہے تو ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ آپریشن کے ذریعہ اس کو نکال دیا جائے، نہ نکالنے سے زخم بڑھے گا، اسی طرح گناہ کا علاج یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے، نہ چھوڑنے سے گناہ کی عادت پڑ جائے گی، اور انسان کی روحانی موت ہوگی، گناہ کی مثال آگ کے انگارے کی ہے، انگارے کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، انگارہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس سے دور رہتا ہے، گناہ کی مثال بچھو کی ہے، اگر چھوٹا بچھو بھی نظر آئے تو بھی انسان اس سے بھاگتا ہے، اس لئے گناہ سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

حضرات! اس سے معلوم ہوا کہ کچھ گناہ چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور کچھ بڑے بھی، کچھ ظاہری بھی اور کچھ باطنی بھی، شریعت میں ہر گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا سنگین ہے، لیکن بڑا گناہ اس گناہ کو کہا جاتا ہے، جن پر کوئی حد مقرر ہو، یا ان کے بارے میں لعنت آئی ہو، یا جہنم کی وعید آئی ہو، اور جس گناہ میں یہ کیفیت نہ پائی جاتی ہو تو وہ چھوٹے گناہ ہیں، لیکن چھوٹے گناہ پر اصرار اور دوام ہو تو وہ بھی بڑے گناہ کے حکم میں آجاتے ہیں، ظاہری گناہ وہ ہیں جو ظاہری اعضاء وجوارح سے کئے جاتے ہیں، اور دیکھنے والے ان سے واقف ہوتے ہیں اور چھپے ہوئے گناہ وہ ہیں، جن کا تعلق دل اور عقیدہ سے ہوتا ہے، جیسے کفر وشرک، نفاق،

کینہ وغیرہ۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَذَرُوا ظَاهِرَ الاثمِ و بَاطِنَه، اِنّ الذِينَ يَكسِبُونَ الاثمَ سَيُجزَونَ بِمَا كَانُوا يَقتَرِفُونَ ۔(الأنعام : ١٢٠)

حضرات! چھوٹے اور بڑے گناہ کے سلسلہ میں اللہ کے یہاں ضابطہ ہے کہ اگر انسان بڑے گناہوں سے بچتا رہے، تو چھوٹے گناہ نیک اعمال کی برکت سے معاف ہوجاتے ہیں: اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلاً كَرِيماً، اور اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (ھود:۱۱۴)اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ پانچوں نمازیں، جمعہ اور رمضان یہ سب گناہوں کے لئے کفارہ ہیں، لیکن اللہ کا ایک نظام یہ بھی ہے کہ بڑے گناہوں کو بغیر توبہ کے معاف نہیں فرماتے ہیں، توبہ یہی ہے کہ انسان اللہ کے دربار میں دو رکعت نماز پڑھے، اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرے، توبہ کرنے کے بعد انسان ایسا ہوجاتا ہے جیسا کہ اس کے اوپر گناہ ہی نہیں ہے۔

حضرات! توبہ کے بعد ایک بامقصد زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہے کہ گناہ کی خطرناکی کا ہمیں احساس ہو، اسی کو تقوی، ڈر، اور خوف خدا کہتے ہیں، دنیاوی چیزوں کے بارے میں معلوم ہوجائے کہ اس میں زہر ہے، یہاں سانپ ہے، بجلی کا تار ہے، اس میں کرنٹ ہے، تو ہم بالکل اس کو ہاتھ نہیں لگاتے، بلکہ دور رہتے ہیں، اس طرح اگر ہمیں گناہوں کی خطرناکی کا احساس ہو تو کبھی گناہوں کے قریب نہ جائیں، امام غزالیؒ کا یہ عجیب وغریب حیرت میں ڈالنے والا جملہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہنا چاہئے کہ سب سے بڑا عالم وہ ہے جس پر گناہوں کے نقصانات دوسروں کی بنسبت زیادہ واضح ہوچکے ہوں، ظاہر ہے کہ یہ کیفیت یوں ہی نہیں پیدا ہوگی، بلکہ اللہ والوں کے پاس بیٹھنا ہوگا، اور زبان نبوت سے نکلے ہوئے یہ الفاظ دہرانے ہوں گے: اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُولُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيكَ. (سنن ترمذی:۳۸۴۱) اے اللہ! میں آپ کا ایسا ڈر مانگتا ہوں جو میرے درمیان اور گناہوں کے درمیان حائل ہوجائے)۔

حضرات! انسان سے گناہ ہو اور وہ توبہ نہ کرے تو اس کا مطلب ہے کہ آخرت کے بارے میں اس کا یقین کمزور ہو گیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ دنیا ہی کو انسان سب کچھ سمجھتا ہے، کہتا ہے کہ دنیا نقد ہے، اور آخرت ادھار، جب کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: نَبِّئْ عِبَادِيْ اَنِّي اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ، وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ. " (میرے بندوں کو بتادو کہ میں بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں اور میرا عذاب بہت دردناک ہے)، امام حسن بصریؒ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا کہ حضرت! بتائیے: میں گناہ گار ہوں، کیا کروں؟ فرمایا: استغفار کرو، اس نے کہا: بارش نہیں ہورہی ہے، اولاد نرینہ نہیں ہے، باغ میں پھل نہیں ہے، انہوں نے ان کے بارے میں کہا: استغفار کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: "فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ، اِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَاراً، وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهَاراً." (نوح:۱۰-۱۲)(چنانچہ میں نے کہا: اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو، بے شک وہ ہے بھی بڑا مغفرت کرنے والا، وہ تم پر کثرت سے بارش بھیجے گا اور ترقی دے گا تمہارے مال واولاد میں، اور تمہارے لئے باغ لگادے گا اور تمہارے ندیاں بہادے گا)۔

حضرات! خلاصہ یہ ہے کہ گناہوں کے جراثیم ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے دل کالا ہوجاتا ہے، گناہ کرنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے، شیطان خوش ہوتا ہے، انسان جہنم سے قریب ہوجاتا ہے، جنت سے دور ہوجاتا ہے، حافظہ کمزور ہوجاتا ہے، جسمانی قوت ختم ہو جاتی ہے، عبادت کی لذت ختم ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو گناہوں سے بچالیں اور نیک کاموں کی توفیق دیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

اسلامی معاشرہ اور ہمارا مزاج

الحمد لله ربّ العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد ! فقد قال الله تعالى : الا تفعلوه تكن فتنة فى الأرض و فساد كبير (الأنفال :۷۳۔)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا کرپشن پھیل جائے گا۔

حضرات! انسان ایک معاشرتی مخلوق ہے، وہ تنہا اس دنیا میں نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے پورا انسانی معاشرہ قائم فرمایا ہے، لفظ انسان کے معنی ہی ہوتے ہیں: انس والا، محبت والا، ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والا، یہ عمل اگرچہ دنیاوی عمل ہے، لیکن اگر اللہ کے لئے ہو تو مستقل عبادت بن جاتا ہے، اور قیامت کا دن عرش کا سایہ دلانے والا ہوتا ہے۔

یہ تو عام انسان کی بات ہوئی، لیکن ایک عام انسان اور ایک سچے مسلمان کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے، ایک مسلمان اللہ کے نور کے سایہ میں چلتا ہے، اجالے میں سفر کرتا ہے، اب اگر دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں، محبت کرتے ہیں سچی اور اخلاص پر مبنی تعلق رکھتے ہیں تو وہ نور ونکہت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، تاریکی ان سے دور بھاگتی ہے ،اور رحمت الٰہی ان کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم کی سورۂ حجرات میں کہہ دیا گیا کہ انما المؤمنون اخوۃ (ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں) اور صحیح بخاری میں رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کو ایک جسم سے تشبیہ دی ہے، اگر ایک عضو میں تکلیف ہو جائے تو پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس مثال کی معنویت پر غور کیجئے کہ جسم کے تمام اعضاء یکساں اہمیت اور حیثیت کے حامل نہیں ہوتے ، دماغ پورے جسم کا بادشاہ ہے، اس کے چشم وابرو کے اشارہ پر جسم کا انگ انگ کام کرتا ہے،

اور وہ پورے بدن کے لئے پاور ہاؤس ہے، اور اگر کسی حصہ کی سپلائی چھوڑ دے تو لمحوں میں اس حصہ کی موت ہو جائے، اسی طرح دوسرے اعضاء کچھ زیادہ اہم ہیں، اور کچھ کم، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ انگلی کو تکلیف ہو تو دماغ یہ سوچے کہ ایک انگلی کے لئے ہم کیوں رنج وغم میں مبتلا ہوں اور پاؤں بھی نہیں سوچتا کہ انگلی کو تکلیف ہے، ہم کیوں دواخانہ جائیں، یہاں تک کہ ناخن بھی ضرورت سے زیادہ کٹ جائے تو پورا جسم کسک محسوس کرتا ہے۔

اسی طرح پورا اسلامی خاندان ہے، ایک دوسرے کے لئے لائق محبت ہے، کوئی مسلمان غریب ہو، ان پڑھ ہو، کسی جماعت اور مسلک کا ہو، کسی علاقہ اور ملک کا رہنے والا ہو، صرف اس فرق کی وجہ سے وہ مدد کا مستحق نہ ہو، انسان کے لئے محبت کی شبنم بننے کے بجائے نفرت کا شعلہ بن جائے، تو یہ ایمان کی کمزوری ہے، جس کا ایمان جتنا زیادہ مضبوط ہوگا، وہ اسی قدر ایک دوسرے کا خیال رکھنے والا ہوگا، اور اس کے درد وکرب کو اپنا درد وکرب سمجھے گا۔

اسی اسلامی رشتہ کو رسول اکرم ﷺ نے ایک دوسری مثال سے سمجھایا ہے مسلم شریف کی روایت ہے، فرمایا: پوری امت ایک عمارت، ایک بلڈنگ کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، اور ہر ہر اینٹ ایک دوسرے کے لئے مضبوطی کا سبب بنتی ہے، اس مثال پر بھی غور کیجئے کہ عمارت کے تمام اجزاء ایک درجہ کے نہیں ہوتے ، بنیاد کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، پھر ستون ہیں، اس کے بعد چھت ہے، دیواریں اور فرش عمارت کا حصہ ہیں، عمارت کا ایک حصہ سر پہ سایہ فگن ہے، اور ایک حصہ قدموں کے نیچے روندا جاتا ہے، بنیاد کے پتھر نظر نہیں آتے، لیکن عالی شان گنبد ایک دوسرے کو دعوت نظارہ دیتے ہیں، بنیاد اپنے کو دبا کر ایک دوسرے کو بلند کرتی ہے۔

یہی حال امت کے افراد کا ہے، کوئی زیادہ اہم ہے کوئی کم اہم، کسی نے ایک کام سنبھالا، کسی نے دوسرا کام، کسی نے خود کو گمنامی میں رکھ کر دوسروں کو بلند کیا ہے، لیکن ایک دوسرے کے معاون اور مددگار رہیں، اگر دیوار کی ایک اینٹ نکال دی جائے ت وعمارت کمزور ہو جائے گی، اسی طرح امت ایک فرد یا شخص کو اگر حقیر سمجھا جائے گا، اس کی بے

توقیری کی جائے گی تو پورا اسلامی معاشرہ کمزور سے کمزور تر ہو جائے گا۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرنے میں پوری امت کا بقا اور اس کا تحفظ ہے۔

حضرات! ایمان والوں کا مزاج باہمی تعاون اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا ہونا چاہئے، مدنی معاشرہ میں صحابہ کرامؓ کو حال کچھ ایسے ہی تھا، وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے، کہاں حبشہ کے بلال، کہاں روم کے صہیب، کہاں ایران کے سلمان، کہاں اسرائیلی نسل کے عبد اللہ بن سلام، اور بنو ھاشم کے علی وعباس اور دوسرے عرب ابو بکرو عمر سب کو اسلام نے ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا، اور سب ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے اور خود مٹ کر دوسروں کو فائدہ پہونچانے والے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ نے کتاب الزھد میں نقل کیا ہے کہ یرموک کی جنگ میں ابوجہم اپنے چچازاد بھائی کی خبر گیری کرنے لئے کے نکلے کہ ان کو پانی پلادیں، قریب ایک دوسرے زخمی کی کراہ انہوں نے سنی تو ان کو پانی پلانے کا اشارہ کیا، وہ آگے بڑھے تو دوسرے ساتھی نے تیسرے کی کراہ سنی، تو اس کی طرف اشارہ کیا، جب تیسرے کے پاس پہونچے تو ان کی روح پرواز کر چکی تھی، دوسرے کے پاس آئے تو وہ بھی انتقال کر چکے تھے، اور اپنے چچازاد بھائی کے پاس آئے تو وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، یہ اسلامی بھائی چارہ کہ جان دے دی، لیکن اپنے بھائی سے پہلے پانی پینا گوارا نہیں کیا۔

حضرات! سورۂ انفال کے اخیر میں اللہ تعالی نے مہاجرین اور انصار کا تذکرہ کیا ہے اور صراحتا اعلان کیا ہے کہ جو کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، مددگار ہیں، تو مسلمانو! تم بھی اپنے مسلمان بھائیوں کا ہر طرح خیال رکھو، ان کے ساتھ اچھا سلوک ہو، اچھی اخلاق ہوں، تجارتی لین دین ہو، باہمی مشورے اور مذاکرے ہیں، اگر ایسا نہیں کروگے اور کافروں سے راہ ورسم بڑھاؤ گے تو جانتے ہو کیا ہوگا کہ زبردست فتنہ برپا ہوگا، اور ہر طرف بگاڑ پھیل جائے گا، والذين كفروا بعضهم أولياء بعض، الا تفعلوه تكن فتنة فتنة الأرض و فساد كبير ۔(الأمفال : ۷۳)

حضرات! مسلمانوں کے باہمی حقوق میں پہلی بات یہ ہے کہ سارے مسلمان دوسرے مسلمان کی عزت واکرام کریں، اللہ تعالی نے آدم کی اولا دکو عزت وعظمت عطا فرمائی، اس اعلان کے مطابق ہر شخص معزز ومکرم ہے، اللہ کے ڈر اور خوف کے علاوہ کسی بنیاد پر کوئی فضیلت وبرتری حاصل نہیں، رسول اکرم ﷺ نے انسانی خون، مال اور عزت کو اتنا عظیم اور محترم بنایا جتنا اللہ کے شعائر ہیں، اس لئے خواہ مخواہ کسی کو ذلیل کرنا، کسی کی عزت سے کھیلنا، کسی پر الزام لگانا یہ اللہ تعالی کے نزدیک بڑے بھیانک اور سنگین جرم ہیں۔ جس سے تمام مسلمانوں کو بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

دوسری بات یہ کہ ایک دوسرے کا تعاون اور مدد کرنا عین ایمان ہے، آج کل یہ فیشن بنتا جا رہا ہے کہ غیروں سے بڑی بڑی راہ ورسم ہے، لیکن اپنوں سے دوری اور مہجوری کی کیفیت ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ کا صاف اعلان ہے کہ اللہ تعالی بندے کی مدد اسی وقت کرتے ہیں جب وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے۔

تاریخ کا واقعہ ہے، بہت دور جانے کی ضرورت نہیں، بغداد میں دو دوکاندار آمنے سامنے رہتے تھے، دونوں ایمان دار اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے تھے، ایک دن ایسا ہوا کہ ایک دوکاندار کے پاس تو بہت سے گاہک آئے، دوسرے کے پاس نہیں آئے، جس کے پاس گاہک آرہے تھے وہ دیکھ رہا تھا کہ میرا بھائی صبح سے خالی بیٹھا ہے، اس کے پاس کوئی گاہک نہیں گیا، اس نے خریداروں سے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا کہ بھائیو! سامنے والے دکان پر وہی سامان مل جائے گا، جو تم مجھ سے لینا چاہتے ہو، آج میرے پاس بہت سے خریدار آئے، لیکن میرے بھائی کے پاس نہیں گئے، اس لئے وہاں جا کر خرید لو

یہ ہے ایثار اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا، اگر اس طرح کے جذبات مسلم معاشرہ میں ایک دوسرے کے دل میں ہوں گے تو وہ معاشرہ چین وسکون کی زندگی بسر کرے گا۔

اللہ تعالی ہم کو صحیح اسلامی روح کے ساتھ زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين ۔

لقمان علیہ السلام کی نصیحتیں اور ان کا تربیتی پہلو

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد ، فقد قال الله تعالى : ولقد آتينا لقمان الحكمة أن اشكر لله (لقمان :۔۱۲) اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ہم نے حضرت لقمان کو حکمت دی کہ اللہ کا شکر ادا کریں۔

محترم حضرات! سورۂ لقمان قرآن مجید کے اکیسویں پارے میں ہے، اس میں چار رکوع اور چونتیس آیتیں ہیں، اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے مضامین کو کھول کھول کر بیان کردیا گیا ہے، شرک کی حقیقت، والدین کے ساتھ حسن سلوک، ہر چھوٹی بڑی چیز پر اللہ کی نظر، نماز قائم کرنا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، تواضع اختیار کرنا، تکبر سے بچنا، اور درمیانی چال چلنا، آواز ہلکی رکھنا بھی ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ پانچ چیزوں کا علم صرف اللہ کے کے پاس ہے: قیامت کب آئے گی، بارش کب ہوگی، ماں کے کے پیٹ کیا ہے؟ کل کیا ہوگا، اور کس کی موت کہاں آئے گی (لقمان:۳۴)

محترم حضرات! لقمان علیہ السلام کون تھے؟ قرآن تو اس سلسلہ میں خاموش ہے، لیکن تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے، بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ آزر کی اولاد میں تھے، لقمان بن باعورا نام ذکر کیا جاتا ہے، ان کی عمر ایک ہزار سال بتائی جاتی ہے، اللہ تعالی نے ان کو حکمت ودانائی عطا فرمائی تھی، وہ نبی نہیں تھے، لیکن ان کی دانائی ضرب المثل ہے، تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے آقا نے ان کو ایک بکری دی اور کہا کہ لقمان اس کو ذبح کرو اور اس کی سب سے اچھی چیز لے کر آؤ، وہ گئے اور ذبح کیا اور دل اور زبان لے کر آئے، پھر کچھ دنوں کے بعد ان کے آقا نے ان کو بکری دی اور کہا کہ سے سب سے خراب چیز لے کر آؤ، وہ گئے، اور ذبح کیا اور زبان اور دل لے کے آئے، ان کے

آقا نے کہا کہ تم سے اچھی لانے کو کہا تو تم زبان اور دل لے کر آئے اور اچھی چیز لانے کو کہا تو زبان اور دل لے کر آئے تو انہوں نے جواب دیا کہ زبان اور دل اگر دونوں پاک ہوں کو ان سے اچھی کوئی چیز نہیں، اور اگر زبان اور دل گندے ہوں تو ان سے خراب کوئی چیز نہیں۔(تفسیر ابن کثیر)، عربی شاعر کہتا ہے: إنما المرء بأصغريه وكل امرء رهن بما لديه (انسان اپنی دو چھوٹی چیزوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے، اور ہر شخص ہو وہی ملے گا جو اس نے کیا ہے)، تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ نے حکمت و دانائی کہاں سے سیکھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ چار باتوں سے حکمت سیکھی ہے: (۱) سچائی (۲) امانت داری (۳) لغو باتوں سے اجتناب (۴) خاموشی سے۔

حضرات! لقمان علیہ السلام کی جو نصیحتیں قرآن میں مذکور ہیں: ان کی دو قسمیں ہیں: (۱) اللہ کا حق (۲) دوسرے بندوں کا حق۔ جہاں تک اللہ کے حق کا تعلق ہے تو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ اللہ کو ایک ماننا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، کیونکہ شرک کرنا ایک بڑا ظلم ہے، اسی عقیدہ کو حضرت لقمان نے دوسرے الفاظ میں اس طرح سمجھایا کہ دیکھو دنیا میں ہر چیز اللہ کے کرنے سے ہوتی ہے، ایک پتہ ہل نہیں سکتا، ایک ذرہ اڑ نہیں سکتا، ایک قطرہ ٹپک نہیں سکتا، جب تک اللہ کا اشارہ نہ ہو، اگر زمین کی تہوں میں، آسمان کی بلندیوں میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر اگر کوئی چیز ہے تو اللہ تعالی اس سے بھی واقف ہے: مسند احمد کی روایت ہے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لو أن أحدكم يعمل عملا في صخرة صماء ليس لها باب ولا كوة ، لخرج عمله للناس كائنا ما كان (مسند احمد بروایت ابوسعید خدری)، اگر کوئی شخص بند چٹان میں بھی کوئی کام کرے جس میں کوئی دروازہ اور روشن دان نہ ہو تو بھی اللہ تعالی اس کے عمل کو ظاہر کردیں گے)، یہ بنیادی عقیدہ ہمارے ذہنوں میں ہونا چاہیئے، ہم اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھیں اور تعلیم کریں، مذاکرہ کریں اور واقعات کی روشنی میں اس عقیدہ کو مضبوط کریں، خدا کی قسم! اگر ہم نے ااپنے

بچوں کو وقت دیا اور ایسی باتوں کی تلقین کی تو ان شاء اللہ وہ بچہ ایسا ہوگا کہ اللہ کی وحدانیت پر قائم رہے گا اور شرک وبت پرستی اور الحاد سے دور ہوگا۔

حضرات ! دوسرا حق اللہ کے حق کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے، یاد رکھیں یہ تمام حقوق میں سب سے بڑا حق ہے، والدین جو دنیا میں ہمارے آنے کا ذریعہ ہیں، ان کی خوشی میں اللہ کی خوشی پوشیدہ ہے اوران کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی پوشیدہ ہے، ان کا خیال رکھنا، اگر کافر ومشرک ہوں تب بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے، بخاری ومسلم میں ہے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میری رضاعی والدہ مکہ سے آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرسکتی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی خاطر کرو، اوران کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ زندگی میں ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دیں اور موت کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا اوران کے نام سے نفلی صدقات کرنا یہ دینی وایمانی فریضہ ہے۔ یہ دونوں حق بہت ضروری ہیں، لقمان علیہ السلام نے خاص طور پر ان دونوں حق ادا کرنے کی تلقین کی، اوران کا اثر بیٹے پر یہ ہوا کہ بیٹا جو مشرک تھا وہ فرمانبردار ہوگیا، اوراپنے والد کا تابعدار ہوگیا ہوتو اللہ تعالی نے کہا کہ شکر ادا کرو، حضرت سفیان بن عیینہ کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ جو پانچوں نمازیں پڑھتا ہے تو گویا اس نے اللہ کا شکر ادا کیا، اور جس نے والدین کے لئے نمازوں کے بعد دعا کی تو اس نے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔

حضرات ! حضرت لقمان کی نصیحتوں میں نماز قائم کرنا ہے، نماز قائم کرنے کا لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے، نماز پڑھنے کا نہیں، اس کا مطلب یہ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں، اطمینان کے ساتھ نماز پڑھیں، نماز کی تلقین کرکے نماز پڑھیں تو یہ نماز پڑھنا معتبر ہے، ماشاءاللہ اس مسجد میں بڑی تعداد میں لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں، اور جمعہ کی نماز کو جامع کبیر ہی میں پڑھنے کا حکم ہے، اس سے اتحاد واتفاق کا بھی اظہار ہوتا ہے، آپس کی دوریاں ختم ہوتی ہیں، اور دلوں سے رنج وعداوت دور ہوتی ہے، لیکن صفوں کو درست کرنا یہ بھی نماز کا بنیادی حصہ ہے۔ تو نماز قائم کرنے میں یہ بھی ہے کہ صفوں کی درستگی کا اہتمام کیا جائے۔

حضرات ! حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں میں یہ بھی ہے کہ اچھی بات کا حکم دینا اور بری بات سے روکنا، یاد رکھئے، امر بالمعروف کا سب سے اچھا عمل ہے کہ انسان عملی نمونہ پیش کرے، عملی نمونے سے جس قدر مؤثر انداز میں دعوت کا کام ہوتا ہے، اس سے بہتر کسی اور ذریعہ سے وہ نہیں سکتا، دعوت اور تبلیغ کا کام گھر ہی سے کرنا چاہئے، سیرت کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشتہ داروں کو کھانے پر مدعو کیا اور پھر اپنی بات پیش کی، گھر میں بچوں کو لے کر بیٹھنا اور تعلیم کرنا اوران کو وقت دینا اور عملی نمونہ کے ذریعہ ان کی تربیت کرنا یہ سب امر بالمعروف میں داخل ہے، اور خوش اسلوبی سے ان کو غلط کام سے روکنا بھی ضروری ہے، ابھی میں تفسیر دیکھ رہا تھا تو اس میں سورہ مائدہ کی اس آیت لو لا ينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الاثم، لبئس ما كانوا يصنعون (المائدة) کی تفسیر میں البحر المحیط کے حو الہ سے لکھا ہے کہ یوشع بن نون کی قوم میں ایک لاکھ ہلاک کئے گئے، چالیس ہزار وہ تھے، جو اپنے طور پر تو ٹھیک تھے، لیکن لوگوں کو صحیح بات کی تلقین نہیں کرتے تھے، امر بالمعروف میں ترتیب ہے کہ اگر برائی ہاتھ سے دور کرسکتا ہے تو ہاتھ سے دور کرے، زبان سے کرسکتا ہے تو زبان سے دور کرے اور آخری درجہ ہے کہ دل سے تو برا تو سمجھے ورنہ ایمان ہی نہیں ہوگا۔

حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں میں یہ ہے ناگوار باتوں پر صبر کرنا (إنما يوفى الصابرون أجرهم بغير حساب) خوش اخلاقی سے ملنا (تبسمك فی وجه أخيك صدقة) ، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا (متکبرانہ چال اللہ کو سخت ناپسند ہے، (تین لوگ ایسے ہیں، جن پر اللہ رحمت کی نظر نہیں کریں گے، جھوٹی قسم کھا کر سامان کو بیچنے والا، احسان جتانے والا، ٹخنوں سے نیچے اپنے لباس کو لٹکانے والا) اور آواز کو پست رکھنا، یہ سب امور ایسے ہیں جن سے ایک پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ معاشرہ میں ان امور پر توجہ دی جائے اور اپنے حقوق کو پورے طور پر ادا کیا جائے، غرض یہ تمام باتیں اور نصیحتیں قرآن کریم میں مذکور ہیں، ان پر عمل کرنا ہی ہماری زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

نکاح

انسانی ضرورت اور دائمی عبادت

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين ،أما بعد ! فقد قال الله تعالى ، أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم: فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ، لا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللهِ ، ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ، وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (الروم: ٣٠) اللہ کی عطا کی ہوئی فطرت کی پیروی کیجئے ،جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہی سیدھا اور درست دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

حضرات!

بنیادی طور پر اللہ تعالی نے اس کائنات میں دو نظام بنائے ہیں: ایک تکوینی نظام جیسے سورج کا نکلنا اور ڈوبنا، رات کا آنا اور جانا، اور زندگی اور موت کے واقعات وغیرہ، اسی نظام کے ساتھ ایک دوسرا نظام بھی اللہ تعالی نے دیا ہے، اور وہ ہے تشریعی ،قانونی اور آئینی نظام، ہر انسان کو ولادت سے لے کر موت تک اس نظام کے مطابق چلنا ہے، اس کے بغیر اس کی زندگی انسانی زندگی نہیں ہوسکتی۔ اسی نظام کا ایک اہم عنصر نکاح ہے، اسلام نے نہ صرف یہ کہ نکاح کی اجازت دی ہے، بلکہ اسے پسند کیا ہے، اور اس کی ترغیب دی ہے، اور نکاح نہ کرنے والی زندگی سے منع کیا ہے، مسلم سماج کے بے نکاح لوگوں کے نکاح کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوا: وَأَنْكِحُوا الأَيَامَى مِنْكُمْ (بے نکاح لوگوں کا نکاح

کراؤ)، انبیاء کرام جو کائنات کی عظیم ہستی ہوتے ہیں ان کے بارے میں آیا ہے کہ وہ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہوا کرتے تھے، سورۂ رعد میں ہے: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وذُرِّيَّةً (رعد: ٣٨) (اور یقیناً آپ سے قبل ہم نے پیمبر بھیجے، اور ان کے لئے بیویاں اور بچے رکھے)۔ اللہ تعالی نے اپنے نیک بندوں کی اس دعا کو سراہا گیا کہ وہ سکون بخش بیوی اور اولاد کے لئے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں: رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ (الفرقان : ٧٤) (اور یہ لوگ ہیں جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما)

حدیثوں میں بھی کثرت سے نکاح کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں صراحتیں موجود ہیں، صحیح بخاری میں آپ ﷺ نے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ ضرور نکاح کرلے، صحیح بخاری میں آیا ہے کہ کچھ صحابہؓ نے یہ ارادہ کیا کہ وہ نکاح نہیں کریں گے، تو آپ ﷺ نے ناپسندیدگی کا ظہار فرمایا، اور فرمایا: جن نے میرے طریقہ سے انحراف کیا وہ مجھ سے نہیں ہے، آپ ﷺ نے نکاح کو نہ صرف اپنی سنت، بلکہ اللہ کے رسولوں کی سنت قرار دیا، ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار چیزیں انبیاء کرام کی سنت ہے: حیاء، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا۔ اور سنن نسائی میں آیا ہے: لوگو! تمہاری دنیا کی تین چیزیں مجھے محبوب ہیں: عورتیں، خوشبو، اور میرے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ (سنن نسائی، کتاب عشرۃ النساء: ٣٩٥٧)

حضرات! نکاح کا بنیادی مقصد نسل انسانی کی بقاء ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو حضرت حواء کو پیدا کیا، اور بخاری میں آیا ہے: تَنَاكَحُوا تَنَاسَلُوا (نکاح کرو نسل بڑھاؤ) اور آیا ہے: تَزَوَّجُوا الوَدُودَ الوَلُودَ (محبت کرنے والی اور زیادہ بچے والی عورت سے شادی کرو)۔

دوسرا مقصد عفت وعصمت کی حفاظت ہے،اور فطری طریقہ پر انسان کی نفسیاتی ضرورت کی تکمیل،یہی وجہ ہے کہ آپ نے نکاح کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے،اور فرمایا: نکاح انسان کو بدنگاہی سے بچاتا ہے،فانه أغضُّ للبصَر و أحصَنُ للفرْج ۔

تیسرا مقصد یہ ہے کہ ایک دوسرے سکون حاصل کرنا ہے،قرآن میں آیا ہے:

لِتَسْكُنُوا اِلَيْهَا (الروم:۲۱)

حضرات! مرد اور عورت کے باہمی تعلق کے لئے بہترین تعبیر لباس کی استعمال کی ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ ، وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لهنَّ لباس سے زیادہ کوئی چیز جسم انسانی کی ہمراز،،انسانی خوبیوں سے باخبر اور موسموں کی شدت سے صحت کی محافظ نہیں ہوتی۔

حضرات! یہ مجلس نکاح ہے،مجلس نکاح مجلس معاہدہ ہے،معاہدہ میں ڈرنا اور خوف کھانا اور لحاظ کرنا نہ ہو تو معاہدہ باقی نہیں رہتا،اس لئے اس موقع پر جو تین آیتیں پڑھی جاتی ہیں،ان میں تقوی اور ڈرنے کا خاص طور سے حکم دیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ آج نیا رشتہ قائم ہو رہا ہے،لیکن پرانے رشتے ختم نہیں ہوئے،جوں کا توں باقی ہیں،ان کا لحاظ رہنا دو فائدوں کا ضامن ہے: عمر میں برکت اور رزق میں برکت۔

تیسری بات یہ کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے، اس کو ہر موقع پر پیش نظر رکھا جائے، اس سے سرمو انحراف نہ کیا جائے۔

چوتھی بات یہ کہ جو بات کہی جائے وہ سچی ہو اور سوچ سمجھ کر ہو تو اللہ تعالی اس کی برکت سے گناہ معاف کردیں گے اور بگڑے کام بنادیں گے۔دعا ہے کہ اللہ تعالی آج کی اس مجلس کو قبول فرمائیں اور اس کی برکت میاں بیوی کے درمیان منتقل فرمائیں۔آمین۔

خطبۂ جمعہ

الحمد لله ، نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل

عليه ، و نعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيآت أعمالنا ، من يهده الله ، فلا مضل له ، و من يضلله فلا هادئ له ، و نشهد أن لا اله الاالله وحده ، لا شريك له ، و نشهد أن سيدنا محمد ا عبده و رسوله ، صلى الله عليه وعلى آله و أصحابه وأزواجه وذرياته وأهل بيته ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين أما بعد : فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم : يأيها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا كثيرا و نساء ، واتقوا الله الذى تساء لون به والأرحام ، ان الله كان عليكم رقيبا ۔ وقال تعالى : يأيها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن الا وأنتم مسلمون ، وقال تعالى : يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله و قولوا قولا سديدا ، يصلح لكم أعمالكم ويغفرلكم ذنوبكم ، ومن يطع الله و رسوله فقد فاز فوزا عظيما ، وقال النبى ﷺ النكاح من سنتى ، (سنن ابن ماجه) وقال: فمن رغب عن سنتى ، فليس منى (بخارى ومسلم)

حالاتِ حاضرہ اور مسلمان

حالات کے مقابلہ کی کلید

الحمد للّٰہ ربّ العالمین ، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلہ و أصحابہ ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین، أما بعد ! فقد قال اللّٰہ تعالی :"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاۃِ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ." (البقرۃ: ۱۵۳) (اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ کی مدد چاہو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

حضرات! یہ دنیا آزمائش کا گھر ہے، اسے دار الامتحان کہا جاتا ہے، اس میں قسم قسم کے حالات پیش آتے رہتے ہیں، کبھی خوشی، کبھی غم، کبھی اطمینان، کبھی بے چینی، کبھی آسانی، کبھی سختی، یہ تمام مراحل گاہے بگاہے پیش آتے رہتے ہیں، اوران کے ذریعہ انسان کے ایمان کا امتحان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً، وَاِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ."(الأنبیاء: ۳۵) (ہم خیر وشر کے ذریعہ تم کو آزمائیں گے، اور تم کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے)، "وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ (الأنبیاء: ۳۵) (اور ہم تم لوگوں کو ڈر، بھوک اور مال وجان اور پھلوں میں کمی کے ذریعہ ضرور آزمائیں گے)۔

ایسی آزمائشوں اور نامساعد حالات میں یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ یہ حالات وقتی ہوتے ہیں، دائمی نہیں ہوتے، طوفان آتے ہیں، اور اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ نہیں بچے گا، لیکن اپنی تباہ خیزیوں کے ساتھ گذر جاتے ہیں، موجیں اٹھتی ہیں اور وہ ساحل کو روند کر چلی جاتی ہیں، آتش فشاں پھوٹتے ہیں، اور زمین کے سینے میں جو لاوے چھپے ہوئے ہیں وہ باہر آکر ساکت وجامد ہو جاتے ہیں، لیکن ان کو ثبات ودوام نہیں ہوتا، انسان

کی شخصی زندگی میں بھی اس طرح کے طوفان اٹھتے ہیں، جن سے دل لرز جاتے ہیں، اور قدم ڈگمگا جاتے ہیں، لیکن وہ بھی چند دنوں کے بعد تھم جاتے ہیں، ایسے موقع پر انسان کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ آزمائش کے لمحات ہیں، اور بہت جلد ختم ہو جائیں گے، اور آزمائش دو سبب سے ہوتی ہے: یا تو وہ گناہوں اور معصیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے: "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ" (الروم: ۴۱) (خشکی اور تری میں لوگوں کے کرتوتوں کے کرپشن پھیل چکا ہے)، یا وہ رفع درجات کا ذریعہ ہوتی ہے: "أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ." (سنن دارمی، کتاب الرقاق: ۲۸۳۹) (لوگوں میں سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے، پھر ان سے قریب ترین افراد کی، پھر ان سے قریب تر لوگوں کی)

ایسے موقع پر اگر انسان استقامت کا ثبوت دے، جذبات سے مغلوب نہ ہو، رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو کر کوئی غیر دانشمندانہ اقدام نہ کر بیٹھے تو یہی مصیبت اس کے لئے راحت جاں اور وقتی پستی دائمی سربلندی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، ایسے موقع پر ایمان والوں کے لئے دو باتوں کی تلقین کی گئی ہے: صبر اور دوسرے صلاۃ: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ." اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ کی مدد چاہو۔

حضرات! صبر کے معنی جم جانے کے ہیں، پسپائی اور ہزیمت کے نہیں، بلکہ اخلاقی جرأت،، دل کی مضبوطی اور پامردی واستقلال کے ہیں، قرآن کریم میں ہے کہ پیغمبروں کے بہت سمجھانے کے باوجود کفار پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کا تذکرہ قرآن اس طرح کرتا ہے: "اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا." (الفرقان: رکوع ۴) (یہ شخص تو ہم کو اپنے بتوں سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم ان پر صابر (ثابت، جمے) نہ رہتے)۔

حضرات! صبر کا لفظ جیسے ہی آتا ہے تو قرآن میں اس کے تین مثالیں ملتی ہیں اور وہ اس کے معنی، مفہوم، پیغام کی تعیین کرتی ہیں:

(۱) موسی اور فرعون کے واقعہ کو ذہن میں تازہ کیجئے، جادوگروں نے موسی کے مقابلہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا، لیکن موسی علیہ السلام نے جب اپنی لاٹھی ڈالی تو ان کا سارا سوانگ ختم ہو گیا، جادوگروں نے کہا کہ جادو کے فن سے تو ہم خوب واقف ہیں، موسی کے پاس جو کچھ ہے وہ جادو نہیں ہو سکتا، چنانچہ انہوں نے بھرے مجمع میں اپنے اسلام کا اعلان کر دیا، فرعون بہت تلملایا، چیخا، چلایا، اور دھمکی دی کہ اگر ایمان اور اسلام لانے سے نہیں پھرے تو تم کو قتل کر کے درختوں پر لٹکا دیں گے، ان اسلام کے جیالوں نے بھی بڑے جوش اور ولولے میں کہا: فرعون! تم کو جو کرنا ہے کر لو، اب ہم اپنے دین اور ایمان سے پھرنے والے نہیں۔ یہ ہے ایمان پر استقامت اور دین پر جمے رہنا۔

(۲) دوسرا نمونہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ہے، سخت آزمائشوں سے گذرتے ہوئے وہ مصر کے دربار میں پہونچے، وہاں بادشاہ مصر کی بیوی نے ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا، اور ان کو برائی کی طرف مائل کرنا شروع کیا، لیکن یوسف علیہ السلام نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی، اور گناہوں سے بچے رہے، ہمت کی، آگے بڑھے، بند دروازے خود بخود کھلتے چلے گئے۔ سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے: مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهُ. (جو اللہ کے لئے ہوتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہوتا ہے)

(۳) تیسرا نمونہ حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر میں ہے کہ پورا جسم تکلیف و درد سے کراہ رہا ہے، لیکن ان کی زبان پر ایک بھی حرف شکایت نہیں، اگر کسی سے درخواست کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالی ہے، جس سے یہ کہتے ہیں: رَبِّ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (اے میرے رب! مجھے سخت بیماری لگ گئی ہے تو ہی رحم کرنے والا ہے)۔

ان تینوں واقعات کو سامنے رکھئے اور غور کیجئے تو چند باتیں معلوم ہوں گی:

زندگی میں مشکلات او رمصائب آئیں گے اور بار بار آئیں گے، کوئی انسان مشکلات سے آزاد نہیں، عام آدمی تو عام آدمی ہے، انبیاء اور رسولوں کو بھی آزمائشوں میں ڈال

کرتا پایا گیا، جب ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے تو ان مشکلات کو کیوں ہم ناممکن سمجھتے ہیں، یاد رکھئے، دعوت کی راہ پھولوں کی سیج ہے، بلکہ یہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے: حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ. (صحیح مسلم بروایت انس بن مالک)

قید حیات وبند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

دوسری بات یہ کہ مشکلات کے آنے کے بعد پریشان ہونا اور گھبرانا یہ مردانہ مزاج نہیں، بلکہ یہ بزدلانہ مزاج ہے، جب ہر تاریکی صبح لاتی ہے، ہر رات دن کا پیش خیمہ ہوتی ہے، تو یہ بھی قانون فطرت ہے کہ ہر سختی کے بعد آسانی ہے: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ ایک صاحب ضمیر انسان کا مزاج ہونا چاہئے کہ حالات آئیں تو پوری دلجمعی اور استقلال کے ساتھ، صبر وشکر کے ساتھ ان کا سامنا کرے۔

نشان مرد مومن باتو گویم — چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اور یاد رکھے کہ اگر صرف آسانیاں ہوں تو زندگی کا کوئی مزا نہیں۔ اور حدیث میں صاف آیا ہے: اَلْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ (ابن ماجہ:۴۰۳۲) (وہ ایمان والا جو لوگوں سے ملتا ہے اور ان سے ملنے والی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے وہ اس ایمان والے سے بہتر ہے جو لوگوں سے ملتا نہیں اور نہ ان کی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے)

سلگنا اور شئی ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے، وہ پروانوں سے کیا ہوگا

تیسری بات یہ کہ حالات جیسے بھی ہوں، توجہ الی اللہ اور توبہ واستغفار اور اور نماز میں انہماک سے گریز نہ کیا جائے، کیونکہ نماز ایسی عبادت ہے جس میں انسان اپنے کو بالکل بچھا دیتا ہے، اور اس کا انگ انگ عبادت میں مشغول ہوجاتا ہے، اور مشکل اوقات میں جب انسان اللہ کے سامنے اپنی پیشانی رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ! ہم محتاج ہیں تو غنی ہے،

ہم فقیر ہیں تو داتا ہے، تو اللہ تعالی اسباب سے آزاد ہوکر مدد کرتے ہیں، حضرت موسی کا فرعون نے تعاقب کیا، اندازہ تھا کہ فرعون بنی اسرائیل کو نیست ونابود کردے گا لیکن موسی علیہ السلام کے اللہ سے لو لگانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی مدد آئی اور فرعون خود ہی نیست ونابود ہوگیا۔

کفار مکہ بڑے دم خم کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے نکلے، مکہ نے اپنے جگر گوشوں کو مسلمانوں کے سامنے ڈال دیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے بڑے سوز کے ساتھ دعا کی، ستر سربراہان قریش مارے گئے جس سے کفار کی کمر ٹوٹ گئی۔

غزوۂ احزاب میں اتحادیوں کی بڑی فوج اس لئے جمع ہوئی کہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی، لیکن اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور مناسب تدبیر کرنے کا اثر یہ ہوا کہ دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ جان بچا کر بھاگے: وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ، وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيّاً عَزِيزاً. (الأحزاب: ۲۵) (اور جنگ میں اللہ تعالی اہل ایمان کے لئے کافی ہوگیا، اور اللہ تو ہے ہی بڑا قوت والا، بڑا زبردست)

اس لئے ہمیں ایسے نازک حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بھی کرنا چاہئے، قرآن کریم کا اعلان ہے: "اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ" (البقرۃ۱۵۲) (صبر اور نماز سے مدد چاہو) فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا، مناسب تدبیر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، اسی طرح قرآن کی متعدد آیتوں میں بیان کیا گیا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ." (آل عمران: ۲۰۰) (اے ایمان والو! خود صبر کرو، اور مقابلے میں صبر کرتے رہو، اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ) ایک دوسری جگہ آیا ہے: "لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيراً، وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا، فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ." (آل عمران: ۱۸۶) (یقیناً تم اپنے مال اور جان سے آزمائے جاؤ گے، اور یقیناً تم بہت سی دلآزاری کی

باتیں ان سے بھی سنو گے جنہیں تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے اوران سے بھی جو مشرک ہیں اوراگرتم صبراورتقویٰ اختیارکروتو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے) اور پورے سورۂ یوسف کا خلاصہ ہے: "اِنَّـهُ مَنۡ يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ." (یوسف: ۹۰) (واقعی جو شخص تقوی اور صبر اختیار کرتا ہے تو اللہ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا)۔

معلوم ہوا کہ تقویٰ اور صبر کے ذریعہ حالات اور مشکلات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، دشمن سے ڈرنے کے مقابلہ میں اپنے گناہوں سے زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ دشمن تو طاقت کے لحاظ سے طاقتور ہے، اگر ہم اور وہ گناہ میں برابر ہیں، تو ان کے پاس اسباب ہیں وہ بازی لے جائیں گے، لیکن اگر ہم گناہوں سے بچتے رہے تو اللہ کی غیبی آئے گی اور ہمیں کامیابی اور نصرت حاصل ہوگی۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

مسلمان کوئی عام قوم نہیں
بلکہ اللہ کے کائناتی نظام کا حصہ ہیں

الحمد لله ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد! فقد قال الله تعالى : "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ." (النحل :۱۲۸) (اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے: بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو ہر کام اچھے انداز میں کرتے ہیں)۔

حضرات! امت محمدیہ کے عروج وزوال اور اتار چڑھاؤ کی تاریخ بہت لمبی اور سبق آموز ہے، وہ ایک طرف مسرت بخش بھی ہے تو دوسری طرف دلخراش بھی، یہ دین غار حراء سے نکلا اور مشکلات اور مصائب کا سامنا کرتے ہوئے ایسا پھیلا کہ اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب کے قریب ہے، ویسے پوری دنیا کی آبادی چار ارب ذکر کی جاتی ہے، لیکن یہ بھی قرآن مجید کا اعلان ہے: اللہ کے نزدیک تعداد اور کمیت کا اثر نہیں، کوالٹی اور کیفیت کی قدر ہے، اور یہ بھی طے ہے کہ اگر حقیقی ایمان ہم کو نصیب ہوجائے تو غلبہ ہمارے لئے مقدر ہے: "وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ." (آل عمران: ۱۳۹)

حضرات! قرآن مجید کا ایک ایک حرف گواہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں عروج، ترقی اور بلندی کے مراحل اس وقت آتے ہیں، جب وہ مادّی اسباب اختیار کرنے کے ساتھ اللہ پر زبردست توکل اور بھروسہ کرتی ہے، اور جہاں یہ کمی ہوتی ہے زوال اور پستی شروع ہوجاتی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بلندیوں کے حصول کے لئے مسلسل کوشش کرنی ہوتی ہے، اور اس راہ میں پیش آنے والی تکلیفوں پر ڈٹنا اور جمے رہنا اہل ایمان کا شیوہ ہوتا ہے، قرآن کریم نے

ہمارے سامنے انسانیت کے سب سے اعلیٰ نمونے انبیاء کرام کی مثال دی ہے، ویسے تو انسانوں کی اصلاح کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام تشریف لائے ، جن میں ۳۱۳/صاحب شریعت تھے،ان تمام انبیاء نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنی ہی قوم کی طرف سے سخت آزمائش کا سامنا کیا ، اور ان کو قوم کی دھمکیوں کو جھیلنا پڑنا ،لیکن قربان جایئے ان کی اولوالعزمی ، پامردی ، ثابت قدمی اور جرأت ایمانی پر کہ انہوں نے کہا: سب کچھ گوارا ہے،لیکن ایمان اور اسلام کا سودا نہیں کرسکتے: ”وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ ، فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ.“ (آل عمران: ۱۴۶) (اور کتنے ہی نبی ہو چکے ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لڑے، جو کچھ انھیں اللہ کی راہ میں پیش آیا اس سے نہ تو انھوں نے ہمت ہاری اور نہ کمزور پڑے اور نہ وہ دبے، بے شک اللہ نے صبر کرنے والوں کو دوست رکھا ہے)، ان انبیاء میں پانچ نبی ایسے ہیں ، جن کے غیر معمولی حالات، دشواریوں اور مصائب کے جھیلنے کی وجہ سے ان کو اولوالعزم نبی کہا گیا ہے، وہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

حضرت نوح کی عمر ساڑھے بارہ سو سال ذکر کی جاتی ہے، وہ ساڑھے نو سال حق کا کلمہ بلند کرنے پر قائم رہے، حالات کی پرواہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نوح علیہ السلام نجات پائے ، اور قوم ہلاک ہوگئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال ذکر کی جاتی ہے ، انہوں نے اپنے ماحول سے سمجھوتا نہیں کیا ، اور حالات کا بہت پامردی سے مقابلہ کیا ، نمرود ہلاک ہوا ، اور وہ بھی مچھر کے ذریعہ، سچ ہے کہ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو تیس سال ہے ،لیکن انہوں نے فرعون کی دھمکیوں ، چیلنجزوں کو قبول کیا اور پیچھے نہیں ہٹے ، فرعون اور اس کا لشکر دریا میں ڈبو دیا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نجات پا گئے۔

حضرت عیسیٰ حق کی نداء کے لئے جمے رہے، ان کی پھانسی کی سازش ہوئی ،لیکن

وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ، اور سربلند رہے۔

حضرت رسول اللہ ﷺ کو ہجرت کے موقع پر قتل کی سازش کی گئی ،لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے سامنے سے ان کو گذارا اور وہ آپ کا بال بیکا نہیں کر سکے ، اور آپ کا دین ترقی کرتا رہا اور ماننے والے سربلند رہے۔

حضرات ! پورے عالم اسلام پر ایک دور وہ گذرا کہ مسلمان پوری دنیا پر اثر انداز تھے، ان کا سکہ چلتا تھا، ان کا جھنڈا لہراتا تھا، اللہ کا نظام قانون کام کرتا تھا، پھر مسلمانوں نے غفلت کی زندگی گذاری تو اللہ تعالیٰ نے ان پر زوال کو مسلط کر دیا، اور سب قوموں سے پیچھے چلے گئے ، یہاں تک کہ کسی کے خیال بھی نہیں آتا تھا کہ مسلمان کوئی مؤثر عنصر ہیں ، جو دنیا پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بیسویں صدی کے عظیم مفکر، قائد اور عالم ربانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو انہوں نے کہا کہ مسلمان ایسی قوم ہے جس کی ترقی سے دنیا ترقی یافتہ ہوئی ، اور جس کے پستی سے دنیا پستی میں چلی گئی ، لوگوں کو تعجب ہوا ، لیکن انہوں نے حقائق فیکٹ اینڈ فیگر **(Fact and Figer)** سے اس حقیقت کو طشت از بام کر دیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے یہ اشعار اسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے، نقش روئے محمد بنایا گیا
پھر اسی نقش سے مانگ کر روشنی بزم کون ومکاں کو سجایا گیا

حضرات ! مسلمان کوئی خود رو گھاس نہیں ہیں ، جہاں سے چاہا اکھاڑ لیا ، اور جہاں چاہا لگا دیا ، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نظام کا ایک لازمی حصہ ہیں ، چشم تصور میں لایئے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ دنیا میں آئے ، اس وقت کیا نہیں تھا ، کیا ساسانی اور بیزنطینی حکومتیں نہیں تھیں ؟ کیا رومن امپائر اور پرشین امپائر نہیں تھی ؟ کیا تاجر ، سیاست داں ، ماہرین فن ، ادباء ، شعراء ، نہیں تھے ؟ سب لوگ تھے ، صرف مسلمان نہیں تھے ، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو بھیج کر مسلمانوں کے بسنے اور زندہ رہنے کا فیصلہ کیا ؟ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ ہی چاہے گا تو مسلمانوں کو زوال ہوگا ، ورنہ مسلمانوں کے خلاف بنائے جانے والے قوانین سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

اس سلسلہ میں چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

(۱) سب سے پہلے اتحاد کا ثبوت دینا ہے، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں حلف الفضول کی شکل میں سیکولر غیر مسلم افراد کو جوڑنا اور ایک متحدہ پلیٹ فارم تیار کرنا۔ کیونکہ اتحاد زندگی ہے اور اختلاف موت ہے۔

متحد ہو تو بدل ڈالو زمانے کا نظام   منتشر ہو تو مرو شور مچاتے کیوں ہو

(۲) حالات کے مقابلہ کے لئے ایک متحدہ کوشش کرنی ہے، اور یہ کوشش ایک یا دو دن کی نہیں، بلکہ مسلسل اور لگاتار ہونی چاہئے، اور اللہ نے دودو بار تاکید کی ہے: اللہ نے ابراہیم کے صحیفے میں اور موسی کی کتاب میں اور خود اس قرآن میں لکھ دیا ہے کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

(۳) ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے خلاف بنائے جانے والے قوانین غیر آئینی اور غیر دستوری ہیں، اس لئے کسی ایک ردِعمل پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ مناسب، دیرپا تدبیر سوچتے رہنا چاہئے، حدیث میں آیا ہے: جنگ پینترا بدلنے کا نام ہے، ایک ہی طریقہ اور انداز نہیں اختیار کرنا چاہئے، بلکہ حالات کے لحاظ سے آئین کی روشنی میں مناسب لائحہ عمل طے کرنا چاہئے۔

(۴) ان تمام کوششوں میں اللہ تعالیٰ سے تعلق اور فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ ہو، ایک مسواک کی سنت کے چھوٹنے سے جنگ کی فتح رکی ہوئی تھی، تو فرائض کو چھوڑنا کتنا نقصان دہ ہوگا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے کبھی بھی تعداد کی بنیاد پر دشمنوں پر فتح نہیں پائی، بلکہ معنوی طاقت کی بنیاد پر فتح پائی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اللہ سے تعلق ہو اور سنتوں کا بھی اہتمام ہو اور گناہوں سے بھی اجتناب ہو۔ اسی کو قرآن کریم کی آیت میں پیش کیا گیا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ." (النحل:۱۲۸) اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو ہر کام اچھے انداز میں کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت وحوصلہ عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمين

ظلم تباہی کا پیش خیمہ ہے

الحمد للّٰه ربّ العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين أما بعد! "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ، اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ." (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آپ کے رب کی پکڑ بہت سخت ہے، وہی پیدا کرتا ہے اور دوبارہ بھی اٹھائے گا) (البروج:۱۲-۱۳)

حضرات! ایک ایسی حقیقت جس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے، وہ یہ ہے کہ ظلم اور زیادتی بہت بری چیز ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہے، ظلم ایسا تباہ وبرباد کرنے والا عمل ہے کہ صرف فرد کا خاتمہ نہیں کرتا، بلکہ بڑی بڑی سلطنتوں، جماعتوں اور قوموں کا صفایا کردیتا ہے، ور ظلم کرنے والوں پر ایسی سزائیں، آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں، جن کا پہلے سے تصور نہیں کیا جاسکتا۔

حضرات! ظلم کہتے ہیں: کسی چیز کو مناسب جگہ پر نہ رکھنا، گویا ہر وہ کام جو مناسب وقت، مناسب حالت اور مناسب جگہ پر نہ ہو، قرآن کی نگاہ میں ظلم ہے، قرآن نے شرک کو یعنی اللہ کے ساتھ شریک کرنے کو ظلم کہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لئے اصل یہ ہے کہ وہ اللہ کو ایک مانے، اسی کی عبادت کرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، اب اگر وہ اللہ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک کررہا ہے تو اپنی بندگی مناسب سمت میں ادا نہیں کررہا ہے اور یہی ظلم ہے، قرآن کا صاف اعلان ہے کہ اللہ کا کام نہیں تھا کہ لوگوں پر ظلم کرتا، مگر بندے خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔

حضرات! قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ظلم مٹ کر رہتا اور ظالم بری طرح تباہ ہوتا ہے، دنیا میں کئی ظالم پیدا ہوئے، لیکن کسی کی نہیں چلی، سب کو دنیا سے جانا پڑا، پوری دنیا پر حکومت کرنے والوں میں ایک نام تھا نمرود، جس کو اللہ نے بری طرح ہلاک کیا، اور اسی طرح فرعون کا بڑا دور دورہ تھا، لوگ اس کا کلمہ

پڑھتے تھے، اس کی خدائی کا مالا جپتے تھے، قوم عاد ہوں یا قوم ثمود، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا، یعنی جو بڑے بڑے ستونوں والے تھے، ان جیسے لوگ ملکوں میں پیدا نہیں ہوئے تھے، اور ثمود کے ساتھ کیا کیا، جو وادی میں بڑی بڑی چٹانیں تراشتے تھے، اور فرعون کے ساتھ جو میخوں والا تھا، جنہوں نے ملکوں میں سرکشی مچا رکھی تھی، تو وہاں انہوں نے زبردست بگاڑ پھیلا رکھا تھا، پس آپ کے رب نے ان پر اپنے عذاب کے کوڑے برسائے، یقیناً آپ کا رب گھات میں ہے (الفجر: ۶۔۱۴)۔ قریش کے فرعون ابو جہل اور ابولہب دونوں نے رسول اللہ ﷺ پر ظلم کیا تو اللہ نے دونوں کو شرمناک موت دی، ابولہب اپنے گھر ہی میں مرا، لیکن کوئی اس کی لاش کو اٹھانے والا نہیں تھا، اور ابو جہل تو دو بچوں معاذ بن عفراء اور معوّذ بن عفراء کے ذریعہ مارا گیا۔ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى، اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَخْشٰى. " (النازعات: ۲۵-۲۶)

حضرات! کسی جگہ ظلم ہو اور وہاں کے باشندوں خاموش ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ضمیر مردہ ہے، ان کا انسانی حس اپنی افادیت کھو چکا ہے، قرآن کریم کی رہنمائی ہے کہ ظالم کے ظلم کو بیان کرنا اور اس کا چرچا کرنا غیبت اور بری صفت نہیں، بلکہ عین ایمان ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ من القولِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ. " (المائدۃ: ۱۴۸) (اللہ تعالیٰ اونچی آواز میں برائی کی بات کرنے والے کو پسند نہیں کرتا، مگر جس پر ظلم کیا گیا ہے تو اسے اجازت ہے)، لہذا ظلم پر خاموشی تو صحیح نہیں، البتہ اس کے مدارج ہیں) اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ سے ظلم کو دور کر سکتا ہے تو ہاتھ سے دور کرے، کوئی اپنی زبان سے دور کرسکتا ہے تو زبان سے دور کرے، کوئی زبان سے بھی نہیں کرسکتا تو اسے دل سے تو برا جاننا ہی چاہئے، اس کے بعد وہ ایمان والا نہیں ہوگا۔

حضرات! تاریخ گواہ ہے کہ صحیح ایمان اور یقین رکھنے والوں نے کبھی ظلم کو برداشت نہیں کیا: (۱) ایک زمانہ تھا کہ سند کے علاقہ میں ایک مسلمان عورت کو گرفتار کیا گیا، اور اس کے ساتھ زیادتی کی گئی، اس نے اپنے زمانہ کے حکمراں حجاج بن یوسف کو آواز دی وہ اس سے

بہت دور تھا، لیکن اس نے لبیک کہا اور ستر لاکھ درہم خرچ کر کے اس عورت کو آزاد کرایا۔

(۲) روم کے علاقہ میں ایک خاتون پر ظلم ہوا، عباسی خلیفہ معتصم کا زمانہ تھا، اس خاتون نے فریاد کی، ہائے معتصم! ہائے معتصم! وَامُعْتَصِمَاه! چنانچہ خلیفہ معتصم نے لشکر جرّار روانہ کیا، اور اس وقت کی ظالم طاقت سے اس کو آزاد کرایا۔

(۳) ظلم وزیادتی اور ایمانی غیرت کا ایک نمونہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ذریعہ ظاہر ہوا، انہیں معلوم ہوا کہ ایک عیسائی شہزادہ نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے، قسم کھالی کہ اگر وہ میری گرفت میں آیا، تو میں اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا، اس کے لئے تدبیر شروع کردی، اس وقت شام ۱۲ ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا، بے پناہ کوششوں کے بعد ان بارہ حکومتوں کو ایک حکومت میں تبدیل کیا، اور پھر حطین کی جنگ پیش آئی، اس میں عیسائیوں کو شکست دی، اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے شہزادے کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

حضرات! زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے بھائی کی مدد صرف اس لئے کرتے تھے کہ اس سے قبائلی تعلق ہے، نسبی تعلق ہے، وہ کہا کرتے تھے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم یا مظلوم ہو، رسول اللہ ﷺ نے اس رجحان کو ناپسند کیا، اور فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کو ظلم سے روکا جائے، صحیح مسلم کی روایت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث قدسی میں فرمایا: اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کیا ہے، اور اس کو تمہارے درمیان حرام کیا ہے تو تم آپس میں ظلم نہ کرو، صحیحین میں ہے، حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ ظالم کو ڈھیل دیتے ہیں، لیکن جب اس کو پکڑتے ہیں اس کو چھوڑتے نہیں ہیں: وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ. " (هود: ۱۰۲) (اور آپ کے پروردگار کی پکڑ اسی طرح ہے، جب وہ بستی والوں کو پکڑتا ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتے رہتے ہیں، بے شک اس کی پکڑ بڑی تکلیف دہ، بڑی سخت ہے)

حضرات! دنیا میں ہر بھلائی کی جڑ عدل وانصاف ہے، اور ہر برائی کی جڑ جہالت

اورظلم وزیادتی ہے،اللہ تعالیٰ کفر کے ساتھ تو کسی ملک کو باقی رکھ سکتے ہیں،لیکن ظلم وسفا کی اورزیادتی کے ساتھ کسی کو باقی نہیں رکھ سکتے ، کیونکہ ظلم تباہی کا پیش خیمہ ہے،آج کل بعض مما لک میں حکومتوں کی طرف سے ظلم وستم عام ہے،کہیں مسجدوں کی مسماری، کہیں عبادت پر روک ٹوک، کہیں حجاب پر پابندی، کہیں قرآن کو نذر آتش کیا جانا،تو اللہ نے بتا دیا کہ تم میرے شعائر پر پابندی لگاتے ہو، میں تمہاری زندگی ہی پر پابندی لگا دوں گا،تو منٹوں میں تمہارا صفایا ہوجائے گا۔

حضرات! برٹش حکومت کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا اور بجا کہا جاتا تھا کہ اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا،خود اس ملک میں اُس کا جودَم خم تھا،کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ انگریز یہ ملک چھوڑ کر جائیں گے،لیکن حالات نے بتا دیا کہ ظلم کی بھی ایک مدت ہوتی ہے، اور پانی جب سر سے اونچا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ظالموں کی کمر توڑ دیتا ہے اور انہیں شرمناک سزا سے دوچار کرتا ہے،آج جن کے پاس طاقت ہے،قوت ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ طاقت کے زور پر جو چاہیں گے کرلیں گے تو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو طاقت آج انہیں حاصل ہے کوئی ضروری نہیں کہ کل بھی حاصل ہو، بلکہ ظلم کا انجام تو تباہی ہے، دوسری یہ کہ سب طاقتوں سے بڑی اللہ کی طاقت ہے،اس کے لشکر زمین وآسمان ہیں، وہ منٹوں میں ہواؤں کو حرکت دے،آسمان وزمین کی مخلوقات کو متحرک کرے،اور ملکوں کے ملکوں کا صفایا ہوجائے۔

"وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ، اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ، مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُؤُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ." (ابراهيم:٤٢) (اورتم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کے اعمال سے بےخبر ہیں، بلکہ وہ ڈھیل دے رہے اس دن تک جس میں ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی، اور وہ اپنے رب کی طرف تیزی سے جائیں گے،ان کے آنکھیں جھکی ہوں گی،اور دل خالی ہوں گے)

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے خیر کو عام کرنے اور شر کو مٹانے کا ذریعہ بنائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

مواقع سے فائدہ اٹھانا

زندہ ضمیر لوگوں کا کام ہوتا ہے

الحمد لله ربّ العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد! "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ، اُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ." (الحشر : ١٩)

حضرات! یہ سورۂ حشر کی آیت ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا،تو اللہ نے ان کو ایسا بنایا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے، نہ اپنا نفع سمجھتے ہیں اور نہ اپنا نقصان، اور وہی لوگ ہیں نافرمان۔سورۂ حشر مدنی سورت ہے، یہ پوری سورت بنوالنضیر کی جلاوطنی سے متعلق بحث کرتی ہے، مدینہ منورہ پہنچ کر جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلا سماجی کام یہ کیا کہ مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے معاہدہ کیا، اور یہ طے کیا کہ اس علاقہ میں کوئی ظلم نہیں ہونے دینا ہے، ایک دوسرے کا انسانی بنیادوں پر تعاون کرنا ہے، اس میں یہود کے کئی قبائل شریک تھے : بنوالنضیر ، بنوقریظہ اور بنوقینقاع وغیرہ۔

بالکل اسی نوعیت کا معاہدہ حلف الفضول ہے، جس میں آپ ﷺ نے شرکت کی اور کہا کہ اگر ان جیسے کاموں کے لئے مجھے بلایا جائے تو میں اس میں ضرور شریک ہوں گا، حجۃ الوداع کا خطبہ جو تاریخی بھی ہے اور تاریخ ساز بھی، اس کی دفعات بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ عام انسانی حقوق کی بازیابی کے لئے اگر متحدہ پلیٹ فارم ہے تو اس میں بڑھ

چڑھ کر حصہ لینا چاہئے، اور اگر کوئی پلیٹ فارم ایسا نہیں تو خود بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، تاکہ انسانوں کے حقوق کا تحفظ ہوسکے اور انسانیت کی خدمت کی جاسکے۔

حضرات! یہ امت جو سب سے اچھی امت اور خیر امت کہی جاتی ہے، اس کی بہتری کا راز اگر معلوم کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ امت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی امت ہے، آپ ﷺ چونکہ اولین وآخرین کے سردار ہیں، اس لئے امت بھی منصب بلند پر فائز کی گئی ہے، اس لئے خیر امت ہے، یہ قرآن کی حامل ہے، جو تمام کتابوں میں سب سے جامع کتاب ہے، اس لئے خیر امت ہے، اور یہ امت اپنی ذات، اپنی مصلحت، اپنے تقاضے پورے کرنے کے لئے صرف پیدا نہیں کی گئی ہے، بلکہ یہ پوری انسانیت کے نفع کے لئے پیدا کی گئی ہے: اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ یہ اس کی بہتری کا راز ہے، چنانچہ یہ ضروری ہو گیا کہ یہ امت پوری انسانی برادری کی فکر کرے، ان کے دکھ درد میں شریک ہو، ان کے کام آئے، ان کے مسائل کو حل کرنے کوشش کرے۔

حضرات! انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اس امت کے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد خود عام انسانی برادری کا خیال رکھا، اور اپنے ماننے والوں کو اس کی تلقین کی، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تربیت یافتہ جماعت نے ہر موقع پر پوری انسانی برادری کی خدمت کی، عبداللہ بن المبارکؒ نے کتاب الزھد میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوجہم یرموک کی جنگ میں اپنے چچیرے بھائی کی خبرگیری کے لئے پانی لے کر نکلے، لیکن ان کو اپنے پڑوسی سے پہلے پانی پینا گوارا نہیں ہوا، اسی طرح دوسرے، تیسرے نے جنگ میں یکے بعد دیگرے جان دے دی، لیکن اپنے بھائی سے پہلے پانی نہیں پیا، حضرت ابوطلحہؓ اور ان کی اہلیہ اور ان کے بچے نے پوری رات بھوک کی حالت میں گذار دی، لیکن مہمان کو بھوکا رکھنا پسند نہیں کیا، صحیحین میں ہے کہ خود زبان رسالت نے پورے زور دے کر فرمایا: خدا کی قسم! وہ ایمان والا نہیں، جس کا پڑوسی اس کی تکلیف سے محفوظ نہ ہو، اور

فرمایا: تم میں کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (صحیحین، بروایت انس بن مالک)

حضرات! ہندوستان کے مسلمان اور اقلیتوں کے لوگ چاہے وہ شیڈول کاسٹ ہوں، یا شیڈول ٹرائبز ہوں یا بیک ورڈ کلاسیز ہوں ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں، یہ بڑا فیصلہ کن مرحلہ ہے، اس موقع پر تھوڑی سی چوک ہزاروں سال ان کو پیچھے ڈھکیل سکتی ہے:

یک لحظہ من غافل شدم   صد سالہ راہم دور شد

اس لئے ضرورت ہے کہ صورت حال کے مقابلہ کے لئے جو متحدہ محاذ بنا ہوا ہے اس کو تقویت پہونچائی جائے، اور کسی قسم کی تفریق اور تنازعہ کو ہوا نہ دی جائے، مواقع سے فائدہ اٹھانا زندہ ضمیر لوگوں کا کام ہوتا ہے، اور یہاں کے عوام کا ضمیر ماشاء اللہ زندہ ہے، اور اپنے مستقبل کے تئیں فکرمند ہیں، یہ سرزمین جس کو خواجہ الطاف حسین حالی نے اَکال الاُمم (ملت خور) قرار دیا ہے کہ دنیا کی جتنی قومیں آئیں اس میں تحلیل ہوگئی، اور اس کی تہذیب میں گم ہوگئیں، لیکن مسلمان قوم اپنی تہذیبی شناخت پر قائم اور برقرار ہیں، اور آئندہ بھی ان شاء اللہ رہیں گے۔

لیکن اس کے لئے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے، جن کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۂ حشر کی آیت میں آیا ہے: "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ، أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ." (الحشر: ۱۹) (اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا، جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ تعالی نے ایسا کردیا کہ وہ خود اپنے کو بھول گئے، حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے تھے کہ خدا فراموشی نتیجہ ہے خود فراموشی کا، پہلے انسان اللہ کو بھولتا ہے تو اللہ خود ایسا نظام بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنے کو بھول جاتا ہے۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ دنیا میں کیا ہوگا اور کیا ہونے والا ہے، اس کا فیصلہ اللہ کے

دربار سے ہوتا ہے، اس لئے اہل ایمان کو ان نازک حالات میں اپنے تعلق مع اللہ، رجوع و انابت کو بڑھا دینا چاہئے، مسجدوں کی آبادی میں ایسا اضافہ ہو کہ ہر نماز، جمعہ کی نماز معلوم ہو۔ اس وقت ہم خاص حالات میں ہے، اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے بقول: أَنتُم فِي رِبَاط دَائِم (ایک محاذ پر کھڑے ہیں)، زبان رسالت نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس محاذ کی کامیابی اسی میں ہے کہ دنیا کی محبت انسانی جسم کے رگ و پے سے نکل جائے اور جنت کا شوق ہماری صبح و شام کا وظیفہ ہو جائے۔

دوسری بات یہ کہ ظاہری تدبیر اختیار کرنے میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے، یہ دنیا دار الأسباب ہے، اسباب تو اختیار کرنے ہی پڑیں گے، جو فیصلہ ہو اس پر دل وجان سے عمل کیا جائے، اپنی رائے، اپنی خواہش، اپنی ضد کو آڑے نہ آنے دیا جائے، ظاہر ہے کہ اگر ایک متحدہ محاذ بنا کر اس مشن کو آگے بڑھایا جاتا رہا تو کامیابی بہت جلد ہمارے قدم چومے گی:

ہزار چشمے تیرے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کر

اللہ تعالیٰ ہم کو توفیقات سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد: قال الله تعالى: "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ، قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ." (البقرة: ٢٥٦)

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں، گمراہی کے مقابلہ میں ہدایت آشکارا ہو چکی ہے)۔

حضرات! اسلام ایک عالمی اور بین الاقوامی مذہب ہے، وہ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ و محمد ﷺ تک جتنے انبیاء آئے ان کا مذہب رہا ہے، اسلام سِلْم سے نکلا ہے، جس کے معنی صلح وسلامتی کے ہیں، اسی کے ساتھ ایک لفظ ایمان استعمال ہوتا ہے، جو امن سے نکلا ہے، وہ امن وآشتی کو بتاتا ہے، گویا صلح وسلامتی اور امن وآشتی اس دین کی خمیر میں داخل ہیں اور اس کی تعلیمات اس کے مزاج و مذاق کی آئینہ دار ہیں، اسلام نے محبت کا سبق سکھایا: اللہ سے، رسول سے، مسلمانوں سے، پوری انسانیت سے، بلکہ پوری مخلوقات سے۔ خود رسول انسانیت جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پوری انسانیت اللہ کا خاندان ہے، اور اللہ کے نزدیک بہتر انسان وہ ہے، جو اس کے خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کرے (طبرانی بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ)۔

حضرات! جب اسلام ساری مخلوقات کے ساتھ محبت ورحم دلی کا پیغام دیتا ہے تو غیر مسلموں کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ان کے ساتھ سخت دلی کا رویہ رکھا جائے، کوئی بھی انسانی جان ہو اس کی تکریم، اس کی عزت، اس کا احترام اسلام کی بنیادی فکر ہی نہیں، بلکہ اس کا عقیدہ ہے، قرآن میں آیا ہے: "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (بنی

اسرائیل:۷۰)(ہم نے آدم کی اولاد کو کرامت وشرف کا تاج پہنایا)،قرآن نے انسانی جسم کو بہتر سانچہ قرار دیا ہے:"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" (التین:۴)صحیح بخاری کتاب الجنائز میں ہے کہ ایک یہودی کا جنازہ گذر رہا تھا،آپ ﷺ کھڑے ہو گئے،صحابہؓ نے عرض کیا:حضور! یہودی کا جنازہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:آخر وہ بھی تو انسان ہے،اور آگے دیکھئے،آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد غیر مسلم بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو خطوط لکھے تو ان کے القاب اور آداب کا پورا لحاظ فرمایا،گالی دے کر،نفرت آمیز لہجہ اختیار کر کے گفتگو نہیں کی۔

حضرات!اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی ہے،ماں، باپ، بچے، بھائی بہن، بیوی، رشتہ دار، پڑوسی، سفر کے ساتھی، مقروض، کمزور، بیمار، مسافر وہ اگر غیر مسلم ہیں تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، مکہ میں ایک مرتبہ زبردست قحط پڑا، تو آپ ﷺ نے ان کی اعانت ایک بڑی رقم سے کی۔

حضرات!اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر وتشدد کا قائل نہیں ہے،اسلام کا اہم اصول یہ ہے کہ کسی کو مجبور کر کے اس کا مذہب تبدیل کرانا درست نہیں، کیونکہ مذہب کا تعلق دل سے ہے، جبر کر کے، زور ڈال کر زبان سے اقرار تو کرایا جا سکتا ہے، دل کی دنیا نہیں بدلی جا سکتی، قرآن کا اعلان ہے: دین میں زبردستی کی کوئی گنجائش نہیں، یہ الزام ہے، پروپیگنڈہ ہے، سراسر جھوٹ اور فراڈ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، غور کیجئے جب محمد ﷺ آئے تو آپ ہی صرف تنہا تھے، نہ تلوار تھی، نہ فوج، نہ سپاہ تھی، پورا مکہ مخالف تھا، آخر کون سی طاقت تھی کہ اسلام نے چند سال میں پورے جزیرۃ العرب کو مسخر کر لیا؟ یقیناً اسلام کا عدل وانصاف تھا، اس کا فطری قانون تھا، اور عقل ودماغ سے بھرپور تعلق رکھنے والی تعلیمات تھیں جس نے اثر ڈالا اور ڈالتی چلی گئی۔

اسلام غیر مسلموں کے ساتھ میل جول اور رواداری کا حکم دیتا ہے، سورۂ انعام

(آیت:۱۰۸) میں ہے کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں ان کو برا بھلا مت کہو، رسول اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو مسلمانوں، یہودیوں، مشرکین کے درمیان معاہدہ کرایا تھا، جس کے تحت ہر ایک کو اپنے مذہب کے مطابق چلنے کی پوری پوری آزادی تھی، اور غیر مسلم اپنی عبادت اور اس کے طریقوں میں آزاد تھے، یہاں مذہبی رواداری اور آزادی کا لحاظ رکھا گیا کہ عیسائی وفد کو خود مسجد نبوی کے ایک گوشے میں اپنے طریقہ پر عبادت کی اجازت دی تھی۔

حضرات! مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کی جہاں تک بات ہے، اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات، مذہبی تعلقات۔

سماجی تعلقات میں یہ ہے کہ جو غیر مسلم دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کرتے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے ہیں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اچھا رویہ رکھو، اور انصاف کرو، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (الممتحنۃ:۸)، لیکن جو غیر مسلم ایسے نہیں ہیں، بلکہ ہر وقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں، اور عداوت و دشمنی میں بہت آگے چلے گئے ہیں، ان سے تعلقات رکھنا، دوستی کرنا حرام ہے، کیونکہ جو اُن سے دوستی کرے گا وہ انہیں میں سے ہوگا، سورۂ مائدہ اور سورۂ ممتحنہ میں اس حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاشی تعلقات کی بھی اسلام تائید کرتا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی آراضی کو یہودیوں کے قبضہ میں رہنے دیا، اور ان سے بٹائی پر معاملہ کیا۔

اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلقات کی بھی گنجائش ہے، سورۂ یوسف میں ہے کہ ملکی مفادات اور مصالح کے پیش نظر حضرت یوسف علیہ السلام نے وزارت خزانہ

طلب فرمائی تھی، اوران کی خواہش قبول کی گئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا درست ہے، جہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہو، اورحلف الفضول کا واقعہ تو ایسا ہے کہ اس میں سب شریک ہوئے تھے۔

جہاں تک غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلقات کی بات ہے توان کو قائم رکھنے کے لیے دواصول ہیں: (۱) ان ملکی قوانین کی پابندی جومبنی برانصاف ہوں، کیونکہ آپ جس ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو گویا زبان حال سے اس ملک کے دستور کی فرمانبرداری اور پاسداری کا اقرار کرتے ہیں (۲) ظلم کی مخالفت اوراس کے سدباب میں باہمی تعاون۔

مذہبی تعلقات میں اسلام دو باتوں کی تعلیم دیتا ہے: ایک اپنے دین پر استقامت، دوسرے یہ کہ دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت اوراحترام۔

یہ بقائے باہمی، مذہبی رواداری کے کچھ اصول تھے، جن کا تذکرہ کیا گیا، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیقات سے نوازیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمين

فتنے اوران کا مقابلہ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين أما بعد: فقد قال الله تعالى: أعوذ باللّٰہ من الشيطان الرجيم ، بسم الله الرحمن الرحيم: "وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً، وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ." (الأنفال: ۲۵)

(اورڈرتے رہواس وبال سے جوخاص انہیں لوگوں پرواقع نہیں ہوگا جوتم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں، اورجانے رہو کہ اللہ سخت سزادینے والا ہے)

حضرات! یہ دورفتنوں اورآزمائشوں کا ہے، فتنے مختلف رنگ وروپ، مختلف طرز وانداز اور مختلف نتائج وانجام لے کر سامنے آرہے ہیں، ہردن ہی نہیں، ہرآن نئے نئے فتنے سامنے آرہے ہیں، یہ فتنے چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی، داخلی بھی اور خارجی بھی، چھوٹوں پر بھی ہیں اور بڑوں پر بھی، ان سے صرف ہماری معاشیات واقتصادیات ہی کو خطرے نہیں لاحق ہورہے ہیں، بلکہ ایمان واعمال کو بھی خطرے لاحق ہورہے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ فِتَناً كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِىْ كَافِراً وَيُمْسِىْ مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا، يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِّنَ الدُّنْيَا (صحیح مسلم) (نیک اعمال میں جلدی کرو، کیونکہ ایسے فتنے آئیں گے جوتاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح ہوں گے، انسان ایمان کی حالت میں صبح کرے گا، لیکن شام کو کافر ہوجائے گا، اورایمان کی حالت میں شام کرے گا، لیکن صبح کو کافر ہوجائے گا، وہ اپنے دین کو معمولی پونجی کے عوض بیچ دے گا)

حضرات! حدیث میں جو فتنے بیان کئے گئے ہیں ان میں سے بعض اختیاری ہیں

اوربعض غیراختیاری،بعض جواختیاری ہیں وہ بندوں کے اختیار سے تعلق رکھتے ہیں،مثال کے طور پرایک حدیث جامع ترمذی میں ہے،حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:جب مال غنیمت کواپنامال قراردیا جائے،اورزکاۃ کو تاوان سمجھا جائے،جب علم دین حاصل کرنے کودنیاطلبی کاذریعہ بنایا جائے،اورمردعورت کی اطاعت شروع کردے،جب بیٹاماں کی نافرمانی کرنے لگے،جب آدمی اپنے دوست سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوجائے،اورباپ سے دورہوجائے،جب قوم کارہنماقوم کا بدترین شخص ہوجائے،جب کسی انسان کی عزت اس کے شر سے بچنے کے لئے کی جائے، جب علانیہ شراب پی جانے لگے،جب اس امت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں پرطعن وتشنیع کرنے لگیں،توانتظارکرلوتیزوتندآندھی کا،زلزلوں کی تباہ کاریوں کا،زمین میں دھنسائے جانے کا،اورصورتوں کے مسخ کئے جانے کا،اورپتھروں کے برسنے کا،اوراللہ کی طرف سے پے درپے نزول عذاب کا،اس حدیث سے معلوم ہواکہ یہ فتنے بندوں کے اعمال سے متعلق ہیں،اگربندے یہ اعمال چھوڑدیں تو یہ ساری پریشانیاں دورہوجائیں گی۔

دوسرے وہ فتنے ہیں جو غیراختیاری ہیں،جیسے دجال کا آنا،ان سے آگاہ کئے جانے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے شر سے واقف رہا جائے،تاکہ ان سے بچنا آسان ہوجائے، بخاری کی روایت ہے،حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے خیر کے بارے میں دریافت کرتے تھے اورمیں شر کے بارے میں پوچھتا تھا کہ صرف اس ڈر سے کہیں اس کاشکارنہ ہوجاؤں۔

حضرات!اس وقت عوام وخواص میں جن فتنوں کا جادوسرچڑھ کر بول رہا ہے، ان میں مصلحت اندیشی کا فتنہ،ہردلعزیزی کا فتنہ،اپنی ناجائز رائے پرقائم رہنے کا فتنہ، بدگمانی کا فتنہ،بدمعاملگی کا فتنہ،بہتان طرازی کا فتنہ،انتقام کا فتنہ،حب شہرت کا فتنہ، پروپیگنڈے کا فتنہ،حب مال کا فتنہ،حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغۃ

میں عجیب وغریب تشریح کی ہے:

۱- فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِىْ نَفْسِهٖ بِأَنْ يَّقْسُوَ قَلْبُهٗ، فَلَا يَجِدُ حَلَاوَةَ الطَّاعَةِ وَلَا لَذَّةَ الْمُنَاجَاةِ (انسان کااس کے نفس کے لحاظ سے فتنہ یہ ہے کہ اس کادل سخت ہوجائے،نہ اس کواطاعت کی لذت ملے اورنہ مناجات کی مٹھاس)۔۲- فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِيْ أَهْلِهٖ (انسان کااہل وعیال کے فتنہ میں پڑنا)۔۳- نظام مملکت کابگاڑ۔۴- مذہبی فتنہ،دینی معاملہ نااہلوں کے سپرد ہوجائے۔۵- چاردانگ عالم میں پھیلنے والافتنہ، انسانیت اوراس کے تقاضوں کامنہ موڑنا۔۶- فضائی واقعات کافتنہ۔

حضرت شاہ وصی اللہؒ فرماتے تھے:ان تمام فتنوں کا مرکز دل ہے،اگرقلب کی اصلاح ہوجائے توسارے فتنے ختم ہوجائیں گے۔

احادیث میں میں فتنوں سے حفاظت کا یہ نسخہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان دین کومکمل اندازمیں اختیارکرے،اورمصلحین سے استفادہ کرے۔

حضرت امام نوویؒ کا تجربہ ہے:

إِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا فُطَنًا — طَلَّقُوا الدُّنْيَا وَخَافُوا الْفِتَنَا
نَظَرُوا فِيهَا فَلَمَّا عَلِمُوا — أَنَّهَا لَيْسَتْ لِحَيٍّ وَطَنًا
جَعَلُوهَا لُجَّةً وَاتَّخَذُوا — صَالِحَ الْأَعْمَالِ فِيهَا سُفُنًا

(اللہ کے کچھ عقل مند بندے ہیں،جنہوں نے دنیا کوچھوڑدیااورفتنوں سے ڈرے، دنیامیں غورکیا،جب انہیں معلوم ہواکہ یہ کسی جاندارکاوطن نہیں ہوسکتی،تواس کوایک سمندرسمجھا،اورنیک اعمال کوکشتی بناکراس کوپارکرگئے)

فتنوں سے بچنے کاراستہ یہ ہے:

(۱) کتاب وسنت کاعلم۔ تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ. (موطأ، كتاب القدر: ۱۶۲۸)(میں نے

دو چیزیں چھوڑیں ہیں، جب تک ان کو لازم پکڑو گے گمراہ نہیں ہوگے: کتاب اللہ وسنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

(۲) علماء کی قدر و قیمت کو پہچان کر ان کی طرف رجوع کرنا: فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. (الأنبياء: ۷) (اہل علم سے پوچھو، اگر نہ جانتے ہو)۔

(۳) مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا۔ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ (ترمذی، کتاب الفتن: ۲۳۱۸)

(۴) غصہ، اشتعال انگیزی اور جلد بازی کے بجائے ضبط وبرداشت، صلح وبردباری، سنجیدگی اور نرم خوئی سے کام لینا۔ حضرت اشج عبد القیس کو مخاطب کر کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ: الْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ. (صحیح مسلم، کتاب الإیمان: ۱۲۷) (تمہارے اندر دو خصلتیں ہیں، بردباری اور سنجیدگی)

(۵) میڈیا کی خبروں کو من وعن تسلیم نہ کرنا۔

(۶) فتنوں اور مصائب سے پناہ مانگنا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فتنوں سے محفوظ رکھے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

موجودہ حالات میں ابتلاءات وآزمائش

الحمد لله رب العالمين، والصّلاة والسّلام على سيّد الأنبياء وإمام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين، أما بعد! فقد قال الله تعالى: "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ، وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ." (البقرة: ۱۵۵)

(اور ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے، اور مال اور جان اور پھلوں کے کچھ نقصان سے، اور آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے)

حضرات! اجتماعیت میں دو باتیں ضروری ہیں:

(۱) ایثار (۲) اجتماعی مفاد کو ترجیح دینا

مسلمان ہر جگہ ابتلاء اور آزمائشوں سے گزر رہے ہیں، ہر تکلیف میں دوسروں کو مجرم گردانا یہ مومنانہ کردار نہیں ہے، یہ بنی اسرائیل کا انداز تھا کہ وہ اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں کو موسیٰ اور اہلِ ایمان کی طرف سے قرار دیتے تھے (اعراف: ۱۳۱)، یہی حال مشرکوں کا ہے کہ جب ان کو اللہ کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کو مسلمانوں کی طرف منسوب کرتے تھے (نساء: ۷۸) جب کہ قرآن کریم میں ہے کہ انسان پر جو آزمائشیں آتی ہیں، وہ اصل میں خود اس کی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہیں (شوریٰ: ۳۰)

ایسے حالات میں بعض سادہ لوح مسلمان سوچتے ہیں کہ اگر وہ دین حق پر ہیں اور خیر امت ہیں تو پھر ان آزمائشوں سے کیوں گزر رہے ہیں؟ یہ بات مسلمانوں کو جادۂ حق سے ہٹانے اور ان کے ایمان کو متزلزل کرنے کے لیے اعدائے اسلام کی طرف کہی جاتی ہے، لیکن یہ سوچنا درست نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے آخرت میں یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ ہر طرح کی

نعمت سے سرفراز ہوں گے، جنت ان کی قیام گاہ ہوگی اور وہ ہر طرح کی تکلیف اور ناہموار باتوں سے محفوظ رہیں گے، لیکن دنیا میں اس کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اہل ایمان کے لیے یہ بات کہی گئی ہے کہ جنت کے بدلے ان کی دنیا خرید لی گئی، قرآن میں ایک موقع پر ہے کہ ہم تم کو خوف، بھوک، مال، جانوں اور پھلوں کے کچھ نقصان سے ضرور آزمائیں گے۔ اس سلسلہ میں صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنادیں، جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (البقرۃ:۱۵۵-۱۵۶)

اس آیت میں زور دے کر کہا گیا ہے کہ انھیں ضرور آزمایا جائے گا: کبھی خوف ودہشت سے دوچار ہوں گے، اور کبھی معاشی نقصانات سے آزمایا جائے گا، اس کا ایک درجہ یہ ہے کہ ان پر فاقہ ہوں گے، اور ملازمتوں کے دروازے بند کئے جائیں گے، اور ان کی جانی آزمائشیں ہوں گی، ہندوستانی منظر نامہ میں اب تک ۲۵ر ہزار فسادات ہوئے ہیں اور ان کے نتائج نگاہوں کے سامنے ہیں۔

آیت میں ثمرات اور پھلوں میں کمی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، تفسیر ابن کثیر میں بعض مفسرین کا قول نقل کیا ہے کہ الثمرات سے الأولاد مراد ہے۔ آج بہت سے ملکوں میں والدین کے سامنے ان کی اولاد کے قتل کئے جانے کے واقعات پیش آرہے ہیں، دہشت گردی کے الزام میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈالا رہا ہے۔

حضرات! ابتلاءات کا ایک تسلسل ہے، اگر کوئی ایمان پر رہنے کے باوجود اس سے محفوظ نہیں، تو اس کو حسرت، ناامیدی، افسوس اور بے یقینی سے دوچار نہیں ہونا چاہئے، اگر ایمان کی وجہ سے لوگ ابتلاءات سے محفوظ ہوتے، تو سب سے پہلے اس کے مستحق انبیاء کرام تھے، جب کہ وہ سب سے زیادہ ان سے دوچار ہوئے۔

حضرت نوح علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں، جن کو مشرکین سے سابقہ پیش آیا، اللہ نے ان کو طویل عمر عطا فرمائی، اور ساڑھے نوسو سال دعوت میں گزارا، لیکن قوم کا عمل ردّ عمل مسلسل انکار اور سرکشی کا رہا، وہ مذاق اڑاتے اور ان کو برا بھلا کہتے، وہ کہتے کیا ہم ایمان لے آئیں، حالاں کہ تمہاری پیروی معاشرے کے انتہائی نچلے اور حقیر طبقات کے لوگ کر رہے ہیں (شعراء:۱۱۱)۔

تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم ان کے ساتھ سنگ باری کرتی تھی اور آخر عذاب آیا اور سب ہلاک کر دیئے گئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام برگزیدہ پیغمبر تھے، ان کے بعد تمام پیغمبر انہیں کی نسل سے ہوئے، لیکن ان کی آزمائش یہ تھی کہ ان کو نذر آتش کیا گیا اور جو ایندھن ان کو جلانے کے لیے تیار کیا گیا تھا، قوم کے ایک ایک فرد نے اس میں حصہ لیا، لیکن اللہ نے اپنی قدرت خاص سے آپ کو بچالیا: ہم نے کہا کہ اے آگ! تو ٹھنڈی ہوجا (انبیاء:۶۹)، بیگانوں سے نہیں، اپنوں سے انھیں سخت تکلیف پہنچی، والد نے کہا کہ اگر تم دعوتِ توحید سے باز نہیں آئے تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے والد بھی نبی، دادا بھی نبی، دادا کے بھائی بھی نبی، اس کے بعد بھی کیسی آزمائشوں سے گزرے، اندھیرے کنویں میں ڈالے گئے، ماں باپ سے جدا کئے گئے، نبی زادہ تھے، لیکن غلام بنائے گئے، بازار میں بیچے گئے، اور قید کی صعوبتیں برداشت کیں۔ تفسیر کبیر (۱۶-۹۴) میں ہے کہ بارہ سال قید خانہ میں گزارا۔

حضرات! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل جن آزمائشوں سے گزری ہے، قرآن میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون پوری قوم بنی اسرائیل سے بے گار کا کام لیتا تھا، ان سے کھیتی کرائی جاتی تھی، عمارتیں بنوائی جاتی ہیں، پہاڑوں کو تراش کر ستون بنائے جاتے تھے، ان سے یومیہ کام لیا جاتا تھا، اور اگر کوئی شخص سورج کے ڈوبنے سے پہلے جزیہ ادا نہیں کرتا تو اس کے ہاتھ اس کی گردن سے باندھ دیئے جاتے تھے، عورتوں کے ذمہ کپڑوں کی بنائی، کڑھائی کا کام تھا، ظلم کی انتہا اس وقت ہوئی جب فرعون نے خواب میں دیکھا کہ بیت المقدس سے آگ نکلی، مصر پہنچی، اور اس نے قوم فرعون کو ایک ایک کر کے خاکستر کر دیا، اور بنی اسرائیل اس سے محفوظ رہے، کاہنوں نے اس کی تعبیر بتائی کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا، جو مصر پر غلبہ حاصل کرے گا، پھر کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کیا جانے لگا، سالہا سال اس پر عمل ہوتا رہا، یہاں تک کہ خود قبطی سردار نے فرعون سے درخواست کی کہ اس سلسلہ کو روکا جائے، کیوں کہ بنی اسرائیل کے بچے قتل کئے جارہے ہیں اور ان کے بوڑھوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، جو محنت ومزدوری کے لائق ہیں (تفسیر ابن کثیر ج۱/۲۵۷)

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی ہمارے سامنے ہے، خوف و دہشت کا عالم تھا، مکہ میں حضرت ابو طالب بنو ہاشم کے چند نوجوان کو رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور کرتے تھے (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۱/۲۵۶)

حضرات! مدنی زندگی میں آپ ﷺ کی قیام گاہ پر پہرہ دیا جاتا تھا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ ہتھیار لے کر سویا کرتے تھے، تاکہ دفاع کرسکیں، صحن کعبہ میں آپ کو پھانسی دینے کی کوشش کی گئی، طائف میں زخمی کیا گیا، شعب ابی طالب میں تین سال محصور رکھا گیا، حضرت حمزہؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، مکہ میں تیرہ سال سخت مشقت میں گزارے، مدینہ آنے کے بعد تابڑ توڑ حملہ کئے گئے، ہجرت کے آٹھویں سال اور نبوت کے اکیسویں سال مکہ فتح ہوا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ کیا اللہ اس پر قادر نہیں تھے کہ جیسے اکیس سال کے بعد مکہ کے لوگ دامنِ اسلام میں داخل ہوئے اور پیغمبر اسلام کے سامنے سر اطاعت جھکا دیا، یہی اہل کلمہ آج سے اکیس سال پہلے آپ ﷺ کی دعوت کے سامنے سر جھکا دیتے، لیکن اللہ نے آپ کو آزمائشوں سے گذارا کہ امت کو جن جن آزمائشوں سے گزرنا تھا آپ کو ان تمام دشواریوں سے گزار جائے، تاکہ مسلمانوں کے لیے اپنے نبی کا اسوہ موجود ہو، دشواریاں ان کے قدم میں تزلزل پیدا نہ کریں، وہ مایوس اور ناامید نہ ہوں، ان کے سامنے اپنے نبی کی مثال موجود ہے اور یہ بات ان کے لیے ڈھارس اور تسلی کا باعث ہو۔

اس لیے مسلمانوں کو موجودہ حالات میں پریشان نہ ہونا چاہیے اور نہ ان کے یقین میں تذبذب آنا چاہیے، انھیں احساس رہنا چاہیے کہ ان کا ابتلاؤں سے گزرنا ان کے نبی کے ایسے حالات سے گزرنے کے مقابلہ میں کم ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے یہاں آزمائش کے لحاظ سے افراد اور قوموں کا اجر ہوگا، اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو آزمائشوں سے دوچار کرتے ہیں، اگر وہ اللہ کے فیصلہ پر راضی ہوتے ہیں تو اللہ اس سے راضی ہوجاتے ہیں، اور اگر وہ اس پر راضی نہیں رہے تو اللہ بھی اس سے ناراض ہوجاتے ہیں (ترمذی:۲۳۹۶)

اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ اپنے گھر سے نکلے، سڑک پر لڑکے گالی گلوج کر رہے ہیں اور ان میں آپ کا بیٹا بھی ہوگا، ممکن ہے کہ آپ دوسرے بچوں کو چھوڑ دیں، لیکن اپنے بچے کے کان پکڑ کر باہر لائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ دو چار تھپڑ بھی لگادیں، کیوں کہ آپ کا مستقبل اس بچہ سے جڑا ہوا ہے، اس کی تھوڑی سی کوتاہی آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہے، اسی طرح یہ امت دین کے لیے برپا کی گئی ہے، لوگ اپنے لئے جیتے ہیں، لیکن یہ امت انسانیت کے لیے جیتی ہے۔

دیگر قوموں کو ڈھیل دی جاتی ہے، اس کو قرآن کی اصطلاح میں استدراج اور امہال کہتے ہیں، لیکن اس امت کی کوتاہی پر اس کی پکڑ ہوتی ہے، ترمذی شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن کی مثال کھیتی کی طرح ہے کہ برابر ہوا اس کو ایک طرف سے دوسری طرف ہلاتی رہتی ہے، مومن اس طرح آزمائش سے دوچار رہتا ہے، اور منافق کی مثال ایسے درخت کی ہے، جو ہلتا نہیں ہے، یہاں تک ایک دفعہ کاٹ لیا جاتا ہے۔

حضرات! اس لئے موجودہ حالات سے گھبرانا ضعف عقیدہ اور ضعف ایمان کی دلیل ہے، ایک طوفان ہے، جو آیا ہے، بہت جلد گزر جائے گا، ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے کسی خطہ میں مغلوب ہونے سے اسلام مغلوب ہوگیا، بلکہ تاریخ میں اس کی ایسی مثالیں ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمان مغلوبیت سے دوچار تھے، اسلام نے استدلالی قوت کی بدولت غلبہ اور فتح مندی کی نئی تاریخ رقم کی، اسی لیے قرآن نے کہا ہے، اگر تم ایمان ویقین کے اس معیار پر اپنے آپ کو لے آؤ جو اللہ کے یہاں مطلوب ہے تو انجام کار تم ہی کو غلبہ حاصل ہوگا (آلِ عمران:۱۳۹)۔

حضرات! آج مسلمان ہر جگہ ابتلاءات اور آزمائشوں کے دور سے گذر چکے ہیں، یورپ سے امریکہ تک، چین سے لے کر برما تک مسلمانوں کو رسوا کیا جاتا ہے، خود خون مسلم کی ارزانی ہر جگہ عام ہے، یہ حالات خود احتسابی کی دعوت دیتے ہیں، مسلمانوں کو خود اپنا جائزہ لینا چاہئے، ایسا جائزہ جو عقائد سے لے کر اعمال واخلاق اور معاملات تمام کا احاطہ کرتا ہو، اس لئے رب العالمین کے حضور رجوع کرنے اور اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

مدارس کا مقصد قیام اور ہماری ذمہ داریاں

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء ،وامام المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد : فقد قال الله تعالى : وأنزل عليك الكتاب والحكمة وعلمك ما لم تكن تعلم ، و كان فضل الله عليك عظيما ۔النساء: ۱۱۳) اوراللہ نے آپ پر کتاب وحکمت اتاری اورایسی چیزوں کی تعلیم دی، جوآپ نہیں جانتے تھے،اوراللہ کا فضل آپ پر بہت زیادہ ہے)

اللہ تعالی نے انسان کودنیا کی عظیم مخلوق بنایا ہے،اس کواشرف المخلوقات کہا جاتا ہے،اورقرآن ہی کی زبان میں اس کوخلیفہ(نائب) قراردیا ہے،انسان کوخلافت ونیابت کا جوعظیم منصب ملا ہے،اس میں علم وتعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے،علم صحیح معلومات کے جاننے کا نام ہے،اس کے مقابلہ میں قرآن نے ظن کا لفظ استعمال کیا ہے، جو بے یقینی علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے،قرآن کریم نے متعدد مقامات پر علم کی اہمیت وفضیلت کو بیان کیا ہے،انسانوں سے جن دوعلوم کے سیکھنے کا مطالبہ کیا گیا ہے،ان میں ایک خالق کا علم اور دوسرامخلوقات کا علم ہے،خالق کا علم تو عہدالست سے انسان کے حوالہ کردیا گیا ہے،یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ اسی حقیقی علم کے ساتھ دنیا میں آتا ہے،پھر ماحول اس کواچھا یا برا بنا دیتا ہے: فطرة الله التى فطر الناس عليها ، دوسراعلم وہ ہے جومخلوقات کا ہے،اورقرآن نے اس کو(وعلم آدم الأسماء کلھا) سے تعبیر کیا ہے کہ اللہ نے آدم کوسارے علوم سکھا دیئے ۔ اس میں مخلوقات کے علم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرات !اسلامی مدارس،دینی ادارے جہاں قرآن وحدیث کی تعلیم ہوتی ہے

،یہ اسی عہدالست کے معاہدہ کی تکمیل کے لئے قائم کئے جاتے ہیں،یعنی اللہ کی معرفت عقائدوایمانیات،حلال وحرام وجائز کے فرق کو جاننے کے لئے بنائے جاتے ہیں، یہ صرف مسلمانوں کی ضرورت ہی نہیں،ملک کی بھی ضرورت ہیں، یہ بے تہذیبوں کومہذب بنانے ،نام کے انسانوں کوکام کا انسان بنانے کے مراکز ہیں،اور صحیح الفاظ میں انسانی معاشرہ کے لئے پاور ہاؤس کی حیثیت رکھتے ہیں،ان کے ذریعہ انسانی معاشرہ میں عقائد ،عبادات ،معاملات،اخلاق کی سوغات اور تحفے تقسیم کئے جاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ زمین پراللہ کی علامتیں ہیں،جن کوشعائر اللہ کہا جاتا ہے،ان کے ذریعہ زمین آسمان سے رشتہ قائم ہوتا ہے،اوردونوں ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔اس لئے ان مدارس کوتقویت پہونچانے ،اپنے بچوں کوان میں بھیجنا یہ دینی،ایمانی،اورشرعی فریضہ ہے۔

حضرات! تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پرسازشوں کے مختلف دور گذرے ہیں،ایک دوروہ تھاجب اسلام پرایک ہزارسال پورے ہورہے تھے،اکبر بادشاہ مغلیہ حکومت کا بادشاہ تھا، وہ بالکل پڑھالکھانہیں تھا،اس کے آس پاس خودغرضوں اوردنیا پرستوں کی ایک بھیڑ تھی،انہوں نے اس کوپٹی پڑھائی کہ ہر مذہب کی عمراس دنیا میں ایک ہزارسال ہوتی ہے،یہودی مذہب ایک ہزارسال تک چلا،عیسائی مذہب بھی اسی طرح رہا ،اس کے بعداسلام آیا،اس کوبھی ایک ہزار پورے ہورہے ہیں،اب نئے ہزارے کے لئے نئے دین،نئی شریعت کی ضرورت ہے، چنانچہ اس نے دین اکبری کا اعلان کردیا،اور اس کا کلمہ قرار پایا،لا الہ الا اللہ واکبر خلیفۃ اللہ،ایسے حالات میں سرہند کی سرزمین سے ایک شخصیت اٹھی جس نے اپنی ایمانی قوت اورعلم کی طاقت سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا، کہ حالات کے رخ کوموڑ دیا، دنیااس کومجددالف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نام سے جانتی ہے ،علامہ اقبال نے اسی شخصیت کوخراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا ،جس کو خبر دار

اس ملک پر انگریزوں کا ناپاک سایہ پڑا ، اور انہوں نے یہاں کے مدارس، مساجد کونشانہ بنانا شروع کیا، اور اسلام پر براہ راست حملہ کیا، تو ملک کے غیور، باحمیت علماء اٹھے اور انہوں نے ملک کے چپہ چپہ میں مدارس کا جال بچھا دیا، اور ایسے علماء، فقہاء، قراء، مفسرین ، محدثین ، تیار کئے ، نہوں نے پوری قربانی اور قناعت سے زندگی گذاری ، اور ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہوگئے ، آج ملک کے طول وعرض میں جو مدارس، مساجد اور دینی آثار نظر آرہے ہیں، یہ یہ سب انھیں علماء کی قربانیوں کا ق ثمرہ ہے۔

حضرات ! ملک کے اندر اوقاف کا جو مسئلہ چل رہا ہے، وہ انھیں مدارس ، مساجد، خانقاہوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے، اس سلسلہ میں سپریم کورٹ کے عبوری فیصلہ سے کچھ چیزوں پر روک لگی ہے، لیکن یہ لمبی لڑائی ہے، بڑی قربانیوں اور سرفروشیوں کی متقاضی ہے، ابھی تک اس حوالہ سے جو بھی کوششیں ہوئی ہیں، عوام وخواص کی طرف سے وہ قابل ستائش ہیں، ہر ایک اس کو اہمیت کو محسوس کیا، اور اس کو دین وایمان کا مسئلہ سمجھا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے عام مسلمانوں سے اس نے اپیل کی ہے، اس قانون کو مسترد کرنے کے لئے جتنے پر امن طریقے ہیں ان کو اختیار کیا جائے ، جہاں آگے بڑھنے کو کہا جائے وہاں آگے بڑھا جائے اور جہاں رکنے کے لئے کہا جائے رک جائیں ، کیونکہ جوش کے ساتھ ہوش کامیابی کے لئے شاہ کلید ہے۔

۲۔ جو اوقاف بچے ہیں اور ابھی دشمنوں کے ناپاک ارادوں سے محفوظ ہیں، اور جلد از جلد ان کی حفاظت کی پوری کوشش کی جائے ، اگر احاطہ بندی نہیں ہے، چہار دیواری نہیں ہے تو اس سلسلہ میں ضروری کوشش کی جائے ۔ معاشرتی طور پر تعاون کر کے یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے۔

۳۔ جو زمین کسی شخص یا سماج کی ملکیت کے طور پر رجسٹرڈ نہ ہو، ان کو جلد از جلد رجسٹرڈ کرایا جائے ، تاکہ ملکیت کے طور پر اس کا ثبوت رہے۔

۴۔ یہ جو موجودہ مصیبت آئی ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس میں ہماری کچھ کوتاہیوں کا دخل ہو، بعض اوقاف کی زمینیں ہم نے کرایہ پر لی ہیں، ان کا کرایہ پچاس ہزار ہونا چاہئے ، اور ہم معمولی قیمت ادا کرر ہے ہیں ، یا کسی دوسرے ذریعہ سے استحصال کرر ہے ہیں تو یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔

حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جرأت و ہمت کی بھی ضرورت ہے، اور حسن تدبیر اور حکمت و مصلحت کی بھی۔ حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی: فرمایا کرتے تھے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں نے دو فیصلے کئے ہیں، اور ان دونوں فیصلوں کو تقدیر الٰہی کے علاوہ کئی نہیں بدل سکتا ، ایک تو یہ کہ ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک اسی ملک میں رہیں گے، اور دوسرے یہ کہ ہم یہاں اپنی نمازوں اور اپنی عبادتوں ، یہاں تک کہ اپنی تہجد اور تسبیحات کے ساتھ رہیں گے، اور اس کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار رہیں گے ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ فرمائے۔

اوقاف کی حفاظت
وقت کی اہم ضرورت

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه ومن تبعهم بإحسان الى يوم الدين أما بعد : فقد جاء فی صحیح مسلم عن أبی هريرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ أنه قال : إذا مات ابن آدم انقطع عنه عمله إلا من ثلاث : صدقة جارية ، و أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له (مسلم ، و أبو داود)

حضرات! اسلام میں جس طرح اللہ کی بندگی اور عبادت کی بڑی اہمیت ہے، اور اس کے لئے نماز روزہ، زکاۃ، حج وغیرہ کے احکام دیئے گئے ہیں، اسی طرح انسانوں کی مدد کی بڑی اہمیت ہے، اور انسانوں کی مدد اللہ کی مدد ہوتی ہے، حدیث میں صاف آیا ہے کہ اللہ اس وقت تک بندے کی مدد کرتا رہتا ہے، جب بندہ اللہ کی مدد کرتا رہتا ہے، یہ مدد کرنا اللہ کو بہت زیادہ محبوب ہے، اسلام میں مدد کی کئی شکلیں ہیں: ایک شکل تو یہ ہے کہ وقتی طور پر کسی ضرورت مند کی مدد کر دی جائے، جیسے کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا، کسی بیمار کی مدد کر دی، کسی بے لباس کو کپڑا دے دیا، مدد کی دوسری شکل یہ ہے کہ ایسا کار خیر کر جائے جس کا نفع بہت سے لوگوں کو بہت دنوں تک پہونچتا رہا، ان دونوں صورتوں میں بے پناہ اجر وچواب ہے، لیکن دوسری صورت میں زیادہ اجر وثواب ہے۔ کیونکہ جس چیز کا نفع دیر تک، اور زیادہ دنوں تک پہونچے گا، اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس سے عمل کا رشتہ کٹ جاتا ہے، سوائے تین صورتوں کے، صدقہ جاریہ، یا ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جائے، یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔ اس حدیث میں

تین صورتیں بیان کی گئی ہیں: نمبر صدقہ جاریہ کوئی ایسا کام کر جائے کہ اس کا نفع اس کے بعد بھی جاری رہے، جیسے کنواں کھدوا دیا۔ ٹیوویل لگوا دیا، بورنگ کرا دی، مسجد بنوادی، مدرسہ تعمیر کرا دیا، دینی کتابیں شائع کرا دیا، دوسرا ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، کوئی پڑھا لکھا آدمی تھا، اس نے لڑکوں کو پڑھایا اور وہ لڑکے دوسروں کو پڑھائیں گے تو اس طرح قیامت تک اس کا سلسلہ قائم رہے گا یا ایسی اولاد ہو جو اس کے لئے دعا کرے اولاد کو ایسی تعلیم و تربیت دی، اور وہ اس کے لئے دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں تو اس کا ثواب جاری رہے گا۔

حضرات! صدقہ جاریہ میں ایک شکل وقف کی ہے، وقف کے معنی ہوتے ہیں، کسی چیز کو روک لینا، وقف میں ہوتا یہ ہے کہ اصل مالیت کو روک کر اس کے پروفٹ اور نفع کو مستحقین پر خرچ کیا جاتا ہے، اس لئے اس کو وقف کہتے ہیں، چوں کہ اس میں اصل پونجی بچی رہتی ہے، اور اس کو روکے رکھا جاتا ہے، اس لئے اس کو وقف کہتے ہیں، اور عام صدقات میں غرباء اور ضرورت مندوں کو اصل چیز کا مالک بنا دیا جاتا ہے، وقف کا معاملہ ایسا ہے کہ اس پر نہ وقف کرنے والی کی ملکیت رہتی ہے، اور نہ ان لوگوں کی جن اس نفع اٹھانے کا موقع دیا گیا ہے۔۔ وقف کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ یہ اللہ کی ملکیت ہے، ھو حبسھا علی حکم ملک اللہ، اس کو نہ بیچا جا سکتا ہے، اور نہ گفٹ کیا جا سکتا ہے ،اا ور نہ وارث بنایا جا سکتا ہے اسلام میں عبادت کا جس طرح اجر وثواب ہے، اس طرح انسانی خدمت کا بھی اجر وثواب ہے، وقف کا تذکرہ قرآن کریم میں انفاق کے ذریعہ بار بار آیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون وما تنفقوا من شيئ فان الله به عليم (تم بھلائی اور نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک اپنی پسندیدہ چیز اللہ کے راستے میں خرچ نہ کر دو، اور جو بھی خرچ کرو گے، اس سے اللہ خوب واقف ہے، اور دوسری جگہ ہے کہ وما تنفقوا من خير فلألنفسكم (اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تو وہ تمہارے فائدے کے لئے ہے)

حضرات! تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اور خیراتی کاموں کے لئے وقف کا تصور صدیوں پرانا ہے، عربوں کے یہاں کعبۃ اللہ کے لئے نذرانے پیش کرنے کا ذکر ملتا ہے، بائبل میں اللہ کے نام سے چیزوں کو نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے، جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے خود ایک زمین وقف کی، جب آپ ﷺ مدینہ پہونچے، تو سہل اور سہیل دو یتیم بچوں کی زمین خرید کر مسجد کے لئے وقف کی، اور اسی سے متصل صفہ نامی چبوترہ کو مدرسہ کے لئے وقف کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان اور حضرت علی نے اپنے پرسنل مال کو وقف کیا، مدینہ میں ایک کنواں تھا جو یہودی کا تھا، وہ لوگوں پانی نہیں پینے دیتا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو خرید کر وقف کیا، کہ جو چاہے پانی پیئے، اس پر کوئی پابندی نہیں۔ اوقاف کا یہ سلسلہ پوری دنیا میں تاریخ کے اس لمبے عرصے میں جاری رہا، مسلمان اپنی زمینیں مسجدوں، مدرسوں، قبرستانوں، یتیم خانوں، مسافرخانوں اور دیگر عوامی ضروریات کے لئے وقف کرتے رہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت طویل عرصہ تک رہی اس میں یہ سلسلہ رہا، انگریزی دور حکومت میں اٹھارہ ستاون کے بعد ملک کی اوقاف پر جب انگریزوں کی ناپاک نگاہ پڑی تو مسلمانوں نے جدوجہد کر کے شریعت اپلیکیشن ایکٹ پاس کرایا، جس کے ذریعہ پرسنل لا کو محفوظ کیا گیا ہے، ملک کی آزادی کے بعد مسلمانوں کے اوقاف کی حفاظت کے لئے ۱۹۵۴ء میں قانون بنا، پھر ۱۹۸۴ء میں، پھر ۱۹۹۵ء میں اور ۲۰۱۰ء می اور ۲۰۱۳ء میں ضرورت کے مطابق ترمیمات کی جاتی رہیں، جس بڑی حد تک مسلمانوں کے اوقاف کی حفاظت ہوتی تھی، لیکن یہ نیا قانون وقف آیا ہے، اس میں موجودہ حکومت نے چالیس ترمیمات کی ہیں، اس کے ذریعہ وقف بورڈ کے اختیارات کو کم کر دیا گیا ہے، جس سے مسلمانوں کے اوقاف کو سخت خطرہ لاحق ہوا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے مسئلہ کی سنگینی کو محسوس کیا، اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ کوئی ایسی ترمیم نہ کی جائے جس سے

اوقاف کو خطرہ لاحق ہو، بورڈ نے صاف کہا ہے کہ وقف ایکٹ ۲۰۱۳ء میں کوئی ایسی تبدیلی ہم کو بالکل منظور نہیں ہے، جس سے وقف جائیدادوں کو خطرہ لاحق ہو،

حضرات! آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وقف قانون ۲۰۲۵ء کو روکنے کے لئے شروع ہی سے کوشاں ہے، ایک مرحلہ میں اس نے تحریک چلائی، اور سپریم کورٹ میں مقدمہ لڑا، اس کا عبوری فیصلہ آیا ہے، وہ نامکمل ہے، اور غیر تشفی بخش ہے، اس میں جزوی ریلیف تو دیا گیا ہے، لیکن بڑے آئینی خدشات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس لئے بورڈ کی تحریک جاری رہے، دوسرے مرحلہ کا روڈ میپ آچکا ہے، جو سوشل میڈیا کے ذریعہ ہر جگہ پہونچ چکا ہے، بورڈ نے جو اقدامات کئے ہیں، اوقاف کی حفاظت کے لئے عام مسلمانوں کو اس میں شریک ہونا چاہئے، اور آج کے جمعہ کو یوم دعا کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالی اوقاف کے تحفظ کی غیب سے کوئی شکل پیدا فرمادے، اور دو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کو مؤثر بنادے۔

حضرات! حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جرأت و ہمت کی بھی ضرورت ہے، اور حسن تدبیر اور حکمت ومصلحت کی بھی۔ حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی: فرمایا کرتے تھے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں نے دو فیصلے کئے ہیں، اور ان دونوں فیصلوں کو تقدیر الٰہی کے علاوہ کئی نہیں بدل سکتا، ایک تو یہ کہ ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک اسی ملک میں رہیں گے، اور دوسرے یہ کہ ہم یہاں اپنی نمازوں اور اپنی عبادتوں، یہاں تک کہ اپنی تہجد اور تسبیحات کے ساتھ رہیں گے، اور اس کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار رہیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ فرما۔

ماحولیات اور اسلام

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد ، فقد قال الله تعالى : ولا تفسدوا في الأرض بعد إصلاحها (الأعراف : ٥٦) اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ

محترم حضرات ! یہ جون کا مہینہ چل رہا ہے، اسی مہینہ کی پانچ تاریخ کو یوم ماحولیات (World Enviroment Day) کے نام سے پوری دنیا میں منایا جاتا ہے، اس کا مطلب ہمارے ارد گرد کا وہ ماحول ہے، جس میں ہوا، پانی، زمین، پودے، جانور اور انسان شامل ہوتے ہیں، اس کے تعلق سے بیداری پیدا کی جائے اور لوگوں کو اس کو مسائل سے آگاہ کیا جائے، اور یہ ۱۹۷۳ء یہ دن منایا جا رہا ہے، اور لوگ اس دن پروگرام کر کے اور آرٹیکل لکھ کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

جہاں تک اسلام کی بات ہے تو اس نے اپنے آغاز ہی سے ماحولیات کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے، قرآن و حدیث میں واضح تعلیمات ہیں، جن سے ان کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، ماحولیات میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے ان میں پانی ہے، پانی اللہ کی بڑی نعمت ہے، زندگی کا سرچشمہ ہے، جانوروں، پودوں اور تمام جانداروں کی بقا پانی پر ہے،: اللہ تعالی نے قرآن کریم میں سورۂ انبیاء میں فرمایا ہے: وجعلنا من الماء كل شيئ حي (الأنبياء:۲۱) (اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو پیدا کیا)، سورۂ واقعہ میں اللہ تعالی فرماتا ہے: أفرأيتم الماء الذى تشربون ء أنتم أنزلتموه من المزن أم نحن المنزلون (واقعہ:۵۶) (بھلا بتاؤ تو سہی یہ پانی جو تم پیتے ہو، کیا تم

اسے بادلوں سے اتارتے ہو یا ہم اتارنے والے ہیں)، اسی پانی کو قرآن نے ماءً طہورا کہا ہے یعنی پاک کرنے والا، اسی پانی کو قرآن نے ماءً مبارکا کہا ہے برکت والا پانی، اسی پانی کو قرآن نے ماءً فراتا میٹھا اور خوشگوار کہا ہے، اسی پانی کو قرآن نے ماءً ثجاجا کہا موسلا دھار برسنے والا پانی، حدیث پاک میں سنن ابوداود میں آیا ہے کہ پانی پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے، یہی پانی ہے جس کے متعلق حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے لئے کون سا صدقہ افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: أفضل الصدقة سقى الماء (سنن نسائی) (سب سے افضل صدقہ پانی پلانا ہے)، اور صحیح بخاری کی حدیث میں ہے: ہر جاندار کے ساتھ بھلائی کرنے میں اجر ہے، اس میں پانی پلانا بھی داخل ہے، صحیح بخاری اور مسلم کی مشہور حدیث ہے کہ ایک شخص کو پیاس لگی، اس نے کنویں سے پانی پیا، پھر اس نے ایک کتے کو پیاس سے ہانپتے دیکھا، اس نے اس کو بھی پانی پلایا تو اللہ تعالی نے اس کو مغفرت فرمائی اور جنت میں داخل کر دیا۔

یہ پانی جب ہمارے لئے اس قدر ضروری ہے تو ہمیں چاہئے کہ پانی کے استعمال میں میانہ روی اختیار کریں اور اسراف سے بچنے کی کوشش کریں، حضور اکرم ﷺ سے ایک صحابی حضرت سعد نے پوچھا! اے اللہ کے رسول! کیا وضو میں بھی فضول خرچی ہے تو آپ نے فرمایا: اگر تم بہتے دریا میں بھی وضو کرو تو اس میں بھی فضول خرچی منع ہے۔

حضرات! درخت، پیڑ پودے یہ ہماری ضرورت ہیں، درخت کا پھل کھایا جاتا ہے، خوشبودار پھول ہو تو سونگھا جاتا ہے، درخت کے پتے جانور کھاتے ہیں، اس کی چھالیں دوا کے کام آتی ہیں، خود درخت چلنے والوں کے لئے بہترین سایہ فراہم کرتا ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہائیڈروجن گیس جو انسان کے لئے مضر ہوتی ہے، اس کو درخت جذب کر لیتا ہے، اور آکسیجن جو انسان کے سانس لینے میں کام آتی ہے اسے چھوڑتا ہے، درخت گرمی کی شدت کو کم کرتا ہے، اور بارش کے نظام میں مدد دیتا ہے، اللہ تعالی نے قرآن میں فرمایا ہے

: وهو الذى أنشأ جنات معروشات وغير معروشات (وہی اللہ ہے جس نے باغات پیدا کئے، کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں، اور کچھ بغیر ٹٹیوں کے (الأنعام:۱۴۱) سورہ نحل میں ہے : ينبت لكم الزرع والزيتون والنخيل والأعناب (۱۱) وہی اللہ ہے جو تمہارے لئے کھیتیاں، زیتون اور کھجوریں اور انگور اگاتا ہے، حدیث پاک میں درخت سے متعلق متعدد حدیثیں ہیں، جن میں ایک حدیث صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ما من مسلم غرس غرسا فأكل منه إنسان أو دابة إلا كان له به صدقة (کتاب الأدب:۶۰۱۲) (جو مسلمان درخت لگائے اس میں سے انسان یا جانور کھائے تو یہ اس کے لئے صدقہ ہوگا)، الأدب المفرد کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اگر قیامت قائم ہوجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں پودہ ہو تو اگر قیامت قائم ہونے سے پہلے لگا سکے تو لگا لینا چاہئے۔

حضرات! درخت چونکہ انسانوں اور جانوروں کی بنیادی ضرورت ہے، اس لئے اس کے لگانے کی فضیلت ہے، اور اس کا کاٹنا اور جلانا ناپسندیدہ عمل ہے، یہ حکم ہر ایک کے لئے ہے، صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ جب جنگوں میں بھیجتے تھے تو اس کی طرف توجہ دلاتے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف ایک لشکر بھیجا تو فرمایا کہ ولا تقطعن شجرا مثمر (اور دیکھو کسی پھلدار درخت کو نہ کاٹنا) (مؤطا امام مالک، کتاب الجهاد)

حضرات ! ماحولیات کے باب میں راستوں کی صفائی کا خیال رکھنا اور اس کا حق دینا ہے، سنن ابوداود میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عرفات سے چلے، آپ ﷺ پرسکون رفتار سے چل رہے تھے، اور آپ کے پیچھے حضرت اسامہ تھے، آپ نے فرمایا کہ اے لوگو! سکون سے اور دوسروں سے ٹکرائے بغیر چلو، گھوڑے اور اونٹ کو تیز چلانا کوئی نیکی نہیں ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، ان میں سب سے افضل لا الہ

الا اللہ کا کہنا ہے، اور اس کا ادنی درجہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے، اسی کے ساتھ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ إياكم والجلوس فى الطرقات آپ ﷺ نے فرمایا کہ راستوں میں بیٹھنے سے بچو، اور راستوں کو ان کا حق دو، راستوں کا حق یہ ہے ک نگاہ نیچی رہے، گندگی کا ہٹانا، سلام کا جواب دینا، اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے منع کرنا ۔

حضرات! ماحولیات کو پاکیزہ رکھنے میں جسمانی صفائی کی بڑی اہمیت ہے، قرآن میں آیا ہے: وثيابك فطهر (اپنے کپڑے پاک رکھو) اور اللہ تعالی نے قباء والوں کی تعریف کی ہے کہ فيه رجال يحبون أن يتطهروا ، والله يحب المتطهرين (توبہ: ۱۰۸) اور حدیث پاک میں الطهور شطر الإيمان کہا گیا ہے کہ یعنی پاکی آدھا ایمان ہے، صفائی کے سلسلہ میں وضوء کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، وضو میں کلی کرنے، ناک میں پانی ڈالنے، چہرہ دھونے اور پیر دھونے سے معنوی فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے گناہ جھڑتے ہیں، اور ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں، لیکن ظاہری فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وضو بے چینی اور کھینچاؤ کو دور کرتا ہے۔ اور اطمینان کی کیفیت پیدا کرتا ہے، صفائی ہی میں غسل بھی ہے، اور یہ واجب ہوتا ہے اور مستحب ہوتا ہے، یہ انسان کو پاک وصاف کرنے میں معاون ہے۔ انسانی جسم کی صفائی میں دس جو خصال فطرت ہیں ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے: ختنہ کرنا، زیر ناف بال کاٹنا، بغل کے بال کو صاف کرنا، مونچھیں کاٹنا، داڑھی بڑھانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا ہیں۔

غرض اسلام میں ماحول اور فضا کو پاک وصاف رکھنے کی بڑی اہمیت ہے، میں نے قرآن کریم کی ایک آیت پڑی تھی، اس میں اللہ تعالی نے یہی ارشاد فرمایا ہے کہ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ، ضرورت ہے کہ ہم ماحولیات کی تمام، چیزوں کا خیال رکھیں اور اس کو تحفظ فراہم کریں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

عربی واردو مراجع

(۱) قرآن مجید (۲) صحیح بخاری (۳) صحیح مسلم (۴) سنن ترمذی (۵) سنن ابو داود (۶) سنن ابن ماجہ (۷) سنن نسائی (۸) مؤطا امام مالک (۹) الجامع لشعب الایمان ی (۱۰) المعجم الکبیر للطبرانی (۱۱) النھایۃ فی غریب الحدیث علامہ ابن اثیر جزری (۱۲) صحیح ابن خزیمہ (۱۳) مسند احمد بن حنبل (۱۴) الجامع لأحکام القرآن ، للقرطبی (۱۵) مصنف ابن أبی شیبہ (۱۶) أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (۱۷) احیاء علوم الدین امام غزالی (۱۸) فتح الباری علی صحیح البخاری ابن حجر عسقلانی (۱۹) المستدرک علی الصحیحین امام حاکم (۲۰) الاتقان فی علوم القرآن سیوطی (۲۱) حجۃ اللہ البالغۃ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

(۲۲) سیرت النبی علامہ شبلی وعلامہ سید سلیمان ندوی (۲۳) الفاروق علامہ شبلی نعمانی (۲۴) خطبات مدراس علامہ سید سلیمان ندوی (۲۵) فضائل القرآن شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (۲۶) نبی رحمت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (۲۷) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (۲۸) ارکان اربعہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (۲۹) تاریخ دعوت وعزیمت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (۳۰) سیرت نبوی دعاؤں کے آئینہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (۳۱) دعوت فکر وعمل حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی (۱۱) معارف الحدیث حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (۲۳) قرآن آپ سے کیا کہتا ہے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (۳۳) امت محمدیہ ایک معتدل امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (۳۴) حالات حاضرہ اور مسلمان حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (۳۵) اسلام کا نظام مساجد مفتی ظفیر الدین مفتاحی (۳۶) سورۂ یوسف کے سو فائدے حضرت پیر ذو الفقار نقشبندی (۳۷) آسان تفسیر قرآن مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (۳۸) خطبات بنگلور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (۳۹) پیام سیرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (۴۰) راہ عمل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (۲۱) اسلام اور جدید فکری مسائل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (۴۱) زاد الخطیب ڈاکٹر محمد اسحاق (۴۲) ہجرت مصطفیٰ مولانا محمد علاء الدین ندوی (۴۳) متاع وقت اور کاروان علم ابن الحسن عباسی (۴۴) رمضان کی تجلیاں مولانا ظہیر احمد اعظمی ندوی (۴۵) اسلاف کا ذوق تلاوت مولانا فیصل احمد ندوی (۴۶) امت محمدیہ کی خصوصیات مولانا قمر الزمان ندوی (۴۷) رسول اللہ ﷺ کی انسانیت نوازی مولانا عبد العلیم اسماعیل خطیب ندوی۔

صاحب خطبات کی علمی کاوشیں

عربی تصنیفات:

(١) الموجز فی أصول التفسير (٢)) الخطب الدينية المنبرية (خمسة أجزاء) (٣)) تعلم فن إدارة الحفلات(٤) الشيخ سعيد الأعظمی : حياته و آثاره (٥) بالإسلام أعزنا الله (٦) طوفان الأقصی : منبع للعزة والإباء

عربی کتابوں کی تحقیق وتحشیہ:

(١) المنتخبات العربية للشيخ محبوب الرحمن الأزهری والشيخ أبی محفوظ الكريم المعصومی (٢) مجموعة من ا لنظم والنثرللشيخ شريف سليم المصری (٣) باب الأدب من ديوان الحماسة لأبی تمام (٤)البلاغة الواضحة(القرآنية) للأستاذين علی الجارم و مصطفی أمين (٥) المختار من وفيات الأعيان لابن خلكان (٦) باب المراثی من ديوان الحماسة لأبی تمام (٧) البلاغة والإعراب والبيان للشيخ راشد عبد الله الفرحان(٨) صور مشرقة للإسلام (خطب الشيخ خالد الغامدی أثناء زيارته لمدينة لكناؤ۔

اردو سے عربی ترجمے :

(١) جزيرة العرب للشيخ محمد الرابع الحسنی الندوی (٢) الهداية القرانية سفينة نجاة للانسانية للشيخ محمد الرابع الحسنی الندوی (٣)

فضائل الأعمال : دراسة علمية للشيخ المكى (٤) مسئولية العلماء فى الأوضاع المتغيرة للشيخ أبى الحسن على الحسنى الندوى (٥) خطر للبلاد كبير للشيخ أبى الحسن على الحسنى الندوى (٤) العلامة شبلى النعمانى للأستاذ ايج النعمانى (٥) سورة الحجرات حدوده و آدابه للشيخ محمد الرابع الحسنى الندوى (٦) الرسالة وحاجة الانسانية اليها للشيخ أبى الحسن الحسنى الندوى (٧) الحج : فضائله وآدابه و مشاعره للشيخ محمد الرابع الحسنى الندوى (٨) العلامة عبد الحى الفرنكى محلى : حياته وآثاره للشيخ طارق رشيد (٩) علماء فرنكى محل البارزون و خدماتهم الدينية للشيخ خالد رشيد (٩) تأملات فى سورة الشعراء للعلامة الندوى (١٠) الصراع بين الحق والباطل للشيخ محمد الرابع الحسنى (١١) أعلام من العرب والعجم للشيخ محمد الرابع الحسنى الندوى (١٢) من هم أهل السنۃ والجماعة للعلامة السيد سليمان الندوى (١٣) مفردات القرآن للعلامة السيد سليمان الندوى

اردوتصنیفات:

(۱) نورالتفسیر (۲) افادات علم وحکمت (ملفوظات حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (۳) خطبات امام حرم (۴) علامہ سید سلیمان ندوی کے تفسیری نکات (اول، دوم)(۵) دو ہفتے دیار مقدسہ میں (۶) مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی : شخصیت وخدمات (۷) متاع فکروفن (۸) حرم کی چوکھٹ پر(۹) خطبات جمعہ (اردو)(۱۰) عربی زبان کیسے سکھیں (۱۱) سوانح سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی (۱۲) ندوۃ العلماء: تعلیم و تربیت کا جامع منہج (۱۳) یوم الفرقان کا پیغام (۱۴) عربی زبان کیسے سیکھیں (۱۵) نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم: قیادت اور حکمت عملی۔